دارالمصنفین

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۲۳ ویں جلد

جنوری ۱۹۷۹ء تا جون ۱۹۷۹ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن   عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۳

ماہ جنوری ۱۹۷۹ء تا جون ۱۹۷۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار
۱۲	ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۲۰۵، ۴۴، ۴۴	۱۸	جناب مولوی نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی،
۱۳	ڈاکٹر محمد طیب صاحب صدیقی، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار)	۱۳۷		

شعراء

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار
۱۴	محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی	۴۶۸	۱	ڈاکٹر افتخار احمد فخر ایم اے پی۔ ایچ، ڈی، بہار [illegible]
۱۵	ڈاکٹر محمد معین فاروقی، ریڈر شعبۂ زولاجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	۲۴	۲	جناب شمسی قریشی جلال پوری (فیض آباد)
۱۶	محمد منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۰۸، ۴۴۷	۳	ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی (الہ آباد)
۱۷	جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور	۴۷		

فہرست مضامین معارف

جلد ۲۳

ماہ جنوری ۱۹۷۹ء تا جون ۱۹۷۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۳ نمبر ۱ ۵۲۰

جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ـ عبدالسلام قدوائی ندوی

......ﷻ......

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

بکثرت اضافوں کے ساتھ دو کتابوں کے نئے اڈیشن

بزم تیموریہ جلد اول

اس جلد میں شروع کے تین مغل

بادشاہ بابر، ہمایوں، اور اکبر کے علمی ذوق اور اُن میں سے ہر ایک کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء، شعراء، کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، بعد کی جلدوں میں جو زیر ترتیب ہیں، بعد کے مغل سلاطین اور اُن کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوگا،

قیمت:- ۱۴ - ۲۵

بزم صوفیہ

تیموری عہد سے پہلے کے تمام ممتاز

صاحب تصانیف صوفیۂ کرام و مشائخ عظام، مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ اجمیری، بختیار کاکی، قاضی ناگوری، نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات تعلیمات و ملفوظات جس میں آٹھویں صدی کے مشہور شیخ طریقت عبد الحق نوشہ رودولوی کے حالات کا مستقل اضافہ ہے،

قیمت:- ۱۶ - ۲۵

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جلد ۱۲۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۹ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کی انیس جلدیں عمدہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں، اُن کی ترتیب میں پاکستان کے تمام مشہور اہل قلم نے تعاون کیا ہے، پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اردو انسائیکلوپیڈیا کی پندرہ جلدوں کی تدوین ایک عظیم الشان علمی خدمت ہے، اس کے بعد ان انیس جلدوں کی اشاعت ایک دوسرا قابل قدر علمی کارنامہ ہے،

اس برصغیر میں مسلمانوں نے اُردو، فارسی، عربی، بنگالی اور علاقائی زبانوں کے ذریعہ سے اپنے ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی خیالات کا اظہار جس طرح کیا ہے، اس کا احاطہ ان جلدوں میں کیا گیا ہے، اردو ادب پر پانچ، فارسی میں تین، عربی پر ایک، بنگالی پر دو، علاقائی ادبیات مغربی پاکستان پر دو، اور اشاریہ پر پانچ جلدیں ہیں، اس کی پہلی جلد بطور مقدمہ مسلم تہذیب، اسلامی فن تعمیر، خطاطی اور مصوری پر اس لئے لکھی گئی ہے کہ یہ معلوم ہو کہ ان سے بھی ہمارا ادب متاثر ہوتا رہا ہے، یہ کام ۱۹۷۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا، اُن کی اشاعت سے اردو کی کم مائیگی کے احساس میں بڑی حد تک کمی آجائیگی، جس کیلئے پنجاب یونیورسٹی لاہور مبارکباد کی مستحق ہے، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے کام میں فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے، اگر اہل نظر نے اُن کی طرف توجہ دلائی تو یہ بھی بڑی علمی خدمت ہوگی، خود مرتبین کو بھی اس میں تکدر پیدا نہ ہوگا،

دار المصنفین میں یہ جلدیں بڑے شوق سے مطالعہ کی جارہی ہیں، انشاء اللہ ان پر آئندہ تفصیلی تبصرہ بھی ہوگا، مصنفین کے ایک رفیق نے اس کی دوسری جلد کی بعض اہم فروگذاشتوں کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے، مثلاً ابن صاعد اندلسی کی کتاب کا نام طبقات الامم کے بجائے طبقات الاسلام (ص ۱) علامہ ابن حجر کی مشہور کتاب الدرر الکامنہ کو الدرر الکامنہ (م ۵۵ھ) مخدوم علی مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن کو تفسیر الرحمان تیسیر المنان فی تفسیر القرآن (م ۸۳۵ھ) فتاویٰ عالمگیری کے ایک مرتب قاضی عنایت اللہ مونگیری کو عنایت اللہ مونگیری (م ۱۰۹۰ھ، ۱۰۹۵ھ) لکھا

گیا ہے، مثلاً تذکرہ شیخ ابو عمر کی کا نام صرف ابن جو چھپ گیا ہے (ص ۱۴) تعجب ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیری کی
خاتم النبیین کو ضرب الخاتم بتایا گیا ہے (ص ۹۳) مولانا ابو ظفر ندوی کو اسلام اور عربی تمدن، حکمائے اسلام و تبع تابعین
کا مصنف ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ اسلام اور عربی تمدن کرد علی کی تصنیف ہے جس کے مترجم جناب شاہ معین الدین احمد
ندوی مرحوم ہیں، حکمائے اسلام کے مصنف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم ہیں، تبع تابعین بھی مولانا ابو ظفر ندوی کی تصنیف نہیں

عربی ادب کی اشاریہ جلد میں خیر الدین زرکلی کی کتاب کا نام الاعلام کے بجائے الاعدم طبع ہو گیا ہے (ص ۲۶) اسی طرح
البدر الطالع کے مصنف کا نام قاضی شوکانی کے بجائے قاضی شعرانی چھپا ہے (ص ۴۷) الشرح علی المنار کے مصنف
ملا عبد السلام دیوی کے بجائے ملا عبد السلام ندوی درج ہے (ص ۸) ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون
کو اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف لکھا گیا ہے حالانکہ اس کے مصنف اسمٰعیل پاشا البغدادی ہیں (ص ۵) حاشیہ علی عقائد النسفی
کے مصنف کا نام علاء الدین ندوی درج ہو گیا ہے، علاء الدین لاری ہونا چاہیے (ص ۳) اس قسم کی اور بھی فرو گذاشتیں
ہیں جو ایسی اہم علمی تصانیف میں نہ ہونی چاہئیں، بعض جلدوں کے مباحث کی تعبیرات، تشریحات، تنقیدات اور تاویلات
سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے ان جلدوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی، ان کی افادیت اور اہمیت تسلیم کی جانی
چاہیے، دار المصنفین ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کا ممنون ہے کہ انھوں نے یہ ساری جلدیں دار المصنفین کو
نذر کیں جس سے اس کے کتب خانہ میں بڑا مفید اضافہ ہوا ہے، اور علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جا رہی ہیں،

ترقی اردو بورڈ کراچی سے اردو لغت کی جلد اول بھی دار المصنفین کو ہدیۃً ملی ہے، یہ بڑی اور چوڑی تقطیع
کے گیارہ سو پچانوے صفحے کی کتاب صرف الف مقصورہ پر مشتمل ہے، لغت نویسی کا کام بڑا مشکل اور صبر آزما ہے، خصوصاً
جب اردو زبان کی، جو سنسکرت، پراکرت، عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ کا عطر
مجموعہ ہو، اس لغت کی تیاری میں یہ طرز رکھا گیا ہے کہ ایک لفظ عہد بہ عہد کس طرح استعمال ہوا، اس کا کون سا
املا صحیح ہے اور کون سا کثیر الاستعمال ہے، اس کے مترادفات کہاں تک درست ہیں، پھر کون سے الفاظ اور محاورے عامیانہ اور کون سے
سنجیدہ ہیں، کون سے اعلام ایسے ہیں جن کا جدا کرنا ممکن نہیں، پیشہ وروں کے الفاظ اور اصطلاحات ٹکسالی ہیں یا پرکھے جا سکتے
ہیں یا نہیں، کسی معنی یا لفظ کے ساتھ کوئی صلہ پیش ہوا، انھی امور کو سامنے رکھ کر یہ لغت محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا گیا

[illegible] کی سند کے اقتباسات [illegible]
کے ساتھ پیش کرنیکا اہتمام ہو، سابقہ لاحقہ، مصطلحات، اعراب، مکتوبی و ملفوظی، وضاحت، متروک [illegible] کی بھی تشریح
اختیار کی گئی ہے۔ نمونہ آکسفورڈ ڈکشنری کلاں کا رکھا گیا ہے جو ستر سال کے بعد تیار ہوئی تھی۔ بابائے اردو ڈاکٹر [illegible]
کی تحریک پر یہ کام شروع ہوا تھا مگر خدا کرے اسکی تکمیل میں ستر سال نہ لگیں، اسکی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، غالباً ۲۰ جلدوں میں
ختم ہوگی، اسکی تدوین میں ایک بڑا لائق اسٹاف لگا ہوا ہے، اس کے بورڈ کے صدر جناب محمد ہادی حسین صاحب اور مہتمم مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے بہت ہی ممتاز قابل اور متحرک استاد اور اردو کے مشہور مصنف بھی ہیں،
اس میں انکا دلچسپ پرمغز اور پُر از معلومات مقدمہ ان کی علمی و ادبی بصیرت کا ثبوت ہے۔ امید ہے کہ ان کی سرگرمیوں
اور کاوشوں سے اس لغت کی آیندہ جلدوں کی اشاعت میں زیادہ تاخیر نہ ہوگی،

اس لغت پر آیندہ تنقیدیں بھی ہونگی اور تسامحات کی نشاندہی بھی کیجائیگی لیکن اسکی تمام جلدیں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں
میں آجائیں گی تو یہ کہنا پڑیگا کہ اس مفید کام کی وجہ سے اردو زبان کے وزن و وقار اور دولت میں ایسا اضافہ ہوا ہے،
جس پر اردو بولنے والے اسی طرح فخر کرسکیں گے جس طرح انگریزی بولنے والوں کو اپنی آکسفورڈ ڈکشنری کلاں پر ہے،

مخزن الغرائب مرتبہ شیخ احمد علی خاں ہاشمی سندیلوی تین ہزار ایک سو اڑتالیس فارسی شعرا کا بہت ہی ضخیم
تذکرہ ہے جو ۱۲۱۸ھ میں مرتب ہوا، دار المصنفین میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے، وہ بہت بڑی تقطیع کے ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہے،
مشکل ہی سے اٹھایا جاتا ہے، نیپلز کی ایک یونیورسٹی کے ایک استاد نے اس کو ایڈٹ کرنے کی کوشش کی تو اس کے حجم کو دیکھکر
گھبرا اٹھے، مگر اورینٹل کالج لاہور کے سابق پرنسپل اور اس برصغیر کے بہت ہی قابل قدر مصنف ڈاکٹر محمد باقر نے اسکو
ایڈٹ کرنے کا صبر آزما کام اپنے ذمہ لیا ہے، اس وقت تک اس کی دو جلدیں بہت عمدہ ٹائپ میں شائع کرچکے ہیں، جو
حروف تہجی کے لحاظ سے ش تک کے شعرا تک پہنچی ہیں، ابھی معلوم نہیں کتنی جلدیں اور شائع ہوں گی، اگر یہ پورا کام
ڈاکٹر محمد باقر کی لائق ستائش محنت اور مشقت سے انجام پاگیا تو ان کی بڑی اہم اور مفید علمی خدمت ہوگی جس کو
صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ ایران کا ادبی حلقہ بھی [illegible]
[illegible] کی جلدیں نذر کی ہیں، اس کے لئے یہ ادارہ ان کا ممنون ہے

مقالات

امتِ مسلمہ کی بعثت

از

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

عقیدۂ خلافت کے روسے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہلِ سعادت وہی ہیں جو اُن میں سے اس کو مانتے اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے ہیں، اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے دوگونہ فرائض کے اصلی نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں مگر اُن کی تبعیت میں اپنے اپنے وقت میں اُن کی اُمتیں بھی شامل رہی ہیں لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں، اور اب آپ کے بعد کوئی دوسرا قیامت تک آنے والا نہیں، تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں دنیا کی آخری امت ہو کر نمایاں ہوئی اسی لئے قرآن پاک اور احادیثِ نبویؐ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو آخرین یعنی پچھلوں کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے،

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔
(واقعہ)

وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک

(جمعہ) ان میں شامل نہیں ہوئے،

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کیونکہ کوئی نیا نبی قیامت تک آنے والا نہیں، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا، انھوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انھوں نے عصر تک مزدوری کرکے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا کام بخشا، انھوں نے مغرب تک کام کو انجام دیا، اور پوری مزدوری پائی، (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ، بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے، (کنز-۶-۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد ظاہر ہے کہ زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی امت دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری[1] و مسلم و نسائی میں گویا اسی اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے،

نحن الآخرون السابقون، ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے،

یعنی ظہور کے لحاظ سے تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے، (کنز ۶-۲۳۰) ابن ماجہ میں ہے، کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نحن آخر الامم (کنز ۶-۲۳۰) ہم سب سے آخری امت ہیں،

غرض ان آیات و حدیث سے یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ امت محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر

وہ آخری نبی کی امت ہے،

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا، اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا،

اس خصوصیت خاصہ کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے،

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس حفاظت کے جوارح مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرمائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو انجام دے گا، گو اس کی قدرت کی دست میں سب کچھ ہے، مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے بھی اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تھا، تو اس کا حصول بھی مجاہدات کے بعد ظہور ہوا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، وہ بھی اسباب و تدابیر کے پردہ میں پورا ہوگا، اور اس لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے اہل قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا، اور انہی کے ہاتھوں اور سینوں سے اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے،

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ (اعراف ۔)	[illegible]	ہمارے مخلوق بندوں سے ایک اُمّت ہے، جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے، (اور

اہلِ تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و استقبال دونوں کے لئے ہے، یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا، [1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرکے قرآن پاک کی پیشین گوئی ہے،

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ	اور تمھارے پیرؤوں کو تمھارے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ	نہ ماننے والوں پر قیامت تک غلبہ
(آل عمران)	رکھوں گا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہوں، اسی طرح اُن کے اصلی پیرو تو مسلمان ہی ہیں، [2] مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں وہ بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں، [3] بہرحال اس آیت سے یہ ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام اور اُن کے ساتھ یہ مسیحی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں بھی مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا ہے،

قرآن پاک کے ان اشاراتِ نص کی تصریح احادیثِ نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے،

لَا تزال من امتي امة قائمة	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت
بامر الله لا يضرهم من خذلهم	کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے
ولا من خالفهم حتى يأتيهم	اور اُس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ
امر الله وهم على ذالك،	سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی

---

[1] تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ، [2] تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ،

[3] تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ،

(بخاری علامات النبوة)

بات یعنی قیامت آجائیگی اور وہ اسی پر قائم

لا یزال ناس من امتی ظاهرین
حتی یاتیهم امر الله وهم
ظاهرون (بخاری علامات النبوة)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب
رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات
یعنی قیامت آجائے گی،

لا یزال من امتی قوم ظاهرین
علی النّاس حتی یاتیهم امر الله
(بخاری کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ
غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت
آجائے گی،

لا یزال من امتی امة قائمة
بامر الله لا یضرهم من
کذبهم ولا من خذلهم
حتی یاتی امر الله وهم علی
ذلك،
(بخاری کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ
احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا، اس
کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے
اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے،
یہاں تک کہ قیامت آجائے گی،

لا تزال طائفة من امتی
ظاهرین علی الحق لا یضرهم
من خذلهم حتی یاتی امر الله
وهو کذالک،
(مسلم کتاب الامارة)

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ
حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس
کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے
اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک
کہ قیامت آجائے گی،

لن یبرح هذا الدین

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہیگا

قائما یقاتل علیہ عصابۃ من	اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت
المسلمین حتی تقوم الساعۃ	ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ
(مسلم کتاب الامارۃ)	قیامت آجائے،
لا تزال طائفۃ من امتی	میری امت کا ایک گروہ قیامت
یقاتلون علی الحق ظاھرین الی	تک حق پر لڑتا رہے گا، اور اپنے
یوم القیامۃ (مسلم کتاب الامارۃ)	دشمنوں پر غالب رہے گا،
لا تزال طائفۃ من امتی	میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ
قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من	احکام الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے ان کو
خذلھم او خالفھم حتی یاتی	چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان
امر اللہ وھم ظاھرون علی	نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت
الناس، (مسلم کتاب الامارۃ)	آجائے گی، اور وہ غالب رہیں گے،
ولا تزال عصابۃ من	مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر
المسلمین یقاتلون علی الحق ظاھرین	ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک
علی من ناواھم الی یوم	اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی،
القیامۃ، (مسلم کتاب الامارۃ)	
لا تزال عصابۃ من امتی	میری اُمت کی ایک جماعت
یقاتلون علی امر اللہ قاھرین	خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی
لعدوھم لا یضرھم من	اور اپنے دشمنوں کو دبائے رہے گی،
خالفھم حتی تاتیھم الساعۃ	اس کے مخالف اس کو نقصان

وهم على ذالك،　　نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے

(مسلم کتاب الامارة)　　اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے،

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی اور حدیثیں مذکور ہیں[۵۱]، اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری تسکین خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشینگوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام میں آیندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی، اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا، وہ مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، بعض روایات میں ایک حدیث ہے العلماء ورثة الانبیاء[۵۲] یعنی امت محمدی کے علمائے حق انبیاء کے وارث ہوں گے، ظاہر ہے کہ یہ وراثت عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ سلسلہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰة والسلام پر ختم ہو چکا بلکہ ان کو نبوت کے فضائل و کمالات سے حسب استعداد و مراتب حصہ ملے گا، اور یہ تبلیغ دین، ہدایت خلق، دعوت حق، اقامت دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شبہات، ابطال مبطلین، اور تردید بدعات کے کام انجام دیں گے،

بلکہ علمائے امت کے علاوہ تمام صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۵۱] دیکھئے کنز العمال جلد سادس ص ۲۳۱ و ص ۲۳۵، [۵۲] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے، اور محدثین نے اسی لئے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی، ص ۲۴،

کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امتِ محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی،

کادت ھذہ الامۃ ان تکون انبیاء کلھا، (مسند طیالسی صفحہ ۳۵۳ عن ابن عباسؓ ومسند احمد وابویعلی)	قریب ہے کہ اس اُمت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں،

ایک دوسری حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس اُمت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا، اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدؐ سے لیا جائے گا، لہ یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہؓ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے " اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ٥	مجھے پکارو میں تمھیں جواب دوں گا یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا،

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاؑ کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا،

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ	اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی

لہ حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شھداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے،

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا اور تیسری یہ کہ اُن سے کہا گیا :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا — ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ — امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شہادت دو،

یہ بھی پہلے صرف نبی سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو،

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں اُمتِ محمدیہ کی جو تین فضیلتیں بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی،

"شہید" اور "شاہد" کے لغوی معنی "حاضر" کے ہیں کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لیے اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لئے اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لئے اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا،

۱- حمایتی اور مددگار کے معنی میں،

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ — اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ

دُوْنِ اللّٰهِ ۝ (بقرہ ۳-۳) — کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس آیت میں اس معنی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے،

وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ — اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے

ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۱۰) — میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں،

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں،

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے،

(حج - ۲)

اس معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں،

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں،

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۝ (مائدہ - ۱۲) (حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک میں اُن میں رہا نگراں رہا،

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں،

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا (نساء - ۶) بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے،

۵۔ امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں،

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ - ۱۷) یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو،

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو اچھی

عَنِ الْمُنْکَرِ		باتوں کو بتاتے ہو، اور بُری باتوں
(آل عمران - ۱۲)		سے روکتے ہو،

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اُمتِ محمدیہ جو آخری اُمت ہے، اس لئے پردۂ عدم سے باہر لائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ ہر نبی کے دعویٰ کی شاہد، حامی، مددگار، اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوا، کیونکہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا، پیغامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امتِ محمدیہ کے سپرد ہو گیا، اب یہ تنہا اُس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا اور وہ ساری امتوں کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے،

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی، وہ عرض کریں گے ہاں میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ اُن کی اُمت سے پوچھے گا، کہ کیا انھوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا، تمھارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے، وہ عرض

کریں گے، محمد اور اُن کی امت، تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرماکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں اسی معنی کی نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام بیانا مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے، کہ دنیا میں یہی ایک اُمت ہے، جو تمام انبیاء علیہم السلام اور اُن کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس اُمت کے سلسلہ میں داخل ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ اُن کے ایمان کا جزء ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں انبیاء کی صداقت کی تائید میں اُن کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا،

سورۂ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے،

ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ	اسی اللہ نے تم کو (اے امت محمدیہ) تم
فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ	کو (ساری امتوں میں) چنا ہے، اور
اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ	اللہ نے تمھارے دین میں کوئی تنگی
مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ	نہیں رکھی تمھارے باپ ابراہیم کا
الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَ	دین، اسی نے تمھارا نام مسلم پہلے
تَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۔	رکھا، اور اس قرآن میں بھی،

(حج آخر) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو، اور
تم لوگوں پر،

اوپر کی تین آیتوں میں امتِ محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا (عادل ومعتدل امت) خیر اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں لفظ اس امت کی برگزیدگی، بہتری، اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ اخیر لفظ اجتبٰکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا،) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے،

اس امتِ محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب قیامت تک کیلئے نبی ہو کر قیامت تک کی ساری امتوں کے لئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس فرض کو انجام دیا، اُن کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ اُمتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، اب جب تک دنیا آباد ہے ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشہ میں اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ الیٰ یوم القیام امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے، اسی کا نام بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امتِ محمدیہ کی بعثت ہے جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے،

> تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہو کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے، اور اس کی قوم کو ایک ایسی اُمت بنایا جائے، جو دوسری قوموں کی

اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔" (باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کر کے اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا وہ پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے، اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر تیسری قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہتا ہے،

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے،

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (جمعہ ۱) — وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی کے اندر سے بھیجا؛

اور امت کی بعثت کا بیان ذیل کی آیت میں ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۲) — قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو،

اور حدیث صحیح میں اسی بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا،

فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ، — تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغامِ حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف

سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، اور وہ پردۂ عدم سے اسی لئے باہر لائی گئی ہے، کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم :-

فلیبلغ الشاھد الغائب — میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے، جو یہاں موجود نہیں،

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری وساری فرمایا گیا کہ ہر حاضر العلم دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے،

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ، (توبہ: ۱۵)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے، اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے، تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے،

داعیوں کی یہ بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی، اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے، جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے :-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ — قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ	ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ	باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں
(آل عمران: ۱۲)	سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ اس امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے، اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی مانعت کے لئے سرفروشی کرے، اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے،

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی
الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ	ہونی چاہئے، جو لوگوں کو نیکی
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ	کی طرف بلائے، اور اچھے کام
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	کرنے کا حکم دے اور برے کاموں
(آل عمران - ۱۱)	سے منع کرے، اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کے آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں، اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہتی تھیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی، اور نو مولود قوموں کا داخلہ بند ہو گیا، مگر افسوس اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی، تو دوسری قوم آکر اس فرض کو ادا کرے گی،

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا	اگر تم نہ نکلو گے، تو خدا تم کو بڑی

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۝ (توبہ: ۶)

تکلیف کا عذاب دے گا، اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا، (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے،

پھر فرمایا :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۝ (مائدہ: ۸)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا، جن کو وہ دوست رکھے، اور جسے وہ دوست رکھیں، اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں، اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے،

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اُس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی،

اس بعثت سے منشاء الٰہی قوموں کی شاہد بنکر آنے والی اُمت کے آثار و مقاصد
کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے، جہاں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا	مومنو! رکوع کرتے اور سجدے کرتے
وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ	اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩	رہو، اور نیک کام کرو، تاکہ فلاح
وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ	پاؤ، اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو،
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ	جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے
عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ	تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین
حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ	کی کسی بات میں تنگی نہیں کی، اور
هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ	(تمھارے لئے) تمھارے باپ ابراہیم کا
مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ	دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی
الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ	پہلی کتابوں میں) تمھارا نام مسلمان
وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى	رکھا تھا، اور اس کتاب میں بھی
النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ	(وہی نام رکھا ہے)، تاکہ پیغمبر تمھارے
وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا	بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ	کے مقابلہ میں شاہد ہو، اور نماز پڑھو
الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۩	اور زکوٰۃ دو اور خدا کے دین کی
(حج ۱۰)	(رسی) کو پکڑے رہو۔ وہی تمھارا
	دوست ہے، اور خوب دوست ہے۔

ان آیتوں سے اس شاہد امت اور مجتبائے عالم کے حسب ذیل آثار و فرائض ظاہر ہیں،

۱۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی،

۲۔ ادائے زکوٰۃ پر عامل،

۳۔ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط

۴۔ رکوع و سجود و عبادتِ الٰہی کی خوگر،

۵۔ امورِ خیر پر حریص،

۶۔ راہِ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی،

امتِ محمدیہ کا جو گروہ ان فرائض کو انجام دے گا، وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشینگوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور انہیں سے حق تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے،

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نئی دینی تعلیم

از۔ ڈاکٹر محمد معین فاروقی ریڈر شعبۂ زوولوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایک زمانہ تھا جب شرق اسلامی ایک بحر زخار کے مانند تھا، جس کی موجین مشرق ومغرب کے ساحلوں سے ٹکراتی تھیں، لیکن آج وہ اس بند پانی کے مانند ہے، جو تلاطم سے ناآشنا ہے، سکون وجمود کی اس فضا میں ہر قسم کی آلودگی اثر انداز ہو رہی ہے، صدیوں سے اس حالت زار پر نوحہ خوانی ہو رہی ہے، جس نے حوصلوں کو پست اور دلوں کو مایوس کر دیا ہے، اس افسردگی اور پست ہمتی کی بنا پر ہم قعر ذلت میں گرتے چلے جا رہے ہیں، اب ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کی ہمت افزائی کی جائے اور غور وفکر کے بعد ترقی وسربلندی کا ایک منصوبہ بنایا جائے، اور لوگوں کو تقریروں کے بجائے عملی قدم اٹھانے پر آمادہ کیا جائے۔

اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم وفہم کے اعتبار سے ممتاز تھا، وہ مغربی افکار وخیالات اور مغربی تہذیب وتمدن پر اتنا فریفتہ ہو گیا کہ اپنے شعائر کی متاع بے بہا کھو بیٹھا اور لادینیت مین گرفتار ہو گیا، مغربی مفکرین کائنات اور انسان کو محض مادی نظر سے دیکھتے ہیں، اس فلسفے کے پیروان جاہلی عصبیتوں کو پھر سے زندہ کرنے پر راغب ہیں، جن کو اسلام نے ختم کیا تھا، وقت کا تقاضا ہے کہ

(۱) نئے طریقے سے اسلام کے لئے جدوجہد کیجائے، اور ایک ایسا ادب پیدا کیا جائے جو علمی ذہن کو مطمئن کردے۔

(۲) اسلام پر پھر سے ایمان لائیں [1]

مسلم معاشرے کی اس صورت حال پر غور کرتے وقت علم دین میں اپنی بے بضاعتی سدِ راہ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میدان مین قدم رکھنے کی جسارت اسلیے کیجا رہی ہے، تاکہ جدید علوم کے مسلمان طالب علم کا نقطۂ نظر اہل علم کی خدمت میں اصلاح کی خاطر پیش کیا جاسکے۔ موجودہ بدحالی کے وجوہ اگر ایک طرف مسلمانون کی تاریخ، سیاست، معاشرت اور معاشیات مین تلاش کی جائین تو دوسری طرف تعلیم قرآن اور حالاتِ حاضرہ کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو احکام خداوندی کی ایک قسم تو وہ ہے، جس کے لئے ایک مکمل قانون موجود ہے، اور دوسری وہ جس کیلئے کوئی باضابطہ شریعت تو موجود نہیں ہے۔ مگر تفکر فی خلق اللہ پر بڑا اصرار ہے، قرآن مجید میں طرح طرح سے اس پر زور دیا گیا ہے، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری عملی زندگی میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ تفکر کی اس قرآنی دعوت کی جانب باقاعدہ توجہ نہیں کی جاتی ہے، اس بے توجہی کے نتائج بہت دور رس ہیں، اسلیے اسلامی شخصیت سازی مین ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے،

کلام پاک پر جب غور کیا جائے، تو ایک عامی بھی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس طرح اطراف و جوانب میں بکھری ہوئی مادی اشیاء پر قرآن حکیم ہماری توجہ دلانے کا خواہش مند ہے، کہین اجرام فلکی کے مدارون کی طرف اشارہ کرکے نظام کائنات میں

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس موضوع پر "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے۔

ترغیب دلائی جارہی ہے، کبھی پکتے ہوئے پھل اور پھوٹتے ہوئے بیجوں پر نئے نئے سوال چھیڑ کر فکر میں تحریک پیدا کی جارہی ہے، کہیں مویشیوں پر غور وفکر کی دعوت ہے کہ کس طرح ان کے خون اور فضلہ کے درمیان سے لذیذ دودھ نکل رہا ہے کہیں پرندوں اور اونٹوں کی ساخت پر توجہ دلائی جارہی ہے، یہ دعوت فکر عام ہے، کسی مخصوص طبقے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی، بلکہ سبھی کو تفکر وتعقل پر آمادہ کیا گیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ فکری زاویئے بھی بدلتے رہتے ہیں، ایک دور تھا، جب روحانیت کا زور تھا، اور الحاد کا زیادہ چرچا نہ تھا، آج روحانیت کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل اور یونیورسٹی گریجویٹس کے درمیان زبردست خلیج حائل ہوگئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف اور انداز فکر سے ناآشنا ہیں، ایک معروضی طرز پر کائنات کے مظاہر کو اپنا محور فکر بناتا، اور اس طرح عقل کو مطمئن کرتا ہے، دوسرا استدلال کے ان رموز سے ناآشنا ہے، کتنے ایسے ہونگے، جنھوں نے مدرسوں کی حدود سے نکل کر آسمان کے اس وسیع سائبان کے نیچے اللہ کی تخلیق کے دافرنمونوں پر اس نیت سے نظر ڈالی ہوگی کہ ان میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں، قرآن کی تاکید تھی کہ ناواقف اہل علم کی طرف رجوع ہوں لیکن کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے اس ارشاد ربانی کو آویزۂ گوش بنایا، قدیم وجدید الگ الگ راہوں پر چل رہے ہیں، اگر یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تو آیات آفاق وانفس کی گرہ کشائی انسانیت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی، اور زمانۂ سابق کی طرح آج بھی مسلمان علم وتحقیق کے ہراول سمجھے جاتے اور پستی ودست روی کے بجائے امامت اقوام کے بلند منصب پر فائز ہوتے۔

آج واعظ قیامت کی منظر کشی کرتے ہیں، لیکن اگر اس کے ساتھ جاپان کی قیامت صغریٰ (ایٹم بم) کے واقعات بھی پیش کر دئے جائیں تو سامعین کو اندازہ ہو جائے کہ جب انسانی تخلیق میں یہ قدرت ہے تو اس کے خالق کی برپا قیامت کی حدت و ہولناکی کا کیا حال ہوگا، آج حقائق کے مشاہدہ اور سائنٹفک اختراعات نے ایمان و یقین کے در کس طرح کھول دیئے ہیں، ضرورت ان علوم سے کام لینے کی ہے۔ سائنسی انکشافات کے قابلِ قبول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دعووں کے پس پشت وہ تاریخ ہے، جس کی بنیادیں تجربہ اور مشاہدہ پر استوار ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے آگے عقلِ انسانی سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔

آج خرقِ عادات کے نمونے ظاہر نہیں ہوتے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، نفس پر عقل کی حکمرانی ہے، یہ سچ ہے کہ عقل ہی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، مگر عقل، بے راہ روی، گمراہی کے اسباب فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ عقل کی کج روی کا سدباب کیا جائے ہم حالیہ حیاتیاتی اور طبیعیاتی انکشافات سے فائدہ اٹھائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان سے خالص علمی حد تک ہی اخذ و استفادہ کیا جائے، اور ان کی نظریاتی و مفروضاتی توجیہات پر بے چون و چرا اعتماد نہ کیا جائے، عقل کی رسائی محدود ہے اور انسانی تجربات غلطیوں سے بالکل محفوظ نہیں ہوتے، مشاہدات میں بھی بسا اوقات دھوکا ہوتا ہے، یہی حال ہمارے باطنی واردات اور اندرونی محسوسات کا ہے بعض وقت ہمارے خیالات اور ذہنی رجحانات کشفی مشاہدہ بن جاتے ہیں، حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی کشف کو کفش زنی کے لائق قرار دیا ہے، دراصل وحی کے سوا علم کا کوئی ذریعہ بھی بے خطا نہیں ہے، کتاب الٰہی کے ساتھ کائناتِ ربانی پر غور و خوض، نتائج و انکشافات کو

حقیقت سے دور نہیں ہونے دیتا ہے، ورنہ عقل بے زمام کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، البتہ غور و خوض، جمود و تنگ نظری سے پاک ہو، ماضی کے تجربات پیش نظر رہیں، لیکن زنجیر پا نہ بننے پائیں، بنیادی عقائد میں ثبات و استحکام ہو، اوامر و نواہی کا لحاظ رکھا جائے، اس کے بعد عقل و تجربہ کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ کیا جائے، اور ان اصول و قواعد کا پتہ لگایا جائے، جو اس عالم میں جاری و ساری ہیں، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسکا باعث کوئی بے شعور مادہ نہیں ہے، بلکہ سب ایک علیم و بصیر ذات کی کارفرمائی ہے، دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ان مقررہ اصول و قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو خالق کائنات نے وضع کئے ہیں۔ اسی طرح عالم بالا سے جو احکام نازل ہوتے ہیں وہ بھی ایک مرتب سلسلۂ اسباب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس بارے مین اپنا ذاتی تجربہ ان الفاظ مین بیان کیا ہے۔

> "اس چیز کا میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے، ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ چند آدمی آپس میں لڑ رہے تھے، اور حسد کی آگ ان میں حد درجہ مشتعل ہو گئی تھی، میں نے بارگاہ الٰہی میں اس حسد کے رفع ہونے کی التجا کی، اسوقت میں نے ایک نورانی مثالی نقطہ دیکھا جو۔۔۔۔۔ زمین پر اترا۔ اترنے کے بعد اس نے پھیلنا شروع کر دیا، یہانتک کہ جب وہ پوری طرح زمین پر پھیل گیا، ان لوگون کے قلوب حسد سے پاک و صاف ہو گئے، اور ہم مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ انمیں لطف و محبت کی برکتیں پیدا ہو گئین،۔۔۔۔۔ اس بارے میں عقل کی بات یہ ہے کہ وہ مخلوق جو اوپر سے اترتی ہو، اسباب عادیہ میں سے ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔"

یہ دنیا عالم اسباب ہے، اس کا نظام اس نہج پر وضع کیا گیا ہے،

اترہ میں اُس وقت تک کوئی حرکت ممکن نہیں ہے، جب تک کوئی سبب اس سے وابستہ
ہ، جب کائنات میں سبب اور نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہو تو حوادث و واقعات کے
اب کو دریافت کئے بغیر دنیا کے ذخائر سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور کیونکر اللہ
لمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھیں اسباب میں تسخیر کائنات
جو راز موجود تھا، یہ مقدس راہ قرآن مجید نے تجویز کی تھی، اسی سبق کو بھلا کر ہم دوسروں
دستِ نگر ہوگئے، اور سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ جو دین پوری زندگی پر محیط تھا،
چند رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا۔

مندرجۂ بالا تحریر سے نہ تو مروجہ تعلیمی نظام پر کوئی تخریبی تنقید مقصود ہے، اور نہ
ی قسم کی نشتر زنی سے شخصیتوں کو مجروح کرنا ہے، بات صرف اتنی سی ہے کہ قرآن کریم
ی جتنی آیتیں شرعی احکام و فرامین سے متعلق ہیں، ان سے ۵ گنا زیادہ عجائبات
رت پر غور و خوض کی دعوت دے رہی ہیں، اس صورت حال کو کس طرح نظر انداز
یا جاسکتا ہے، البتہ جن علامات کو محور فکر بنانے پر اصرار ہے، اُن کے متعلق تفصیلی
لومات کی فراہمی ناگزیر ہے اس کے بغیر فکر کے لئے راہ ہموار نہیں ہوسکتی، شب و روز کے
نئے اکتشافات و تحقیقات سے علم کا دریا وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اب ضرورت ہے کہ
کائنات میں از سالمہ تا انسان جو نظام قائم ہے، اس کی جھلکیاں نظر آنے لگیں ایک
نصاب تیار ہو اور ہمارے تعلیمی نظام میں اسکا مقام متعین ہوجائے تاکہ طلبہ کو فکر کیلئے
واد اور اس کی مشق کے لئے ذرائع فراہم ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل عمر میں کوئی فرد
سارے علوم کا ماہر نہیں بن سکتا البتہ باہمی تعاون ہی سے کوئی راہ نکل سکتی ہے۔

بچوں کی تعلیمی تنظیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ ہے۔

مسلمان بچوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی جاتی ہے کہ مسلمان گھر میں پیدا ہونا ہی دائرۂ اسلام میں داخلے کی ضمانت ہے، اس طرز استدلال کے تحت اگر روز اول سے احکام کا سلسلہ نازل ہونا شروع ہوجاتا، اور اُن احکام کو بزور نافذ کیا جاتا تو بعض اوقات اسکا ردعمل شدید بغاوت کی شکل اختیار کرنا، کیونکہ یہ دین بچے کو وراثت میں ملا ہے، غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا، اکثر پرہیزگار گھرانوں کے ذہین فرزند اسی وجہ سے لادینیت کا شکار ہوجاتے ہیں، یہ ایک بڑا المیہ ہے۔

دراصل اسلامی فکر و عمل کا منبع وہ یقین محکم ہے جو وجود باری تعالےٰ کے اقرار سے متعلق ہے، جب تک اس اقرار کا حق ادا نہ ہو اُس وقت تک عقیدہ اور عمل میں اخلاص پیدا نہیں ہوتا، حق اس کا یہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کو ہم اس طرح مانیں جیسے آنکھ سے دیکھ رہے ہوں اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہوسکے تو اتنا ضرور یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، اگرچہ یہ کیفیت توفیق الٰہی کی محتاج ہے پھر بھی سازگار ماحول اور مناسب تعلیم کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی۔

خورد سالی میں کلمۂ طیبہ کے قولی اقرار سے بلاشبہ بچہ مسلمان تو ہوجاتا ہے، مگر "آمَنُوا" کا تقاضا اسی وقت پورا کرسکتا ہے، جب سن شعور کو پہونچے اس کی عقل بالغ ہوجائے اور اُس پر فہم و فراست کے دروازے کھلنا شروع ہوجائیں، یہی وہ وقت ہے، جب کہ خداوند عالم کی تلاش ہو، مگر چونکہ ذات حقیقی پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے، وہ اس عالم اسباب میں نظر نہیں آسکتی، اس لئے لازم ہے کہ اس کے حکم کے بموجب اس کی نشانیاں اس کی قدرت کے مظاہر میں تلاش کیجائیں، جن کا ادراک قطعی پر ہمارے حواس سے ممکن ہے، یہی نشانیاں اس کے وجود، اس کی حکمت، اس

تدبیر و تقدیر پر پوری پوری دلالت کرتی ہیں، اور یہی قوت دلالت اس کے سوئے ہوئے ذہن کو جھنجھوڑ کر بیدار کر سکتی ہے، انواع و اقسام کی نشانیاں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہے، کبھی یہ نشانیاں حیوانات کے عجائب میں نظر آتی ہیں، جس کی مثال ایک فاضل ماہر حیوانات جے۔ آر۔ نارمن کے اس بیان سے واضح ہو جاتی ہے، جس کو انھوں نے اپنی ایک درسی کتاب میں شایع کیا ہے، لکھتے ہیں:

"زینزی بار (Zanzibar) کے مچھلی بازار میں مچھلی کا ایک ایسا نمونہ آیا جسکی دم پر کچھ نشانات پائے گئے، جن کی حیرت انگیز مشابہت عربی کی اس عبارت سے تھی کہ دم کی ایک طرف لا الٰہ الا اللہ اور دوسری طرف شان اللہ پڑھا جاتا تھا۔"

اسی طرح کی ایک اور مچھلی مبئی کے مچھلی گھر میں آج بھی موجود ہے، جو شان اللہ کے نام سے مشہور ہے۔

اللہ کی یہ نشانیاں کبھی کبھی اس طرح بھی ظاہر ہوتی ہیں کہ غیبی پردے اٹھا کر ان کیفیات کا عمومی مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے، جو بظاہر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں، عراق کا وہ واقعہ جس میں دو جلیل القدر صحابیوں کے جسد اطہر کو تازہ ترین حالت میں قدیم مزارات سے ۱۹۳۲ء میں نکال کر دوسرے محفوظ مقام پر دوبارہ سپرد خاک کیا گیا، ہماری یادداشت میں اب بھی محفوظ ہے۔

اب تک اتنا تو معلوم تھا کہ بعض اوقات خشک ریگستانی علاقوں میں مردہ جسم کا پانی جلد خشک ہو جانے اور فضائی ماحول کے زیر اثر کھال سکڑنے اور ہڈیوں کے ڈھانچ

پر منڈھا جانے سے ایک بد نما سی "قدرتی ممی" تیار ہو جاتی ہے، جو سالہا سال تک زمین میں دفن رہ سکتی ہے۔ مگر مرطوب زمین میں چودہ سو سال تک مردہ جسم کا اس طرح محفوظ رہنا کہ ہر ہر عضو تازہ ترین حالت میں نکلے ایک ایسا منظر ہے، جس کی توجیہہ کرنے سے سائنس قاصر ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، و راقم کے پاس اس موقع کے منظر کا ایک فوٹو موجود ہے جو جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ یہ واقعات صرف متحیر کرنے کے لیے ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی حقانیت پر دلالت کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس ملک کی سرکاری سطح پر اس واقعہ کی پوری چھان بین کی جائے اور ایک کتابچہ کی شکل میں پوری ذمہ داری کیساتھ لوگون کے سامنے رکھا جائے، تاکہ ایمان والون کا یقین تازہ ہو، اور جو اس نعمت سے محروم ہیں اُن کی فکر کے لیے غذا فراہم ہو۔

پھر اللہ سے تعلق کے لیے اس کی توفیق کے علاوہ مشاہدے اور تجربے کی بھی ضرورت ہے جس کا براہ راست تعلق تعلیم و تربیت سے ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے اپنے ملک میں بچون کی تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ عمر کا یہی وہ نازک دور ہے، جس کو جس رنگ میں چاہیں رنگ سکتے ہیں، ماہر نفسیات ایریکسن (Erickson) کے خیال کے مطابق ۱۰۔۲ سال کے بچے میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چیزوں کی بناوٹ اور طریقۂ کار پر غور کر سکے نیز استخراجی استدلال کی صلاحیت (Deductive reasoning) بھی اسی عمر سے شروع ہو جاتی ہے۔ مزید بر ان تجسس انسان کا ایک فطری تقاضا ہے۔ بچون میں یہ کیفیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، کسی بھی ماحول کا پروردہ ایک سات سالہ بچہ ہر نئی چیز دیکھ کر کس قدر سوچتا ہے، وہ اپنی استطاعت کے

مطابق اس کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے، یہ صفت کسی قوم یا نسل سے وابستہ نہیں، اور نہ کسی ملک کا اجارہ ہے، بلکہ یہ انسانی فطرت کی ایک بنیادی حقیقت ہے، جو تربیت پاکر پروان چڑھتی ہے، اور اگر اس کو جلا نہ دی جائے تو معدوم ہو جاتی ہے، لہذا ہمارا فرض ہے کہ یہ شمع جو قدرت نے بچے کے دل میں روشن کی ہے اس کی تابناکی اس کی عمر کے ساتھ بڑھتی جائے، اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ مخلوقات کے "چلتے پھرتے" ایسے نمونے اس کے سامنے رکھے جائیں جن سے خدا کی قدرت اور اس کے وجود کا پتہ چلے تاکہ اس کے تجسس میں اضافہ ہو اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو اور یہی نمو پاکر اس کا مزاج بن جائے۔ اس طرح جب اللہ کا تعارف اس کی مخلوقات کے ذریعہ بچوں سے کرایا جائے گا، تو ان کے تحت الشعور کی صف اول میں اللہ کی صنعت اور عظمت کا ایسا نقش قائم ہوگا جو عمر کے ساتھ ابھرتا جائے گا، اور مظاہر قدرت کی توجیہ کرتے وقت امید ہے کہ یہی رنگ غالب رہے گا۔

علم حیاتیات اس سلسلے میں دلچسپ تجرباتی ساز و سامان اور بیش بہا معلومات فراہم کر سکتا ہے، مثلاً ایک نئی زندگی کی تخلیق کے مختلف مراحل مرغی کے انڈے توڑ کر بآسانی دکھائے جا سکتے ہیں، جو ۱۱، ۹ سال کے بچوں کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوں گے، استاد کا یہ کام ہوگا کہ وہ انڈے کی زردی اور سفیدی کی نفی کر کے اللہ کی قدرت کا نقش بچوں کے ذہن پر ثبت کر دے۔ معمولی سی ٹریننگ کے بعد اچھے اساتذہ بھی تیار

ے ملاحظہ ہوں تدریسی طریق کار کے وہ عام اصول جو اہل مغرب کے تعلیمی اداروں میں صدیوں سے معروف و مقبول رہے ہیں (مثلاً تدریسی عمل کے دوران طلبہ کی ذہنی حرکت، معلوم سے نامعلوم کی طرف، خصوصیت سے عمومیت کی طرف، مرئیات سے غیر مرئیات کی طرف ہونی چاہئے)۔

ہو سکتے ہیں، اور مل جل کر ایک مفید نصاب بھی تیار ہو سکتا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ کا فرمان ہے۔

"فکر و تدبر کی ایک ساعت ۶۰ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

ایک بار حضرت علیؓ کے سوال کے جواب میں اپنے اسی ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے ۱۲ باتیں فرمائیں جن میں دوسری بات یہ تھی۔

"عقل میرے دین کی اصل ہے۔"

عقل اور دین کے اس رشتہ کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ساری نعمتوں کے ساتھ عقل جیسی نادر نعمت کا حساب بھی دینا پڑے گا۔

مندرجۂ بالا تحریر کے پیش نظر مندرجۂ ذیل نکات قابل غور ہیں۔

(۱) علم کو دو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے جو ثنویت عمل میں آئی ہے اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔

(۲) قدیم اور جدید کتابوں میں ان عنوانات پر نظر ثانی کی جائے، جن کا تعلق سائنس سے ہے، اور جن کو بعد کی تحقیق نے غلط ثابت کر دیا ہے، (علامہ طنطاوی جوہری کی تصنیف جواہر العلوم، مثال کے طور پر)

(۳) دینی مدارس میں فکری مباحث کے ساتھ ساتھ جدید آلات کے ذریعہ تجربہ اور مشاہدہ کو فروغ دیا جائے، (طاقتور دوربین کے ذریعہ اجرام فلکی کا مطالعہ، اسی طرح خوردبین وغیرہ کا استعمال کیا جائے)

(۴) جدید علوم کے ذریعہ قرآنی آیات کی تفسیر کرتے وقت اکثر تصنیفات میں غلو کا پہلو نمایاں رہا ہے، اس سے احتراز کیا جائے، صرف انھیں آیات کو موضوع

بنایا جائے، جو مستند تحقیق کے ذریعہ تشریح طلب ہوں،

(۵) فکری ریاضت کے لیے نیا ادب تیار ہو، رسائل کی فراوانی کے پیش نظر چند معیاری مدرسے وجود میں آئیں، جن میں تجربہ کی خاطر نئی تعلیم کا انتظام ہو، تصنیف کا ایک سلسلہ بعنوان حیاتیات اور اسلام اور فلکیات اور اسلام وغیرہ شروع ہو۔

(۶) اعتقادات میں توہم کا عنصر داخل ہو گیا ہے، جذبات کے امتزاج سے اس کی خوب نشوونما ہوئی ہے، اب اس سے احتراز ضروری ہے، کیونکہ موجودہ دور میں کوئی قوم ان روایات پر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی، ان حیرت انگیز اور جذبات آفریں اخبار و قصص کی پوری چھان بین کی جائے۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

مؤلفہ۔ مولانا ابو الحسنات ندوی، مرحوم :

ہندوستان کی قدیم تاریخ کی فارسی کتابوں میں جو عہد مغلیہ میں یا اس کے بعد لکھی گئی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال، جو خود دلی اور اس ملک کے مختلف شہروں میں قائم تھیں، اور ان میں ماہرین تعلیم اساتذہ کی نگرانی میں درس و تدریس کا کام زور شور سے جاری تھا، معلوم کرنا چاہیں، تو ہمیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی، مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم سابق رفیق دار المصنفین نے اپنے زمانۂ رفاقت میں سید صاحب مرحوم کے ایما سے ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر نہایت تلاش و تحقیق سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو باقساط پہلے معارف میں شائع ہوا اور اسکو اہل نظر نے بیحد پسند کیا، اور مقالہ نگار کو دادودی کو سید صاحب نے مصنف کی یادگار میں اپنے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے کتابی شکل میں شایع کر دیا تھا، یہ بھی بہت مقبول ہوا۔

یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے، قیمت چار روپئے، ستر پیسے،

ابن جزار قیروانی

از جناب اطہر ریحان صاحب فلاحی، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمان اطباء میں ابن جزار قیروانی بڑی اہمیت رکھتا ہے، طب کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی اس کی کئی قابل قدر تصانیف ہیں، ان میں سے بعض شایع ہو چکی ہیں، اور بعض قلمی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں، بچوں کے نشو ونما اور علاج پر سیاستہ الصبیان و تدبیرہم کے نام سے انھوں نے ایک اہم کتاب لکھی تھی، کئی برس ہوئے ڈاکٹر محمد حبیب الھیلہ نے اسے بڑی تحقیق کے ساتھ ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اور اس پر بڑا پر مغز مقدمہ لکھا ہے، ذیل کی سطور میں اس فاضلانہ مقدمہ، ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب کی کتاب اور دوسرے مقالات و کتب کی مدد سے اس نامور عالم اور صاحب نظر طبیب کے حالات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تونس کے شہر قیروان کے ایک علمی خانوادہ میں ۲۸۵ھ/۸۹۵ء میں ابن جزار پیدا ہوا، اس کا پورا نام ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن خالد بن جزار ہے جسے اہل یورپ Algizar کے نام سے جانتے ہیں، وہ ایک ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کا علم طب سے بڑا گہرا تعلق تھا، اس کے والد ابراہیم اور چچا ابوبکر محمد دونوں ہی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے،

ابن جزار نے اگرچہ اپنے والد سے بھی علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن زیادہ تر چچا کے
ن سے استفادہ کیا، ابن جزار نے اپنی کتاب "طب المشائخ" میں کئی جگہ اس کا ذکر
ہ، اسکے علاوہ عبیدی سلاطین کے طبیب خاص حکیم اسحٰق بن سلیمان کے سامنے بھی زانوے
مذ تہ کیا[1] یہ وہ زمانہ ہے، کہ یہ زیادۃ اللہ ثالث سے ملنے مصر سے قیروان آئے تھے،
لیم سے فراغت کے بعد اس نے مطب کھولا جس سے ملحق ایک دواخانہ بھی قائم کیا،
ں کا انتظام اس کے غلام رشیق کے سپرد تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں ابن جزار کی حذاقت کا
رہ ہوگیا، اور اس نے بڑے معرکے کے علاج کئے بعض مورخین نے اس کی بعض غلطیوں کا
ر بھی کیا ہے، مگر یہ بیانات صحیح نہیں ہیں۔

طبی علوم میں مہارت کے ساتھ دوسرے علوم سے بھی وہ آشنا تھا، اس کا اندازہ
س کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

فن تاریخ میں اس کی کتابیں بعد کی بہت سی تاریخی کتابوں کے لیے مراجع کی حیثیت
ھتی ہیں، اس کی کتاب اخبار الدولہ یاقوت حموی کی معجم البلدان کے مراجع میں داخل
ہے، ابن ابی اصیبعہ اور مقریزی نے بالترتیب عیون الانبار اور اتعاظ الحنفاء کی تالیف
ں اس کتاب سے بڑی مدد لی ہے، اس کی دوسری تالیف التعریف بصحیح التاریخ
سے مالکی، قاضی عیاض، دباغ، ابن فرحون نے بالترتیب اپنی کتابوں ریاض النفوس
لمدارک، معالم الایمان، الدیباج کی تصنیف میں استفادہ کیا ہے، نیز ابن حیان
ور ابن خلکان نے اپنی تالیفات المقتبس اور وفیات الاعیان میں اسے مصدر اور
رجع کی حیثیت دی ہے۔

---

[1] مقدمہ سیاستہ الصبیان وتدبیرہم ص ۲۸

ابن جزار قیروانی

از جناب اطہر ریحان صاحب فلاحی، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمان اطباء میں ابن جزار قیروانی بڑی اہمیت رکھتا ہے، طب کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی اس کی کئی قابل قدر تصانیف ہیں، ان میں سے بعض شایع ہو چکی ہیں، اور بعض قلمی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں، بچوں کے نشو و نما اور علاج پر سیاسۃ الصبیان و تدبیرہم کے نام سے انھوں نے ایک اہم کتاب لکھی تھی، کئی برس ہوئے ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ نے اسے بڑی تحقیق کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اور اس پر بڑا پُر مغز مقدمہ لکھا ہے، ذیل کی سطور میں اس فاضلانہ مقدمہ، ڈاکٹر حسن حسنی عبدالوہاب کی کتاب اور دوسرے مقالات و کتب کی مدد سے اس نامور عالم اور صاحبِ نظر طبیب کے حالات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تونس کے شہر قیروان کے ایک علمی خانوادہ میں ۲۸۵ھ/۸۹۵ء میں ابن جزار پیدا ہوا، اس کا پورا نام ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن خالد بن جزار ہے جسے اہل یورپ Algizar کے نام سے جانتے ہیں، وہ ایک ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کا علم طب سے بڑا گہرا تعلق تھا، اس کے والد ابراہیم اور چچا ابو بکر محمد دونوں ہی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب

ابن جزار نے اگرچہ اپنے والد سے بھی علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن زیادہ تر چچا کے درس سے استفادہ کیا، ابن جزار نے اپنی کتاب "طب المشائخ" میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے، اسکے علاوہ عبیدی سلاطین کے طبیب خاص حکیم اسحق بن سلیمان کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا۔[۱] یہ وہ زمانہ ہے، کہ یہ زیادۃ اللہ ثالث سے ملنے مصر سے قیروان آئے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے مطب کھولا جس سے ملحق ایک دواخانہ بھی قائم کیا، جس کا انتظام اس کے غلام رشیق کے سپرد تھا، کچھ ہی عرصہ میں ابن جزار کی حذاقت کا شہرہ ہوگیا، اور اس نے بڑے معرکے کے علاج کئے بعض مورخین نے اس کی بعض غلطیوں کا ذکر بھی کیا ہے، مگر یہ بیانات صحیح نہیں ہیں۔

طبی علوم میں مہارت کے ساتھ دوسرے علوم سے بھی وہ آشنا تھا، اس کا اندازہ اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

فن تاریخ میں اس کی کتابیں بعد کی بہت سی تاریخی کتابوں کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کی کتاب اخبار الدولہ یاقوت حموی کی معجم البلدان کے مراجع میں داخل ہے، ابن ابی اصیبعہ اور مقریزی نے بالترتیب عیون الانبار اور اتعاظ الحنفاء کی تالیف میں اس کتاب سے بڑی مدد لی ہے، اس کی دوسری تالیف التعریف بصحیح التاریخ سے مالکی، قاضی عیاض، دباغ، ابن فرحون نے بالترتیب اپنی کتابوں ریاض النفوس المدارک، معالم الایمان، الدیباج کی تصنیف میں استفادہ کیا ہے، نیز ابن حیان اور ابن خلکان نے اپنی تالیفات المقتبس اور وفیات الاعیان میں اسے مصدر اور مرجع کی حیثیت دی ہے۔

---

[۱] مقدمہ سیاستہ الصبیان وتدبیرھم ص ۲۸

اس کی کتاب طبقات القضاۃ سے قاضی عیاض نے اپنی کتاب المدارک میں بہتیرے اقتباسات لیے ہیں، اس کی ایک مشہور کتاب مغازی افریقیہ کا حوالہ ابو عبید البکری نے اپنی مایہ ناز تصنیف المسالک والممالک میں دیا ہے۔[1]

طبیب اور مورخ ہونے کے ساتھ حس لطیف اور ادبی ذوق بھی اسے فطرۃً ودیعت تھا، اس کی ادبی تصنیفات کی فہرست بھی طویل ہے، اس کی کتابیں المکلل، الفصول فی سائر العلوم والبلاغات، رسالۃ فی الاستھانۃ بالموت۔ اس کے ادبی ذوق کا شاہکار ہیں، اس کی ادبی دلچسپی اور اس میں دسترس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہو کہ جب ایک مرتبہ ابوعبد اللہ القزاز کی کتاب الحروف اس کی نظر سے گذری تو اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "میرے علم میں کوئی ایسا نحوی نہیں جس نے اس کتاب سے بڑھ کر کچھ لکھا ہو"[2]

ابن جزار کی علمی ہمہ جہتی کا اعتراف اس لئے اور بھی کرنا پڑتا ہے کہ اس نے فلسفہ، حجریات اور عطریات پر بھی کتابیں اور کتابچے لکھے ہیں،

مزاج | ابن جزار ایک سنجیدہ، خاموش طبع اور بااخلاق شخص تھا۔ تاریخ و سیر کی کتابیں اس کی عظمت مرتبت کی معترف ہیں۔ دنائت اور پستی کردار سے اس کا دامن پاک ہے، وہ امراء اور سلاطین کے یہاں حاضری نہ دیتا تھا، خلیفہ معز کے چچا ابو طالب فاطمی کے یہاں اس کی آمد و رفت تھی، مگر یہ امارت و ریاست کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ مورخین نے تصریح کی ہے کہ ان دونوں کے درمیان دوستانہ روابط تھے[3]

---

[1] مقدمہ سیاسۃ الصبیان ص ۳۰ از ڈاکٹر محمد حبیب الھیلہ، [2] عیون الانباء از ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۳۷ [3] مقدمہ سیاسۃ الصبیان دفتر ہم از استاذ محمد حبیب الھیلہ طبع ۱۹۲۹ء تونس

مہارت فن اور استغنا، ابن جزار کی طبی مہارت کی بڑی شہرت تھی اسکا مطب مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ لیکن وہ حریص اور طماع نہیں تھا۔ معائنہ اور تشخیص کے بعد وہ مریضوں کو اپنے غلام رشیق کے حوالہ کردیتا تھا، وہی انھیں دوائیں دیتا تھا، اور واجبی قیمت وصول کرتا تھا، خود ابن جزار کبھی بھی کسی سے کوئی فیس یا نذرانہ نہیں لیتا تھا، اس کے نزدیک بحیثیت مریض غریب و امیر چھوٹے بڑے سب یکساں تھے،

ایک بار ابن جزار کے مطب میں قاضی نعمان[1] بن محمد منصور کا بھتیجا آیا۔ بھیڑ کی وجہ سے اسے کوئی نشست نہ مل سکی مگر قاضی صاحب کی اہمیت کے باوجود ابن جزار نے معائنہ میں مریضوں کی ترتیب کا لحاظ رکھا، اور باری سے پہلے ان کے قارورہ کا معائنہ نہیں کیا، نسخہ لکھا، تشخیص کے بعد وہ دوا لیکر چلا گیا، اور جب تک مکمل طور پر صحت حاصل نہیں ہوگی بیمار آتا رہا۔ راوی کا قول ہے کہ حصول صحت کے بعد ایک صبح قاضی نعمان کا نوکر شکریہ کا خط اور ایک رومال جس میں تین سو مثقال کی ایک تھیلی لپٹی ہوئی تھی لیکر ابن جزار کے پاس حاضر ہوا، ابن جزار نے خط کے جواب کے ساتھ وہ تھیلی جوں کی توں واپس کردی اور کسی طرح اسے قبول کرنے پر راضی نہ ہوا۔[2]

ابن جزار کو زندگی ہی میں بڑی شہرت و نیک نامی حاصل ہوئی، اموی خلیفہ حکم خود بڑا ذی علم تھا، اور اہل علم کی بڑی قدر کرتا تھا، اس کی بڑی خواہش تھی کہ ابن جزار اسکے دربار سے وابستہ ہوجائے مگر وہ قیروان چھوڑ کر نہ آسکا۔[3]

وفات، ابن جزار نے ٣٦٩ھ میں وفات پائی، انتقال کے بعد جب اس کے سامان کا جائزہ لیا گیا تو عام استعمال کی چیزوں کے علاوہ ٢٤ ہزار دینار نقد اور تقر

---

[1] عبیدیوں کے ایک مشہور قاضی القضاۃ تھے، [2] طبقات ابن جلجل ص ١٠٠ تا ١٠٥ [3] ریاض النفوس

۲۰ کو مثل کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ ملا ہے[1]
وفات کی کوئی متعین تاریخ مورخین نے نہیں لکھی۔ اس سلسلے میں بہت سے اختلافات ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ابن جزار کی موت تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں واقع ہوئی۔ یاقوت حموی اور صفدی نے اسی پر اکتفا کیا ہے کہ سن ۳۵۰ھ تک زندہ رہا۔ البتہ ابن عذاری نے البیان المغرب میں ۳۶۹ھ سال وفات لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ نے اپنی مشہور کتاب کشف الظنون میں تقریباً ۱۰ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے مختلف بیانات میں اس قدر اضطراب ہے کہ کسی ایک متعین تاریخ کو ترجیح دینا مشکل ہے، انھوں نے ایک عجیب بات یہ بھی لکھی ہے کہ اس کی موت اندلس میں قتل کے سبب ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ اندلس کبھی گیا ہی نہیں، ایسا لگتا ہے کہ حاجی خلیفہ نے ابن جزار اور ابو عثمان الجزار جو کہ اندلسی طبیب تھا کے متعلق مباحث کو گڈمڈ کر دیا ہے، بروکلمان نے متعین تاریخ وفات ۳۴۲ھ مطابق ۱۰۰۴ء لکھی ہے۔

ان تمام بیانات میں ابن عذاری کی رائے قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے، اسکے کئی قرائن موجود ہیں (۱) ابن عذاری نے ابراہیم[2] بن القاسم الرقیق سے روایت کی ہے، جو کہ قیروانی ہونے کے ساتھ ابن جزار کے معاصر بھی ہیں۔ (۲) ابن جزار کی وفات ۳۷۷ھ سے قبل ہوئی، یہی تاریخ ابن جلجل کی کتاب کی تالیف کی بھی ہے، ابن جلجل نے بھی ابن عذاری کی وفات ۳۶۹ھ لکھی ہے، جس سے ابن عذاری کے

---

[1] مقدمہ سیاسۃ الصبیان وتدبیرہم ص ۲۳ [2] ابو اسحاق ابراہیم بن القاسم الرقیق مراد ہیں جو کہ ایک افریقی مورخ تھے، ان کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی بروکلمان ج ۱ ص ۲۵۲

قول کی تائید ہوتی ہے، (۳) ابن جزار قزاز کی کتاب الحروف سے واقف تھا، اور یہ کتاب خلیفہ معزّ العبیدی کی خواہش پر لکھی گئی تھی، جو کہ سنہ ۳۶۱ھ میں مکمل ہوئی تھی، (۴) ڈاکٹر حسن[1] حسنی عبد الوہاب نے ابن جزار کی تاریخ پیدائش کی جو تعیین کی ہے یعنی ۲۸۵ھ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۳۶۹ھ میں ابن جزار کی عمر لگ بھگ ۸۴ سال تھی، اس سے ابن ابی اصیبعہ کے مذکورہ بیان کی بھی قدرے تائید ہو جاتی ہے، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی تعیین کے بعد مقریزی کا یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ منصور عبیدی کی وفات کے وقت ابن جزار نوجوان تھا، درحقیقت اس وقت ابن جزار کی عمر تقریباً ۵۶ سال تھی۔

ابن جزار کی تصنیفات بکثرت ہیں، جن میں بیشتر فن طب سے متعلق ہیں، کچھ ادب، فلسفہ اور تاریخ کے موضوعات پر بھی ہیں، ابن جزار کی کتابوں کی فہرست ابن ابی اصیبعہ نے اپنی مشہور کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں شایع کی ہے، لیکن وہ فہرست نامکمل تھی، ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب نے اپنی کتاب[2] میں ان کی کتابوں کی لمبی فہرست دی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کی بعض اور اہم کتابوں کا پتہ لگا کر استاد محمد حبیب الہیلہ نے پوری فہرست شایع کر دی ہے، ذیل میں پوری فہرست مختصر تعارف کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

(۱) الاعتماد فی الادویۃ المفردہ۔ اس کتاب کا ذکر تقریباً تمام ہی مورخین[3] اور سوانح نگاروں نے کیا ہے، جن میں ابن ابی اصیبعہ، یاقوت الحموی، الصفدی

---

[1] ورقات، از ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب، ص ۳۱۵ [2] ایضاً ص ۳۲۲،

[3] عیون الانباء ج ۲ ص ۳۷، معجم الادباء ج ۲ ص ۱۳۶، الوافی بالوفیات ص ۲۲۳ ج ۱، کشف الظنون ص ۱۲۰، ہدیۃ العارفین ص ۱۱

حاجی خلیفہ اور البغدادی وغیرہ شامل ہیں، یہ کتاب چار مقالات پر مشتمل ہے، مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن جزار نے یہ ایک عبیدی خلیفہ کے لیے لکھی تھی، اس کتاب کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں بھی کیا گیا ہے۔[۵]

(۲) الخواص :[۶] اس کتاب کا ذکر ابن ابی اصیبعہ کے علاوہ حاجی خلیفہ اور البغدادی نے بھی کیا ہے، اور اس کے لاطینی نسخہ کا ذکر بروکلمان میں بھی ملتا ہے۔

(۳) رسالۃ فی ابدال الادویہ :- اس مخطوطہ کا ذکر بھی مذکورہ بالا مورخین کے یہاں ملتا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب شائع نہ ہو سکی، اس کا ایک نسخہ دار الکتب مصر میں بدل العقاقیر کے نام سے موجود ہے، دوسرا نسخہ برلن میں ہے، جس پر کتاب الابدال نام پڑا ہوا ہے، تیسرا نسخہ اسکوریال میں ہے، جس کا ذکر بروکلمان نے اعدال العقاقیر کے نام سے کیا ہے، مصری لائبریری کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی استاد حسن حسنی عبد الوہاب کے ذاتی کتب خانہ میں بھی ہے،

(۴) زاد المسافر وقوت الحاضر :- یہ ابن جزار کی بڑی اہم تالیف ہے، اس کا ذکر صاعد، ابن ابی اصیبعہ، یاقوت، حاجی خلیفہ کے علاوہ الصفدی کے یہاں بھی ملتا ہے، اس کے مختلف نسخے رباط کے خزانہ عامہ، دار الکتب مصر، تہران کے مکتبہ ملک، پیرس کی نیشنل لائبریری میں موجود ہیں، اس کتاب کی ایک تلخیص اسکوریال میں موجود ہے، یہ کتاب ابن جزار کی وفات سے قبل شائع ہوئی تھی، اس پر شاعر کشاجم[۶] نے تقریظ کے طور پر چند اشعار لکھے تھے، جسے محمد حبیب الہیلہ نے نقل کیا ہے۔[۷]

---

۱ مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۲۸ ۲ عیون الانباء ج ۲ ص ۳۱ معجم الادباء ج ۲ ص ۱۳۳ الوافی بالوفیات ص ۲۳۳، کشف الظنون ص ۱۲۰۰ وہدیۃ العارفین ص ۔ ۳ مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۲۳ ۵ ایضاً ۶ کشاجم چوتھی صدی کا ایک قادر الکلام شاعر تھا جس کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی، ۷ سیاستہ الصبیان ص ۳۱ بحوالہ عیون الانباء،

اباجعفر ابقیت حیا ومیتا — مفاخر فی ظلم الزمان عظاما

سرایت علی زاد المسافر عندنا — من الناظرین العارفین زحاما

فایقنت ان لوکان حیا لوقته — یوحنا[1] لما سمی التمام تماما

ساحمل نعلا لاحمد لم تزل — مواقعها عند الکرام کراما

اندلس میں اس کتاب کا تعارف ابن جزار کے ایک شاگرد رشید عمر بن جعفر نے کرایا، جو عبد الرحمن الناصر کے طبیب خاص تھے، اس کتاب کا یونانی، عبرانی اور لاطینی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے عبرانی نسخے آکسفورڈ، اور اٹلی کی دو لائبریریاں پارمہ (Parme) اور ٹورین (Turin) میں موجود ہیں، یونانی ترجمہ کے سات نسخے پیرس میں، دو نسخے انگلینڈ میں، دو فرانس میں ۴ اسکوریال میں اور ایک میونخ میں موجود ہیں، اس کا لاطینی ترجمہ ۱۵۱۰ء میں پہلی بار شائع ہوا، انیسویں صدی کے نصف آخر سے محققین نے اس کی طرف توجہ کی، جرنل آف ایشیا ۱۸۵۳ء ج ۱ ص ۲۸۹ کے آگے ڈاکٹر گسٹیو ڈوگٹ۔ (Dr. Gustau Dugel) نے تلخیص کے طور پر ایک جامع مقدمہ لکھا ہے۔ اور اس کتاب کے مضامین کے ابواب کی فہرست مرتب کی ہے، اس کے بعد مختلف لوگوں نے ضمنی اور تفصیلی طور پر اس کتاب پر ریویو لکھتے ہیں آخر میں ۱۹۶۶ء میں Dr. Aldert Dietrich نے اپنی عربی طبی مخطوطات پر لکھی ہوئی کتاب میں نہ صرف یہ کہ اس کا ذکر کیا بلکہ اس کے ابواب کی فہرست بھی درج کی ہے[2]

---

[1] یوحنا سے مراد یوحنا بن ماسویہ ہے۔ جو خلیفہ عباسی واثق باللہ کے دور میں تھا جس کی وفات ۲۴۳ھ میں ہوئی الکمال والتمام اس کی کتاب ہے جسے شاعر نے نظم کیا ہے، طبقات ابن جلجل ص ۶۴ [2] مقدمہ سیاسۃ الصبیان ص ۱۴

(۵) سیاستہ الصبیان و تدبیرہم :- قدیم مصادر میں اس کتاب کا ذکر نہیں ملتا لیکن ڈاکٹر حسن حسنی عبدالوہاب نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ اسکوریال میں موجود ہے۔ اس مخطوطہ کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر کے ۱۹۶۵ء میں الدار التونسیہ للنشر سو پہلی بار ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ نے شایع کیا ہے، یہ کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے چھ ابواب بچوں کے حفظ صحت، ولادت اور پرورش کے طریقوں پر مشتمل ہیں، اس کے بعد اعضاء کی ترتیب کے ساتھ بچوں کے امراض اور ان کا علاج بیان کیا گیا ہے، آخری باب کا کچھ حصہ مخطوطہ میں محفوظ نہیں رہ سکا تھا، لیکن بقیہ حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باب بچوں کے چڑچڑے پن اور اس کے تدارک کے متعلق لکھا گیا تھا، یہ کتاب نہایت آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے، اس کے مباحث عام طور پر "ان شاء اللہ" پر ختم ہوتے ہیں۔

حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابن جزار نے اس کتاب کی تالیف میں عام طور سے فصول بقراط اور جالینوس کی تین کتابوں، کتاب السیاستہ، کتاب الادویہ المبسوط، کتاب الصنعۃ الطبیہ سے استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ فلسفی ابوراس یحیی بن ماسویہ، طبیب ساموس اسحاق بن ماسویہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔[1]

طب اطفال کے موضوع پر یہ ایک بیش قیمت کتاب ہے اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر لکھی گئی پہلی جامع کتاب ہے اس کی طرف خود ابن جزار نے بھی مقدمہ میں اشارہ کیا ہے،

" ولما اسا لاحد من الاوائل المتقدمین فی ذالک کتابا کاملا

---

[1] مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۵۲۔

شافیا۔[۳۸] یہی وجہ ہے کہ ابن سینا نے اپنی کتاب القانون میں اس کتاب کے اکثر مباحث بالکل لفظاً بلفظاً نقل کیے ہیں[۳۹]

اگرچہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ بات خارج از امکان بھی نہیں کہ اندلس میں طب اطفال کے موضوع پر ریسرچ کے دوران ۱۹۰۵ء میں Monequemaz نے اس مخطوطہ سے استفادہ کیا ہو کیونکہ اس وقت طبِ اطفال کے قدیم نظریہ سو دا تقفیت کے لیے اس سے جامع کوئی کتاب نہیں تھی۔

مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ ابن جزار کی موجودہ تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) طب الفقراء (۲) طب المشائخ (۳) کتاب فی الکلی والمثانی (۴) مداواۃ النسیان (۵) المعتمد فی الادویۃ المفردۃ (۶) کتاب فی المعدہ وامراضہا (۷) کتاب فی الملخولیا۔

ان کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے، لیکن تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے، اور جن کی فہرست حسن حسنی عبدالوہاب کے علاوہ ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ نے بھی شایع کی ہے[۴۰]

(۱) الاحجار:۔ اس کتاب کا تذکرہ القفطی نے کیا ہے، انھوں نے بعض مباحث اپنی کتاب میں اس سے نقل کئے ہیں، (۲) اخبار الدولہ:۔ یہ دولت فاطمیہ کے عروج اور دولت عبیدیہ کے زوال کی تاریخ ہے اس سے بعد کے مورخین نے واقعات نقل کئے ہیں جن میں مقریزی، ابن ابی اصیبعہ یاقوت وغیرہ شامل ہیں۔ غالب گمان ہے کہ اس کا

---

[۳۸] سیاسۃ الصبیان ص ۵ [۳۹] القانون ج ا ص ۲۲۲ تا ۲۲۹ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ [۴۰] کتابوں کی یہ طویل فہرست محمد حبیب الہیلہ کی مرتب کی ہوئی کتاب سیاسۃ الصبیان کے مقدمہ سے ماخوذ ہے۔

کوئی نسخہ اسماعیلیون کے کسی خزانۂ کتب میں ہندوستان میں موجود ہوگا۔

(۳) اسباب الوفاۃ، (۴) اصول الطب، (۵) البغیۃ فی الادویہ المرکبۃ (۶) البلغۃ فی حفظ الصحۃ، (۷) التعریف بتصحیح التاریخ، (۸) رسالۃ الادویہ (۹) رسالۃ فی الاستہانۃ بالموت، (۱۰) رسالۃ فی التحذیر من اخراج الدم، (۱۱) رسالۃ فی الزکام (۱۲) رسالۃ فی المقعدہ واوجاعہا، (۱۳) رسالۃ فی النفس، (۱۴) رسالۃ فی النوم والیقظۃ (۱۵) طبقات القضاۃ، (۱۶) عجائب البلدان، (۱۷) العطر (۱۸) العدۃ لطول المدۃ (۱۹) الفصول فی سائر العلوم والبلاغات، (۲۰) قوت المقیم (۲۱) کتاب السموم (۲۲) مجربات الطب (۲۳) المختبرات (۲۴) مغازی افریقیہ، (۲۵) مقالۃ فی الجذام، (۲۶) مقالۃ فی الحمامات، (۲۷) المکلل فی الادب، (۲۸) نصائح الابرار (۲۹) النصح (۳۰) الاسباب المولدہ للوباء فی مصر وطریق الحیلۃ فی دفع ذالک؛ ان عظیم کارناموں کی بنا پر ابن جزار کی ذات بجا طور پر باعث افتخار ہے۔

سلسلۂ صحابۂ کرام وتابعین عظام وتبع تابعین کبار رحمہم اللہ تعالیٰ

اس سلسلہ میں ۱۵ کتابیں شامل ہیں۔ مہاجرین ۵ عدد، انصار ۲ عدد، سیر الصحابیات، اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات ۳ عدد، تابعین ۱ عدد، اہل کتاب صحابہ وتابعین ۱ عدد، تبع تابعین ۲ عدد، موخر الذکر کی دوسری جلد جو ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین نے لکھی ہے، زیر طبع ہے، اور عنقریب چھپکر منظر عام پر آرہی ہے، شایقین کو پورا سٹ بھی مل سکتا ہے اور الگ الگ اس کے تمام حصے بھی۔

"منیجر"

وفیات

مولانا عبدالعزیز میمن

چند یادیں

از جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

مولانا عبدالعزیز میمن نے نوّے برس کی عمر میں ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

ہ عہد حاضر میں عربی زبان کے مشہور ادیب، محقق، عالم اور انشا پرداز تھے، اور اپنی عربی تصانیف لی بدولت ہند و پاکستان سے زیادہ عرب ممالک کے علمی حلقوں میں معروف اور روشناس تھے،

ولانا میمن صاحب کا وطن مالوف راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے ین پیدا ہوئے آبائی پیشہ زمینداری تھا، بچپن ہی میں وہ حصول علم کے لیے دہلی چلے آئے، ن دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، شہر میں باکمال علما کے درس و تدریس کے حلقے جگہ جگہ قائم تھے، میمن صاحب نے مولانا محمد بشیر سہسوانی سے جو نواب صدیق حسن کے زمانۂ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے، درسیات کی تحصیل کی، ادب کی تعلیم کے لیے وہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے، انھوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں، میمن صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خاں سے

ملنے گئے، اتفاق سے عید کا دن تھا، ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا، عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب لطف پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا، قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا، علامہ محمد طیب کی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے، ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ رام پور پہنچے چلے آتے تھے، میمن صاحب نے رام پور جاکر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اول آئے،

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا، بڑے بڑے علماء، ادباء اور صلحاء وہاں موجود تھے، لیکن مولانا میمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے، کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علماء کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی، فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے، وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گذر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی، اس کی یہ غزل :-

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خواص تھا، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوئی صحیح بخاری ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اسی اثنا میں ان کو مشن کالج پشاور میں عربی و فارسی کے لکچرار کی جگہ مل گئی اور وہ پشاور چلے آئے، اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر کئی مضامین لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندیٰ اور شرح شذور الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ میں زیادہ انہماک کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا،

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدر دانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے، یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا تھا، شعبۂ عربی ... میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبۂ فارسی میں ڈاکٹر محمد اقبال (ڈاکٹر داؤد رہبر کے والد) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یو۔ پی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدرآباد (دکن) تک سے بھی طلبہ لاہور کھنچے چلے آتے تھے، مولانا میمن کالج میں تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگراں تھے، اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابل ذکر ہیں، سید صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا میمن سبعہ معلقہ اس مہارت اور عمدگی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی ترغیب اور تشویق سے خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کا انڈکس کلید الخزانہ کے نام سے شائع کیا، مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعرّی کے حالات اور فلسفۂ شاعری

میں ابو العلاء المعری وما الیہ کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی جو دار المصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو کھنگال کر شائع کرایا۔ اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے میمن صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی، حیرت ہے کہ میمن صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں وہ معارف میں بھی لکھتے رہے۔

۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی اسامی خالی ہوئی تو وہ غالباً علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی سعی و سفارش سے علی گڈھ چلے گئے، میمن صاحب کے تقرر پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے معارف کے شذرات میں اظہار مسرت کیا تھا، میمن صاحب ۱۹۵۰ء میں صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے، ان کی آمد سے قبل عربی شعبہ کا صدر جرمن یا برطانوی مستشرق ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطرخواہ ترقی نہیں کرسکا تھا۔ معیار تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا، میمن صاحب نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدۃ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبۂ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں قائم کیا اور طلبہ میں صحیح علمی ذوق اور ملکۂ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلبہ نے فائدہ اٹھایا،

ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدرآباد سندھ اب اسلام آباد) ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی) ڈاکٹر مختارالدین آرزو (مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے

تھے، ٹریفک کے حادثے میں گذشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کر گئے،

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابلِ ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے، اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابوعبیدالبکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی۔ میمن صاحب نے اس کے معتدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی۔ اور ۱۹۳۶ء میں خود قاہرہ جاکر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جو آہندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابوتمام، بحتری اور متنبی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہوسکیں، یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاد عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوسکیں، افسوس ہے کہ خطیب صاحب کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ عظیم الشان کارنامہ ادھورا رہ گیا، ۱۹۵۱ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے،

اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (المبرد) کی اشاعت ہے۔
دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا۔
اسلامی کلوکیم (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب ممالک کے متعدد فضلاء مدعو تھے، جن میں
نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی، اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات
اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے مجمع العلمی العربی (دمشق) کے سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اور
ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استاد محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں
فلیٹی ہوٹل پہونچا، جہاں عرب مندوبین مقیم تھے، معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس
کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے ہاں چلے گئے ہیں، ان کی تلاش میں ایک اور صاحب
بھی سرگرداں تھے، میانہ قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی اور اچکن اور پاجامے میں ملبوس۔ مراکشی
صاحب نے بتلایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندھلوی
کے فضیلت کدے پر پہونچے جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف
وظرائف بیان کر رہے تھے، اور انھوں نے ساری محفل کو کشت زعفران بنا رکھا تھا۔ ان
کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے، میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے
جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ وہاں سے یونیورسٹی آتے ہوئے
راستے میں پنجاب یونیورسٹی کی چھوٹی سی مسجد پڑی، جس کی پیشانی پر یہ شعر کندہ تھا

چراغ و مسجد و محراب و منبر ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

شیخ بہجت بیطار نے اس شعر کا مطلب دریافت کیا۔ راقم نے اس کا مطلب اردو میں
جناب محمد العربی المراکشی سے بیان کیا اور انھوں نے اس کا مفہوم عربی میں شیخ صاحب کو
سمجھایا۔ بیس اکیس برس گذرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکاء کے دلوں میں ابھی تک

ہ ہے ۱۹۶۲ء میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ و ادارہ تحقیقات اسلامی قائم ہوئی
ین صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھی۔ اس
لیے انھوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس وغیرہ کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید
ئے۔ اب ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا کتب خانہ مطبوعات کے لحاظ سے کسی بڑے سے
ے کتب خانے سے کم نہیں ہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم وائس چانسلر پنجاب
نیورسٹی کی قدر دانی اور معارف پروری کی بدولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج
ں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے، افسوس ہے کہ اس دفعہ ان سے خاطر خواہ
ستفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں
ں رہنمائی کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبید الحق خاں ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آ جاتے تھے،
ربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے وہیں چلے آتے تھے۔ راقم السطور
بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پر لطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری
ہتی تھی اور علمائے سلف، ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خاں کی علمی خدمات اور ہندوستانی
حدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی تھی۔ ان کی گفتگو کا دل پسند موضوع نادر علمی کتابیں تھیں
جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے
تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطینِ آل عثمان تک کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا
جس پر وہ حاضرینِ مجلس کو گھنٹوں اپنی پر لطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں
نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں مدد و اعانت
کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے ارکان قسطنطنیہ

ہی میں مرکھپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مجلس میں وہ کبھی دل لگی اور تفنن و مزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ عالم عرب کے بیشتر فضلاء سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہل تونس کی تہذیب و شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو خیرباد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ وہ جامعۂ زیتونہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی تعریف کیا کرتے تھے۔ جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوبصورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے۔ شیخ طاہر بن عاشور نے قرآن مجید کی تفسیر التحریر والتنویر فی التفسیر کے نام سے لکھی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے۔ وہ مصر جدید کی فرعون پرستی سے سخت متنفر تھے۔ عرب قوم پرستی جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ برخلاف اس کے وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے بے حد مداح تھے جن کی علمی سرپرستی کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔ اسلامی ممالک کی دینی اور اصلاحی تحریکوں پر بھی ان کی نظر اچھی تھی۔

لاہور سے سبکدوش ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گذارنے لگے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک دوبار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے ابو تمام کا دیوان الحماسۃ الصغری اور علی بن حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع کیں۔ مجلہ مجمع اللغۃ العربی (سابق مجلہ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم الادباء (یاقوت) پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام رضی الدین صاغانی کی العباب [illegible] کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی رسالہ میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شا[illegible]

کیا تھا۔ کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومت پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے۔ علمی حلقوں میں ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز و تضحیک مشہور تھی۔ ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دئے تھے جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔ میمن صاحب چند برس سے تنہائی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، تین چار برس ہوئے کہ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور لڑکے ملازمت کے سلسلہ میں کہیں باہر مقیم تھے۔ صرف ایک پوتا ان کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔ آخر عمر میں نہایت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے،

آخر تک حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و ہمدم بنی رہیں۔ انھوں نے نوے برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا۔ علم و فضل: مولانا عبدالعزیز میمن یادداشت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ کتب درسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسہ تقریباً مکمل حفظ تھے۔ مفضلیات، الکامل (المبرد) اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلاء المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن تھے۔ میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن ذہنی جمود نام کو بھی نہ تھا۔ سیر و سیاحت اور مختلف الخیال اصحاب فکر و نظر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعیؒ کے بے حد عقیدت مند اور مداح تھے اور اصول فقہ میں ان کے الرسالہ کی عربیت کی بڑی

تعریف کیا کرتے تھے۔ فقہا میں ابن حزم اور ابن عبدالبر کی جامعیت اور بغدادی کی ادبیت کے بڑے قائل تھے کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی وادبی مآخذ و مصادر عبدالقادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب) کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کرینکو (Krenkow) کے جو ان کے ساتھ علی گڈھ میں کام کر چکے تھے، تبحر علمی، وسعت معلومات اور ژرف نگاہی کے ثناخوان تھے۔

اصلاحی خیالات: مولانا میمن درس نظامی کے نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح اور ابن ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے، جس میں نور نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سنن ابی داود کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصولِ فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الندوہ (دور جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل للمبرد ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے۔ ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادر لغت و شعر امالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک حماسات میں ابو تمام کا دیوان الحماسہ سب سے عمدہ اور بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کہا کرتے تھے کہ الغریب المصنف (ابن سلام) اور اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لیے نہایت ضروری

ہے۔ اول الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہوسکی جب کہ موخرالذکر کتاب استاذ عبد السلام محمد ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوچکی ہے۔

اس علم و فضل کے باوجود تمکنت نام کو نہ تھی، طرز معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی، وہ سودا سلف خود بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ حقہ کے شوقین تھے۔ شاگرد تمباکو اور چلمیں دور دور سے لاکر دیتے تھے۔ طالب علموں کے استفسارات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنک مزاجی اور بخل کے افسانے سناتے ہیں لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ انھوں نے عربی خوان طلبہ کے وظائف کے لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیئے۔ شاید دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی ان کی فیاضی سے محروم نہ رہا۔

انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب مصنف عبدالرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کرکے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔ راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا، اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے مجھے عربی کا ایک شعر لکھ کر دیا تھا اور میں اسی شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

مازال تکتب فی الحدیث مجتہدا ۔۔۔ حتی وجدناک فی الحدیث مکتوبا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاکؐ کی زبان کی خدمت کے صدقے میں ان کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!!

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کی وفات کو کم وبیش ایک مہینہ ہو چکا ہے، مگر اب تک دل ان کی جدائی پر تیار نہیں ہے، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہر وقت نگاہ کے سامنے رہتا ہے، ان کی شفقت ومحبت اور عنایت وکرم فرمائی رہ رہ کر یاد آتی ہے، اور ان کی دل آویز گفتگو کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے، وہ میرے استاد بھی تھے، اور محسن ومربی بھی تقریباً ۴۰ برس یہ روابط اس طرح قائم رہے کہ نہ میری عقیدت میں کوئی فرق آیا نہ ان کی شفقت میں کوئی کمی محسوس ہوئی، ان کے نام سے واقفیت تو ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، رسالۂ جامعہ میں ان کے مضامین بھی پڑھے تھے، اور ان کی کتاب تاریخ فلسفۂ اسلام بھی اسی زمانہ میں نظر سے گزری تھی، یہ اگرچہ طبع زاد نہیں تھی، بلکہ مشہور مشترق دی بوئر کی کتاب کا ترجمہ تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے اردو میں منتقل کیا تھا کہ ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا تھا، بلکہ اصل کا گمان ہوتا ہے،

یہ شاید ان کا پہلا ترجمہ تھا، مگر اہل نظر کو اسی سے ان کی صلاحیت کا اندازہ

ہو گیا، آگے چل کر اس صلاحیت میں اور اضافہ ہوا، اور سارے ملک میں ان کی شہرت ہو گئی، گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری کے ترجمے کی مختلف لوگوں نے کوشش کی، روزنامہ ہمدرد میں بھی "میرے تجربات زندگی کے" عنوان سے مدتوں اس کے ابواب شایع ہوتے رہے مگر جب مکتبہ جامعہ نے "تلاش حق" کے نام سے عابد صاحب کا ترجمہ شایع کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ "میری کہانی" کے نام سے شایع ہوا تو ہر طرف سے شور تحسین بلند ہوا، اس کے بعد انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، اور پورے ملک میں ایک لایق مترجم کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ محض مترجم نہ تھے، بلکہ انھوں نے بہت سی کتابیں خود بھی لکھی ہیں، ان کی تحریر میں زبان کی صحت و شگفتگی، روانی و برجستگی، اور لطافت و حلاوت کے ساتھ زور بیان اور قوت استدلال بھی بہت ہے، وہ معلم بھی رہے ہیں، اس لئے ان کے اندر تفہیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے، وہ اپنی بات کو دل میں اتارنے اور ذہن نشین کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں، زبان پر ایسی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم بنا دیتے ہیں، مگر عامیانہ انداز کو پاس نہیں آنے دیتے، ان کی سلاست رکاکت سے پاک ہوتی ہے، اور لطف بیان کہیں سے کلام کے وزن اور وقار کو گرنے نہیں دیتا بلکہ اس کی دل آویزی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

قنوج کے قریب واحی پور شرفا کی ایک پرانی بستی ہے، عابد صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اور سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اردو اور فارسی کی تعلیم کے بعد وہ انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، اور میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، اس زمانہ میں علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کی مسلمانوں میں بڑی شہرت تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی وہاں ایم۔ اے میں داخلہ لیا لیکن زیادہ دنوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، اور

یورپ جانے کا موقع مل گیا پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، سیاسی اعتبار سے جرمنی تباہ ہوگیا تھا، مگر اس کی یونیورسٹیوں کا علمی اثر اب بھی باقی تھا، برلن میں ڈاکٹر ایڈورڈ اشپرانگر فلسفہ کے نامور استاد تھے، ڈاکٹر صاحب ان سے وابستہ ہوگئے، اور کئی برس تک ان کی خدمت میں رہ کر پی۔ ایچ ڈی کی سند حاصل کی،

ڈاکٹر صاحب عملی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن طبیعت آزادی پسند تھی، ان کی طالب علمی کا زمانہ تحریک خلافت اور کانگریس کے شباب کا زمانہ تھا، بچہ بچہ آزادی کے نشہ میں سرشار تھا، ہندو مسلمان، پارسی سکھ سبھی آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے، جوش و ولولہ اور قربانی و فداکاری کی عجیب فضا تھی، "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی سب پر آشکارا ہو چکی تھی، اور فرقہ وارانہ اتحاد کے روح پرور نظارے ہر طرف نظر آرہے تھے، اس فضا میں ڈاکٹر صاحب جیسا حساس اور آزادی پسند نوجوان کس طرح بے تعلق رہ سکتا تھا، اس وقت جو نقوش ان کے دل پر ثبت ہوگئے وہ ساری زندگی باقی رہے، جب وہ علی گڑھ آئے تو وہاں خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا کالج کے احتیاط پسند عناصر نوجوانوں کو آزادی کی اس جدوجہد میں شرکت سے باز نہ رکھ سکے اور مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایم۔ اے۔ او کالج کے بہت سے طالب علموں، استادوں اور طلباء قدیم نے نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی علی گڑھ ہی میں بنیاد رکھدی۔

علی گڑھ میں عابد صاحب کا قیام زیادہ نہیں رہا لیکن اس کے باوجود وہ وہاں کے ممتاز طلبہ اور اساتذہ سے واقف ہوگئے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین کو پہلی بار انھوں نے علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا، اور ان کی ذہانت، طلاقت لسانی، حاضر جوابی، شرافت نفس،

تی اور انسانیت نوازی سے بے حد متاثر ہوئے، خود ان کا بیان ہے کہ انگریزی ادب میں
اے کرنے کے لئے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت
بج رہا تھا، دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی
لاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارہ میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک
یں، مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل
سے ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ چشم
این بات کی تہہ تک پہونچ جاتے تھے، ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے
ی نقطہ کو واضح کر دیتی تھی، ان کی تقریر پہلے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی اور پھر استدلال
یعہ دماغ کو قائل کرتی تھی، ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی، بحث و مباحثہ میں انکے
ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوت مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا تھا، سرسری نظر
یکھنے والے کو ایسا لگتا کہ وہ ایک خوش باش، لاابالی مزاج رکھتے ہیں، مگر ان کے سینہ میں
پُرخلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل تھا، اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور انتھاہ
وحوصلہ تھا، اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منور کرنے کے باوجود انھوں نے
دل میں نور ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔"

کچھ عرصہ کے بعد ذاکر صاحب بھی برلن پہونچ گئے، اور پروفیسر زومبارٹ کی رہنمائی
معاشیات کی تکمیل کرنے لگے، ذاکر صاحب معاشیات کے علاوہ فلسفہ تعلیم سے بھی
دلچسپی رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں عابد صاحب کے استاذ ڈاکٹر اشپرانگر سے
ں طور سے استفادہ کرتے تھے، نیز جرمنی کے نت نئے تعلیمی تجربوں سے بھی واقفیت
ل کرتے رہتے تھے، یہ علم و تجربہ ان کے لیے جامعہ کے چلانے میں بہت مفید ثابت ہوا،

برلن کے اس قیام میں عابد صاحب کا تعلق ان سے اور بڑھا۔ جس کی وجہ سے انھیں ان کے ساتھ جامعہ میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کی سند حاصل کرنے کے بعد پریس کے کاموں کو سیکھنے اور فن طباعت میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے برلن آگئے، اس طرح خدا نے جامعہ کے اُن خدمت گزاروں کو یکجا کر دیا، جن کی قسمت میں آیندہ تعلیم ملی کے اس سفینہ کی ناخدائی تھی، جو گرداب حوادث میں گھرا تھا، اور باد مخالف کے تیز و تند جھونکے اسے تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے تھے، عابد صاحب اور مجیب صاحب کو پہلے جامعہ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، مگر ذاکر صاحب کی ذات ایسی پرکشش تھی، اور ان کے اندر دلداری و دلنوازی کی ایسی ادائیں تھیں، جن کی بنا پر مشکل ہی سے کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا تھا، پھر یہ لوگ تو وفور علم کے ساتھ ذہن ثاقب اور عقل حق شناس کے ساتھ دل درد مند بھی رکھتے تھے، اور ان کے اندر خدمت ملی کا جذبہ اور قوم کے بخت خفتہ کو بیدار کرنے کا حوصلہ تھا، بھلا یہ ذاکر صاحب سے متاثر کیوں نہ ہوتے انھوں نے بھی جامعہ کے خدمت گزاروں میں شامل ہونے کا عزم کر لیا۔ ذاکر صاحب نے ان کے سامنے جامعہ کی غربت و فلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں پھولوں کی سیج نہیں بلکہ صحرائے پرخار سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس سے ان بلاکشان شوق کے ارادہ میں کوئی ضعف نہیں آیا، اور ہر قسم کے سود وزیاں سے بے نیاز ہو کر ذاکر صاحب کی پرخلوص رفاقت میں ساری زندگی گزار دینے کا ارادہ کر لیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں حکیم اجمل خاں جرمنی آئے، وہ ایک حاذق طبیب اور ممتاز قومی رہنما ہونے کے علاوہ جامعہ کے امیر (چانسلر) بھی تھے، ذاکر صاحب جامعہ کے

تعلق کی بنا پر اُن سے واقف تھے، لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی، اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک کمزور ہو گئی تھی، اور خلافت و کانگریس دونوں حلقوں میں بڑی افسردگی تھی، قوم پھر پیچھے کی طرف مڑنے لگی تھی، اور طلبہ آزاد تعلیم گاہوں کے بجائے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی جانب رخ کر رہے تھے، ان حالات میں جامعہ کا علی گڑھ میں چلنا دشوار تھا، پرجوش کارکن ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے، اساتذہ بھی اس ملی درسگاہ کو چھوڑ کر سرکاری اداروں کی طرف جا رہے تھے، اس فضا میں حکیم صاحب کو یہ نوجوان بہت غنیمت معلوم ہوئے، انھوں نے ان کے اندر جامعہ میں آنے کا شوق اور اس کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا، ذاکر صاحب کی کشش انگیز شخصیت نے پہلے ہی ان لوگوں کو متاثر کر رکھا تھا، حکیم صاحب کی ملاقات اور گفتگو نے اس جذبہ کو اور بڑھا دیا، عابد صاحب نے حکیم صاحب کی اس ملاقات کا اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا ہے،

حکیم صاحب ہندوستان واپس آئے، تو جامعہ کا حال بےحد ابتر نظر آیا۔ طلبہ بےچین، اساتذہ پریشان، کارکن بددل، امنا و ٹرسٹی مستقبل سے مایوس اور رہنمایان قوم دل برداشتہ تھے، بظاہر اس ادارہ کا دم واپسیں بہت قریب محسوس ہوتا تھا، ان حالات میں گاندھی جی کی مدد سے حکیم صاحب جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لائے، اور قرول باغ میں طبیہ کالج کے قریب کرایہ کے مکانوں میں اس اجڑی ہوئی تعلیمی بستی کو پھر سے بسانے کا انتظام کیا، چند مہینوں کے بعد عابد صاحب اور مجیب صاحب ذاکر صاحب کی رفاقت میں دہلی پہنچ گئے، ان لوگوں کے آجانے سے جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی پھر ابھر آئی، یہ تینوں نوعمر تھے، جامعہ کے مقاصد بہت عظیم تھے، مگر حالات بےحد ناسازگار تھے، کسی کو

مشکل سے یقین آتا تھا کہ یہ ناتجربہ کار نوواردان اس ادارہ کو حیات نو بخشیں گے مگر اپنے دیانت
مخلصانہ خدمت اور مسلسل محنت کی بدولت بہت ہی جلد یہ لوگ سب کی توجہ کا مرکز بن گئے
جامعہ کے بچے کھچے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی، اور تعلیم و تربیت
کام بڑے جوش اور ہوشمندی کے ساتھ شروع ہوگیا، ذاکر صاحب اس مختصر گروہ کے
قافلہ سالار اور عابد صاحب اور مجیب صاحب ان کے یمین و یسار تھے۔

ان لوگوں کے دلوں میں جامعہ کا بہت ہی بلند تصور تھا، اور اس کے ذریعہ وہ
ملک و ملت کو ایسے رخ پر لے جانا چاہتے تھے، جو امن و سکون، اعتبار و اعتماد، خلوص و محبت
اور ہمدردی و بہی خواہی کی شاہراہ تک پہونچائے، بقائے باہم کے اصول کو اس ملک
میں رواج عام حاصل ہو، اور رنگ برنگ پھولوں کے گلدستہ سے قوم کی شان دوبالا
ہوسکے، اس کام میں عابد صاحب اور مجیب صاحب سرگرمی کے ساتھ ذاکر صاحب کا
ہاتھ بٹاتے تھے، ان حضرات کی بہت سی تحریریں آج بھی موجود ہیں جن سے ان کے
خیالات اور جد و جہد کا پتہ چلتا ہے، عابد صاحب کی زبان میں کسی قدر لکنت تھی، اس
ان کو بولنے میں دقت ہوتی تھی، لیکن اس لکنت کے باوجود وہ درس بھی دیتے تھے، اور
تقریر بھی کرتے تھے، مگر اس لکنت کی تلافی اللہ نے اس طرح کی تھی کہ انھیں بہت سلجھا
دماغ، فکر عمیق اور قلم سیال عطا کیا تھا، ان کے قلم کی روانی نے جامعہ کی بڑی خدمت
کی "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو کہ
کو تو جامعہ کے مقاصد، طریق کار، اور نصاب و نظام تعلیم کا ایک خاکہ ہے، لیکن اس میں
اندر تعلیم ملی کا جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے، وہ ہمیشہ اس میدان میں کام کرنے والوں کا
رہبری کرتا رہے گا۔

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ جامعہ سے واقفیت ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی اپنے شفیق استاد مولانا عبد الرحمن نگرامی مرحوم کی زبانی سے بارہا اس کا ذکر سنا تھا شیخ الہند کا خطبۂ تاسیس اور سرپی سی، رے کا خطبۂ تقسیم اسناد بھی نظر سے گزر چکا تھا جامعہ کے بعض طلبہ سے ملاقات بھی ہو چکی تھی، اور کچھ ہمارے ندوہ کے فاضل بھی وہاں پہونچ چکے تھے ان سب ذرائع سے جامعہ کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں، اور ذاکر صاحب کے ساتھ عابد صاحب کا نام اس طرح ذہن نشین ہو گیا تھا کہ دونوں توام بھائی معلوم ہوتے تھے، مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں ایک معمولی سی بات پر ندوہ میں بڑی اسٹرئک ہو گئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا، اس موقع پر انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ جانے کا خیال ہوا، ذاکر صاحب اس زمانہ میں شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تھے، ان کو صورت حال لکھی اور درخواست کی کہ اگر ہمیں اپنے زیر سایہ جگہ دے سکیں تو حاضر ہوں، اس درخواست کی قبولیت کا بہت کم یقین تھا، مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب کے دل میں خدا نے کچھ ایسی ہمدردی پیدا کی کہ منظور ہو گئی، اور چند دن میں ہم جامعہ پہونچ گئے، اس سفر میں میرے عزیز دوست رئیس احمد جعفری مرحوم اور عبد المجیب سہالوی ساتھ تھے، بعد میں محمد ابراہیم عمادی، رشید اختر، اور خلیل شرف الدین بھی ندویوں کے اس قافلہ سے آملے اور ماضی کے واقعات کو نظر انداز کر کے مستقبل کی تیاری میں لگ گئے،

اس وقت عابد صاحب اورنگ آباد میں تھے، اور ڈاکٹر عبد الحق کے ساتھ انگریزی اردو ڈکشنری مرتب کر رہے تھے، مجیب صاحب بھی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں وہیں مقیم تھے، شاید روسی ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے، لیکن ہمارے داخلہ کے چند ہی

بعد تحریک آزادی کو پھر فروغ ہوا، اور قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا، جامعہ آزادی پسندوں کا مرکز تھا، آزادی کی اس جدوجہد کا اس پر اثر ناگزیر تھا، چنانچہ کئی استاذہ اور طلبہ تعلیم گاہ سے نکل کر سیاست کے میدان میں پہونچ گئے، اور وہاں سے جیل بھیج دیئے گئے، حکومت کی دار و گیر سے جامعہ کو بچانے کا کام تو ذاکر صاحب اور ان کے مشیر و معاون کسی نہ کسی طرح کر رہے تھے، لیکن اساتذہ کی کمی کا کیا علاج تھا، جامعہ جیسی حکومت کی معتوب اور تہی مایہ درسگاہ میں آکر کون اپنے کو مصائب میں مبتلا کرتا، بالآخر عابد صاحب اور مجیب صاحب کو اورنگ آباد سے بلانا پڑا، ایک روز ہم لوگ ریاضی کے استاد حاجی برکت علی صاحب کے درجہ میں پڑھ رہے تھے، اچانک دو اجنبی ان سے ملنے آگئے، معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ہیں، عابد صاحب کے چہرہ پر خاصی بڑی داڑھی تھی، جو بعد کو برقرار نہیں رہی، مگر ان کے دل میں اس کی جڑیں باقی رہیں، اور زندگی کے آخری دور میں پھر چہرہ پر اسی طرح نمودار ہو گئی، یہ ان کے مذہبی جذبات کا اثر تھا، وہ زندگی کے کسی دور میں مذہب سے غافل نہیں رہے، ایمان ان کے دل و دماغ دونوں میں پیوست تھا، وہ وجدانی طور پر بھی مسلمان تھے، اور علم و استدلال کے ذریعہ بھی انھیں اسلام کی صداقت کا یقین تھا، اور اس کی اشاعت و ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے،

اس زمانہ کی انگریزی حکومت جامعہ کی مخالف تھی، اس کی سند ہندوستان میں کہیں تسلیم نہیں کی جاتی تھی، ان حالات میں طلبہ کی قلت لازمی تھی، ایسی صورت میں فلسفہ کی تعلیم کا کیسے انتظام ہوتا، عابد صاحب اس زمانہ میں کالج کے طلبہ کو اردو پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ رسالۂ جامعہ کی ادارت اور اردو اکیڈمی کی نظامت

بھی ان کے سپرد تھی، جامعہ کے طلبہ میں اردو کا جو ذوق پیدا ہوا وہ بہت کچھ عابد صاحب کا رہین منت ہے، اردو اکیڈمی کے ذریعہ انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اسکے اہتمام میں بڑے معرکے کے مشاعرے ہوئے، اور اعلیٰ درجہ کے مضامین پڑھے گئے، ایسی محفلیں اب کاہے کو دیکھنے کو ملیں گی، ان شاعروں میں جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، سید بریلوی، ساحل دہلوی، منور لکھنوی، برق دہلوی اکابر شعرا شریک ہوتے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے، یہ مشاعرے بڑے باوقار اور پرسکون ہوتے تھے مضمون خوانی کی مجلسیں بھی بڑی شاندار ہوتی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام السیدین مولانا اسلم جیراج پوری، پروفیسر حبیب الرحمن، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، خالدہ ادیب خانم، حسین رؤف بے، ڈاکٹر بہجت وہبی کس کس کو یاد کیجئے جامعہ کے ہال میں کیسے کیسے اصحاب علم رونق افروز ہو چکے ہیں: غیر ملکی مقالہ نگاروں کے ترجمے اکثر ڈاکٹر عابد صاحب کیا کرتے تھے، خالدہ خانم کے مقالات کا مجموعہ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ان ہی کے قلم سے کتابی شکل میں اردو میں منتقل ہوا، اور آج تک اس باب میں تاریخ کا ایک مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے، ان جلسوں کی صدارت بھی بڑے نامور اصحاب نے کی، ڈاکٹر اقبال، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری، مولانا سید سلیمان جیسے صاحبان علم کے خطبات صدارت نے ان مجالس کی رونق دوبالا کر دی۔

کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام مکتبۂ جامعہ کرتا تھا، ان کی ظاہری آرائش و زیبائش کا اہتمام مکتبہ کے منیجر حامد علی خان صاحب کرتے تھے، لیکن کتابوں کا معنوی وزن عابد صاحب کی توجہ کا رہین منت ہوتا تھا،

عابد صاحب بہترین مشیر تھے ان کی سوجھ بوجھ سے جامعہ کو بہت فائدہ پہنچا غور و فکر کی صلاحیت اُن کے اندر ہمیشہ بیدار رہی، بارہا نازک حالات میں اُن کے مشورہ سے پیچیدہ مسائل حسن وخوبی کے ساتھ حل ہو گئے، مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے ۱۹۵۱ء میں میں اُن کی طلب پر جامعہ آیا، اُس وقت وہ کالج کے پرنسپل تھے چند سال براہ راست اُن کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا، اس اثناء میں اور اس کے بعد بھی اُن کو بہت قریب سے دیکھنے اور اُن کے طریقۂ کار کو سمجھنے کا موقع ملا، اس زمانہ کے مشکلات کو آج سمجھنا دشوار ہے تقسیم ملک سے فضا میں جو تلخی پیدا ہو گئی تھی، اس کا اثر ہنوز باقی تھا، طلبہ کی تعداد قلیل اساتذہ کم، مالی وسائل محدود اور عمارتیں برائے نام تھیں، ہندوستان کی یونیورسٹیاں عموماً جامعہ کی سندیں تسلیم نہیں کرتی تھیں، تعلیم کا دائرہ بہت تنگ تھا، چند ہی مضامین کی تعلیم کا انتظام تھا، ان سب پریشانیوں پر مستزاد یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے تھے، ان کا قیام علی گڑھ میں رہتا تھا، اور جامعہ اُن کی باضابطہ رہنمائی سے محروم ہو گئی تھی ان حالات میں جامعہ کو برقرار رکھنا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ اس کو ترقی دی جائے، لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب نے بڑی ہمت کے ساتھ ان مشکلات کا مقابلہ کیا، ذاکر صاحب کے خالی عہدہ کو مجیب صاحب نے سنبھالا، اور اعلیٰ تعلیم کی سربراہی عابد حسین صاحب نے اپنے ذمہ لی، ان دونوں کی تندہی اور شبانہ روز کی جانفشانی نے بند راہیں کھول دیں، اور رفتہ رفتہ جامعہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی، حکومت کی امداد میں اضافہ ہوا، جامعہ کو ایک حد تک یونیورسٹی کا درجہ ملا نئے مضامین داخل نصاب ہوئے آرٹس اور سائنس کے متعدد شعبے کھلے، متعدد عمارتیں بنیں، ملک کی یونیورسٹیوں میں اس کی سندیں تسلیم ہوئیں، اور حکومت نے اس کے مصارف کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی،

ڈاکٹر صاحب جب جامعہ کے سربراہ تھے انھوں نے جامعہ کی خاطر بے حد مشقت برداشت کی، مگر اس سارے جد وجہد میں عابد صاحب ان کے مشیر خاص اور معین کار تھے وہ مسائل و حالات پر غور کرتے، ان کو سلجھانے کے وسائل تلاش کرتے اور راستوں کو ہموار کرتے اس طرح مجوزہ اسکیم کو کامیابی کی منزل تک پہونچاتے، نہیں تو دیواروں سے کام لینے کا بڑا سلیقہ تھا جامعہ کی ترقی کے لیے انھوں نے معلوم نہیں کیا کیا جتن کیے اور کس کس طرح مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی سطح کے اوپر سبھی کو نظر آتا ہے لیکن اس کے نیچے کا حال کم ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ کے علاوہ ملک و ملت کی خدمت سے بھی وہ کبھی غافل نہیں ہوئے اور زبان و قلم کے ذریعہ اصلاح حال کی تدبیر کرتے رہے تقسیم سے پہلے رسالۂ جامعہ اور اپنی تصانیف و تراجم کے ذریعہ انھوں نے باشندگان ملک اور ابنائے ملت کے ذہن کی تعمیر اور خیالات کی اصلاح کے لیے بڑا کام کیا اور جب ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ کشیدگی حد سے بڑھ گئی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت دشوار ہو گئی اس وقت انھوں نے "نئی روشنی" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کے ذریعہ گم کردہ راہ انسانوں کی رہبری کی انھوں نے ان کے سامنے منزل کی نشاندہی کی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ دکھائی انھوں نے جزئیات و فروعات میں الجھنے کے بجائے اصول کی طرف توجہ دلائی، اور شرافت و نیک نفسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی، افسوس ہے کہ یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اپنی مختصر مدت حیات میں بیش بہا خدمت انجام دی معلوم نہیں اس کے مضامین کے ذریعے کتنے مایوس دلوں کو امید کی شعاع نظر آئی، کتنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو استقامت نصیب ہوئی، اور کتنے پریشان حالوں کو سکون حاصل ہوا۔

۱۹۶۹ء میں انھوں نے عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اردو میں "اسلام اور عصر جدید" اور انگریزی میں "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج" نامی دو سہ ماہی رسالے نکالے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان

زمانہ کے تقاضوں کو سمجھیں، اور اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں جن میں آج سارا عالم مبتلا ہے ان کا خیال تھا کہ مسلمان خدا کے عالمگیر پیغام کے حامل ہیں ان کا فرض ہے کہ ایک طرف مغربی تہذیب کا مطالعہ کرکے اس کے امراض کا پتہ چلائیں دوسری طرف اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرکے ان امراض کی روک تھام اور علاج کی تدبیریں بتائیں

اس رسالہ کے موضوعات بحث اُن کے الفاظ میں حسب ذیل تھے۔

۱۔ عصر حاضر کی مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور ان عناصر کی نشاندہی جو اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں، اور مسلمانوں کی جائز ذہنی اور مادی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں خصوصاً سائنس کے دائرۂ فکر کا، اور سائنسی انداز نظر کی تشریح اور سائنس کی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۲۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے ان پہلوؤں پر بحث جو مسلمانوں کے، ہندوستان اور دنیا کے اہم ترین مسائل حاضرہ کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر جنھوں نے انسانیت کے علمی و تہذیبی سرمایہ میں اضافہ

۴۔ ان مسائل پر بحث کہ اسلام اور دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کس طرح اور کس حد تک مل کر روحانی اور اخلاقی اقدار کے مقابلہ میں تشکیک اور انکار کے اس طوفان کا مقابلہ کرسکتے جو دنیا میں اٹھتا ہوا نظر آرہا ہے،

۵۔ اسلامی معاشروں میں تجدد کی تحریکوں کا تنقیدی مطالعہ،

۶۔ اسلامی معاشروں کی علمی تعلیمی اور تہذیبی رفتار ترقی کا جائزہ،

۷۔ اسلام سے متعلق مطبوعات پر تبصرہ،

ڈاکٹر صاحب نے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی" قائم کی تھی اور

اسی سوسائٹی کی طرف سے نکلتے تھے، کتابوں کا ایک سلسلہ بھی پیش نظر تھا، ان میں سے بعض تیار ہو چکی ہیں اور بعض تیار ہو رہی ہیں، ڈاکٹر صاحب جب تک سکت رہی وہ سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، اس کیلئے خط و کتابت کے علاوہ انھوں نے طویل دورے کئے، ان کوششوں سے چند ہی برس میں سوسائٹی نے بڑی ممتاز حیثیت حاصل کر لی، کئی بین الاقوامی سمینار منعقد ہوئے جن میں ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے نامور اہل قلم نے شرکت کی، اگر وہ تندرست رہتے، تو سوسائٹی کی بنیاد مستحکم ہو جاتی، لیکن اُن کی صحت جو کبھی اچھی نہ تھی، مسلسل افکار اور کثرت کار کی وجہ سے گرتی گئی پیرانہ سالی میں مدافعت کی قوت کمزور ہو گئی، تو امراض کا ہجوم ہوا، دو تین سال سے ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی لیکن جہاں تک ہو سکتا اپنے کو سنبھالتے اور شدید علالت کے باوجود کام کرتے رہتے، مگر ادھر تین چار ماہ سے بالکل بستر سے لگ گئے تھے، ۱۰ر نومبر کو انجمن جامعہ کے جلسہ کے سلسلہ میں دہلی گیا تو ان کے یہاں بھی حاضر ہوا اس وقت غنودگی طاری تھی کچھ دیر بستر کے پاس کھڑا انھیں دیکھتا رہا، اُن کی یہ حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا، بیگم صاحب بھی بہت متاثر تھیں، اور صبر و ضبط کے باوجود اُن کے چہرہ پر رنج و ملال کے گہرے آثار نمایاں تھے، کیوں نہ ہوتا، ۴۵-۴۶ برس کی رفاقت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی، جس کے ساتھ محبت و شیفتگی ہمدردی و غمگساری، خلوص و وفا، اور دلداری و دلنوازی کی کتنی یادیں وابستہ تھیں، دہلی سے واپسی کے بعد خط لکھ کر برابر حالات معلوم کرتا رہا، ۱۳ر دسمبر کو اچانک ایک بجے دن کو ریڈیو سے ان کی وفات کا اعلان ہوا ہر چند کہ یہ خبر خلاف توقع نہ تھی مگر پھر بھی دل بیقرار اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اللہ اپنی رحمت سے نوازے، اور بیگم صاحب اور دوسرے اعزہ و احباب کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے، اور اُن کی مثال نیک کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے،

اعلان: جن لوگوں کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے بہتر ہے کہ وہ پندرہ روپئے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں، وی پی کی صورت میں تین روپئے مزید صرف ہوں گے،

از عبدالسلام قدوائی ندوی

Hundred great Muslims

مصنفہ خواجہ جمیل احمد صاحب

اسلام کی تاریخ بہت طویل ہے بے شمار اقوام وملل کی داستانیں اس میں شامل ہیں ان کا اختصار بھی ضخیم مجلدات کا طالب ہے اگر ان تاریخ ساز اشخاص کا خیال کیا جائے جن کے روشن کارنامے اوراق روزگار کی زینت ہیں تو بھی ان کی تعداد کا شمار... آسان نہیں ہے، زندگی کا کون سا میدان ہے جہاں ایسے نامور افراد کا جمگھٹ نظر نہیں آتا ہے جدھر نظر اٹھتی ہے ان کی بیشمار قطاریں مصاف حیات میں سرگرم نظر آتی ہیں، ان میں صاحبان تاج وتخت بھی ہیں اور گدائے گوشہ نشین بھی تلامذین کرام بھی ہیں اور سپہ سالاران عظام بھی علما وحکما بھی ہیں اور صلحاء واتقیاء بھی خطباء بھی ہیں اور مصنفین بھی کسی گروہ کی فہرست بنانے لگیے تو کاغذوں کے انبار لگ جائیں اور پھر بھی فہرست ناتمام رہے ہماری قوت حفظ کی انتہا یہ ہے کہ کچھ ناموروں کے نام اور کام یاد رہ جائیں ۔

ناواقف ہمارے اس بیان کو شاید مبالغہ سمجھیں لیکن واقفکار اس تفصیل کو اختصار قرار دینے میں بھی تامل کریں گے طبقات وتراجم اور سیر وسوانح پر جن اصحاب کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ پوری تاریخ اسلام کا کیا ذکر ہے، کسی ایک شہر کے کسی خاص صنف کے باکمال بھی ضخیم مجلدات میں سما نہیں سکتے۔ لیکن تاریخ اسلام اور ناموران سلف کی اس کثرت و وسعت کے باوجود

لوگوں نے اختصار و انتخاب کی کوشش کی ہے دریا کو کوزہ میں کون بند کر سکتا ہے لیکن پھر بھی یہ فقرہ زبان زد خاص و عام ہے اس سے لوگوں کی اختصار پسندی کا اندازہ ہوتا ہے اسی جذبہ کے تحت مختصر نویسوں نے ہر دور میں تاریخ اسلام اور رجال اسلام کے احوال و سوانح کی تلخیص کی کوشش کی ہے کسی نے اشہر مشاہیر الاسلام کے نام سے کسی نے ناموران اسلام کے عنوان سے کسی نے کسی اور نام سے کتابیں مرتب کی ہیں، عرصہ ہوا پاکستان کے کسی ناشر نے انگریزی میں "فرام ابوبکر ٹو اتاترک" کے نام سے نامور مسلمانوں کی مختصر سوانح عمریوں کے ایک سلسلہ کی اشاعت کا اعلان کیا تھا، [illegible]ء میں میں نے اس سلسلہ کی کچھ کتابیں دیکھی تھیں معلوم نہیں اب یہ کتابیں مل رہی ہیں یا نایاب ہو گئی ہیں، زیر تبصرہ کتاب "ہنڈرڈ گریٹ مسلمس" اسی طرز کی ایک کتاب ہے جسے خواجہ جمیل احمد نے مرتب کیا ہے اس کا آغاز تبرکاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے کیا گیا ہے، اس کے بعد خلفاء راشدین کے سوانحیات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی باب میں حضرت ابوذر غفاریؓ، امام حسینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں،

پھر حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور رابعہ بصریہ کا ذکر ہے، اس کے بعد فقہاء اربعہ اور نامور مذہبی رہنماؤں کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں پھر مفکرین و مصلحین، شعراء و مصنفین، مصورین، و [illegible] کے احوال و سوانح درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کے دسویں باب میں فرماں رواؤں، مدبروں اور ریاست دانوں کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ گیارہویں اور بارہویں باب کا تعلق فاتحین، مورخین، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں سے ہے،

کتاب بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، واقعات کا اختصار اس طرح کیا گیا ہے، کہ اشخاص کی خصوصیت بھی سامنے آجاتی ہیں، اور اس دور کے واقعات سے بھی اجمالی طور پر آگاہی ہو جاتی ہے، مصنف کا مطالعہ بہت وسیع ہے، انھوں نے تاریخ و سیر کی طویل کتابیں پڑھ کر مختصر

کتاب مرتب کی ہے۔ لیکن انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے احتیاط اور جانچ پڑتال کے باوجود کہیں کہیں کچھ غلطیاں ہو گئی ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری نہیں غِفاری ہیں، وہ قبیلہ غِفار سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے اسباب شہادت میں مروان کے متعلق بیان صحیح نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان صلح نامہ کے سلسلہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کے واقعۂ تحکیم کی تصویر کشی صحیح نہیں کی گئی ہے، عام کتب تاریخ میں یہ واقعہ جس طرح بیان کیا گیا ہے، وہ نہ حقیقت کے مطابق ہے نہ صدرِ اول کے ان بزرگوں کے شایانِ شان ہے، اس سلسلہ میں مورخ خضری کی تاریخ الامم الاسلامیہ کے مطالعہ سے غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔

دار المصنفین کے سلسلہ میں مولانا مسعود علی کو بھی مصنف بتایا گیا ہے حالانکہ وہ مصنف نہیں تھے بلکہ دار المصنفین کے منیجر تھے ان کی انتظامی قابلیت نے دار المصنفین کی تاسیس و تعمیر میں بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن تصنیف و تالیف سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا پاکستان جانا بالکل اتفاقی طور پر تھا۔ اس میں ان کے قصد و فیصلہ کا کوئی دخل نہ تھا، شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے حیاتِ سلیمان میں اس کی پوری تفصیل دے دی ہے۔

وفد خلافت جو پہلی بار سلطان عبد العزیز ابن سعود اور شریف علی کے درمیان جنگ کے زمانہ میں رفع نزاع کی غرض سے گیا تھا۔ اس کے ارکان مولانا عبد القادر قصوری، مولانا عبد الماجد بدایونی تھے، دوسرے وفد میں جو موتمر اسلامی میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ اس میں سید صاحب کے ساتھ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی شامل تھے، جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کلکتہ اور مسلم کانفرنس دہلی کے درمیان التباس ہو گیا ہے ان معمولی فرو گذاشتوں سے قطع نظر کتاب مفید اور قابلِ قدر ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی جائے، اور ہر تعلیم یافتہ تک پہونچائی جائے۔ ان نامورانِ اسلام کی سیرتوں اور کارناموں کے مطالعہ سے اسلام کی بڑی موثر اور دل آویز تصویر نگاہوں کے سامنے

اجائے گی ساتھی کی یہ شاندار تاریخ ہر درد مند کو ملت کی موجودہ زبوں حالی پر محزون و اشکبار کردے گی اس کے دل میں اصلاح حال کی تڑپ پیدا ہوگی۔ اور ماضی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ عظیم الشان مستقبل کی تعمیر کا ولولہ پیدا ہوگا۔ خلفاء راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے حالات دین و دنیا کی ہم آہنگی کا خیال دلائیں گے، اور مسلم حکومتوں کو اسلامی خلافت کے قالب میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا ہوگا، مدرسوں اور خانقاہوں میں امام ابوحنیفہ امام مالک امام شافعی امام احمد شیخ جیلانی، نظام الدین اولیا اور مجدد سرہندی کے نقش قدم کو دلیل راہ بنانے کا حوصلہ ہوگا۔ فلسفہ و حکمت کے حلقے بیرونی و خوارزمی طوسی و ابن سینا اور زہراوی و رازی کو یاد کریں گے اور حضرت خالد و ابوعبیدہ طارق و ابن قاسم صلاح الدین ایوبی اور محمد فاتح کے فتح و ظفر کے حیرت انگیز واقعات ہمت و جانبازی کا سبق دیں گے۔ کیا عجب ہے کہ ان عالی ہمت بزرگوں کا تذکرہ "عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا دے" ملت خفتہ بیدار ہو اور اس کے فرزند پھر اس جاں بلب دنیا کو نئی زندگی عطا کریں۔

کتاب خاصی ضخیم ہے۔ کاغذ و طباعت بھی بہت خوب ہے ایسی حالت میں ۱۲ روپیہ میں چھ سو صفحات کی مجلد کتاب بہت ارزاں ہے۔ اسے فیروز اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ جو اصحاب اسے خریدنا چاہیں۔ وہ خواہ ناشر کو لکھیں یا مصنف سے کاشانۂ زبیدہ آئی ڈی ۱۱۳ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ کے پتہ پر طلب کریں۔

ہماری بادشاہی

آغاز اسلام سے موجودہ زمانہ تک کی مکمل تاریخ جس میں شروع سے اب تک کی چھوٹی بڑی سب مسلم حکومتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں آخر میں موجودہ دنیائے اسلام کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔

قیمت۔ آٹھ روپے۔

"منیجر"

مطبوعات جدید

دوائے شافی مترجمہ مولانا ابوالعلا محمد اسماعیل گودھروی مرحوم، تصحیح و تعلیق مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی، بڑی تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۴ مجلد قیمت: دس روپیے، ناشر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان۔

یہ علامہ ابن قیمؒ (متوفی ۷۵۱ھ) کی تصنیف الجواب الکافی لمن سال عن الدواء الشافی کا سلیس اردو ترجمہ ہے، اس میں انسان کی دینی و اخلاقی خرابیوں کے اثرات و نتائج بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ کیسے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اور ان سے بچنے اور تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تصحیح عقائد اور اصلاح اعمال کے کیا طریقے ہیں، یہ کتاب دراصل ایک سوال کے جواب میں تحریر کی گئی تھی، مصنف سے دریافت کیا گیا تھا کہ ایک شخص دنیا و آخرت کو برباد کرنے والی مصیبت میں گرفتار ہے، اور بڑی کوشش کے باوجود بھی اس سے چھٹکارا نہیں پاتا، ایسی صورت میں وہ کون سی تدبیر اختیار کرے؟ اس کے جواب میں انھوں نے پہلے متعدد حدیثوں سے یہ واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلب و روح اور جسم کی تمام بیماریوں کی دوائیں بھی پیدا کی ہیں، صدق دل سے دعا اور توبہ کرنے سے تمام بیماریاں اور پریشانیاں رفع ہو جاتی ہیں، اس سلسلہ میں دعا کی اہمیت اور اس کی مقبولیت و اجابت کے اسباب و آداب کے علاوہ قضا و قدر کے بعض مسائل اور رحمت خداوندی پر بھروسہ کرکے اعمال سے غفلت برتنے کے خطرناک انجام کا ذکر بھی ہے، مصنف کے نزدیک دنیا و آخرت کی تمام مصیبتوں کا سبب گناہ ہے، انھوں نے معاصی کے نقصانات تفصیل سے گنا کر بعض بڑے گناہوں شرک، قتل، اور زنا وغیرہ کی قباحت و شناعت واضح کی ہے اور ان کی شرعی سزاؤں کا بھی

لت کے عین مطابق ثابت کیا ہے آخر میں مرض عشق کے دفع و ازالہ کی تدبیر اور عشق پرستی کے دنیوی
اخروی مفاسد کا ذکر ہے، حافظ ابن قیمؒ کی تصنیفات مضامین و مطالب کے علاوہ منطقیانہ ترتیب،
ستدلال کی دلنشینی اور بیان کی حلاوت کے اعتبار سے بھی بڑی اہم ہوتی ہیں یہ کتاب بھی اس کا نمونہ ہے
نھوں نے جو کچھ لکھا ہے قرآن و حدیث اور آثار سلف کی روشنی میں لکھا ہے، اس موضوع پر متعدد
مفید کتابیں موجود ہیں لیکن یہ کتاب اپنے مخصوص اسلوب، دلکش انداز بیان اور ممتاز طریق استدلال
کے لحاظ سے انوکھی ہے اردو ترجمہ مولانا محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم نے عرصہ ہوا کیا تھا اب یہ پاکستان کے
مشہور اور لائق صاحب علم مولانا عبد القدوس ہاشمی کی نظر ثانی و تصحیح کے بعد چھپا ہے انھوں نے اپنی وسعت نظر سے
حوالوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور مضامین کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔ اس ترجمہ کی اشاعت ایک
مفید علمی و دینی خدمت ہے،

جدید فارسی شاعری: مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی استاذ شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی، متوسط
تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۴ مجلد مع گرد پوش قیمت عنہ، پتہ انڈو پرشین
سوسائٹی ۱۰۴۸، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی۔

زیر نظر کتاب میں ایران کی جدید فارسی شاعری کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، شروع میں پس منظر کے طور
پر قدیم فارسی شاعری کے آغاز و ارتقا کا سرسری ذکر بھی ہے۔ اس سے ایران کی موجودہ فارسی
شاعری کے خصوصیات و رجحانات کے علاوہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی ایک حد تک
اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے ایران کی دو اہم نئی ادبی تحریکوں "شعر نو" اور "شعر موج نو" پر خاص
طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان تحریکوں سے وابستہ اہم اور قابل ذکر شعرا کے مختصر حالات بھی دئے
ہیں۔ اور ان کے ردعمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ آخر میں اس عہد کے بعض فارسی شاعروں کے کلام کا
انتخاب درج ہے۔ یہ کتاب مختصر ہے اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے،

اس کتاب سے اس کی تلافی نہیں ہوسکی تاہم جدید فارسی شاعری کا یہ اجمالی تعارف بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے فائدہ سے خالی نہیں۔ مصنف کی اردو تحریر واملا میں کہیں کہیں فارسی اسلوب کا اثر نمایاں ہوگیا ہے جیسے صدائے احتجاج کو صدای احتجاج اور برطانیہ کو برتانیا (ص۲۹) لکھا ہے، مندرجۂ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ فارسی اسلوب کا نتیجہ ہیں جو اردو میں غلط نہیں لیکن غیر فصیح بلکہ بے محل ہیں "اور اپنے معاصر حالات سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں (ص۳) معاصر ضرورتوں، تقاضوں اور تبدیلیوں سے بے بہرہ رہ گئے (ص۴) یورپ سے لوٹنے والے... لوگ معتقد ہیں کہ عام ایرانی زندگی میں حقیقی نیاپن اور ایک قسم کا بنیادی انقلاب ناگزیر ہے (ص۱۴) محققین کا ایک گروہ معتقد ہے کہ شعری ذوق اور شاعرانہ استعداد گذشتہ ایران سے مربوط ہے (ص۵۵) قدیم شاعری کے مدافعین اور جدید شاعری کے حامیوں کے درمیان شدید مباحث کا سبب بنتی ہے (ص۶) یہی انجمن بعد میں "انجمن ادبی دانشکدہ" کے نام سے منسوب ہوئی (ص۴۲) تہران میں واقع انتہائی خوبصورت اور مخلل ہال ہے (ص۴۳ حاشیہ) یہ معاصر شعرا میں سب سے زیادہ صمیمی اور پرخلوص شاعر ہیں (ص۱۴۵) ذریعہ کی جمع ذرائعوں (ص۱۲) اور لفظ کی الفاظوں (ص۲۱) لکھی ہے، مقاصد برآری کے بجائے مقاصد کی برآمدی (ص۱) لکھا ہے بعض جگہ سنین غلط درج ہیں، جیسے ۱۹۵۸ء (ص۳) کو ۱۹۰۸ء ہونا چاہیے اور ص۳ پر ۱۹۵۶ء بھی غلط ہے۔ کتاب کی قیمت بیس روپیے بہت زیادہ ہے۔

مسعودی ـ مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر سید مقبول احمد تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۶۴ بحیثیت جغرافیہ نگار مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپیے پچیس پیسے: پتہ، آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی نمبر ۶

ابو الحسن علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ) نامور مورخ اور ماہر جغرافیہ داں تھا اس کتاب میں اس کی جغرافیہ نگاری کے تحریری وعلمی ماخذ پر بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید مقبول احمد اب تو سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہیں مگر جب وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم اور ہملٹن گب کے مشورہ سے مسعودی کی مشہور تصنیف "مروج الذہب ومعادن الجوہر" کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے تو ان کو اس

جغرافیہ نگاری اور سیاحی پر بھی لکھنے کا خیال ہوا۔ یہ علمی و تحقیقی کارنامہ اسی خیال کے نتیجہ میں عمل میں آیا اس پر ۱۹۴۹ء میں ان کو آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔لٹ کی ڈگری بھی ملی یہی مقالہ ۱۹۵۳ء میں اسلامک کلچر حیدرآباد کے کئی نمبروں میں چھپا اور اب ڈاکٹر انور معظم نے اس کا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں یونان و عرب کے ان فلسفیوں، مفکروں، ہیئت فلکیات اور جغرافیہ کے ماہروں کا ذکر ہے جن کے افکار و خیالات سے مسعودی متاثر تھا اور جن کی کتابوں سے اس نے جغرافیائی تصورات و معلومات اخذ کیے تھے، دوسرے حصہ میں مسعودی کی سیاحت شخصی روابط اور بعض سیاحوں سے ملاقات کو اس کی جغرافیہ نگاری کا ماخذ بتایا گیا ہے۔ ہر حصہ میں مسعودی کے مخصوص جغرافیائی خیالات و تصورات کا بھی ذکر ہے، اس نے قدیم اور اپنے عہد کے ہندوستانی راجاؤں کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کا خلاصہ تحریر کر دیا ہے۔ آخر میں علی گڈھ یونیورسٹی کے کتب خانہ کے مسعودی کی جانب منسوب ایک مخطوطہ "عجائب الدنیا" کے محتویات کا جائزہ لے کر تحقیق و دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ مسعودی کی تصنیف نہیں ہے، شروع میں اس کے حالات و واقعات زندگی اور کمالات کا مختصر مرقع بھی پیش کیا ہے یہ کتاب حشو و زوائد سے خالی اور مصنف کے فکر و مطالعہ کا اچھا نمونہ ہے۔

براتِ معنی:۔ از جناب رئیس نعمانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت ۲ روپئے (۱) علمستان ۱۹۱/۱ اصطبل چارباغ، لکھنؤ (۲) دانش محل، امین الدولہ پارک امین آباد لکھنؤ۔ ہند۔

جناب رئیس نعمانی کو فارسی زبان و ادب سے عشق ہے۔ وہ اس زبان میں کئی کتابیں مرتب کر چکے ہیں جن میں سے چند چھپ گئی ہیں "براتِ معنی" ان کا نیا مجموعہ کلام ہے، وہ ابھی نوجوان ہیں مگر ان کے کلام میں پختگی اور غزلوں میں مستی و سرشاری کی کیفیت اور تغزل کی شوخی موجود

ہے۔ غزلوں میں حکیمانہ اور اخلاقی مضامین اور اس عہد کے انتشار حالات کا بھی ذکر ہے۔ اس مجموعہ میں مخمسات قطعات اور بعض دوسرے اصناف کلام بھی درج ہیں، حضرت امام حسینؓ کی مدح و منقبت میں ایک نظم خوب ہے، اس زمانہ میں اردو پر جب سخت وقت آیا ہے ایسے ناساعد اور حوصلہ شکن حالات میں فارسی زبان و ادب کی خدمت و ترقی کے بجائے ہمارے یہ نوجوان شاعر اپنی صلاحیتیں اردو کی خدمت میں صرف کریں تو زیادہ مفید ہو، خصوصاً جب سبک ایرانی کے مقلد ر حامی سبک ہندی کو کسی زمانہ میں بھی لائق توجہ نہیں سمجھے ہیں:۔

ذوق نظر۔ از جناب سید نظر برنی صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۴۴ مجلد قیمت عـہ/ پتہ :۔ ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

یہ جناب نظر برنی کی نظموں اور غزلوں، کا مجموعہ ہے، غزلوں میں قدیم انداز سخن اور طرز تغزل کی روایتوں اور خصوصیتوں کے ساتھ روانی و برجستگی پائی جاتی ہے، نظموں میں اس دور کے واقعات و حقائق پر تبصرہ اور قوم و وطن کے مسائل کا ذکر ہے، بعض نعتیں بھی ہیں اور بعض نظموں میں بزرگان دین کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہے اور حدود و مراتب کے نازک فرق کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ ص۱۰ پر مال کو مونث لکھا ہے۔

ایک بار۔ از جناب قاضی فضل محمد صدیقی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۱۴۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۵/ پیسے پتہ: قاضی بک سیلر، بھاسو، ضلع بلند شہر،

اس ناول میں ایک شخص کے عشق و محبت کی فرضی داستان بیان کی گئی ہے اس سے موجودہ تہذیب و معاشرت کے بعض رخ سامنے آتے ہیں قصہ دلچسپ اور پیرایۂ بیان موثر ہے لیکن بعض کرداروں میں جھول کے علاوہ کہیں کہیں زبان میں بڑی خامیاں اور بکثرت جملے غلط ہیں۔

بر ۲ نمبر ال ۵۰ فروری سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

شذرات

صد ہزار شکر ان کے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی جراحتِ دل کی پرسش کرنی ہو تو علی گڑھ مسلم یونی
کا ذکر چھیڑ دیجئے، اس کا مسئلہ راج ہٹ کے برف خانے اور قانونی موشگافیوں کے سرد خانے میں عرص
پڑا ہوا ہے کہیں ہمیشہ کے لئے نہ پڑا رہ جائے،

جنتا پارٹی مسلمانوں کے جذباتی جوش وخروش سے بھی برسرِ اقتدار آئی، ان کو امید تھی کہ
مسلم یونیورسٹی کو وہ سارے دیرینہ حقوق دے دیگی جن سے وہ محروم کر دی گئی ہے، مگر اب تک
ان کی امیدوں کی شاخِ آہو پر صرف دلآویز وعدوں کی بات ہی سجائی جارہی ہی حکومت ان کی
طاقتور تنظیم اور موثر قیادت کے نہ ہونے سے فائدہ اٹھارہی ہے، مگر جب جذبات ابھر کر مشتعل ہوت
تو تنظیم اور قیادت خود بخود پیدا ہو کر طاقتور اور موثر ہو جاتی ہیں، پاکستان کی تحریک جذبات ہی کے س
بڑھی، اور ایک ہولناک منزل پر آکر رُکی، خود پاکستان کے اندر بنگلہ دیش کے لوگ جذبات سے مغلوب
خون کی ہولی کھیلنے پر آمادہ ہوگئے، ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکے تو انکی وزا
کا تخت ان کی پھانسی کا تختہ بن کر رہ گیا، مسز اندرا گاندھی جذبات میں درگا دیوی بنا کر چاندی می
گئیں، تو جذبات کے سنگھاسن سے اتار کر قید خانہ میں بھی بند کی گئیں، ہماری حکومت سمجھ رہی ہے کہ
مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں جذبات سے خالی ہیں، وہ شاید کبھی مشتعل نہ ہوں گے، ممکن ہے کہ ایسا
مگر ایسا سمجھنا کوتاہ اندیشی بھی ہے،

حکومتوں کی ضد سے ملکوں میں کیا کچھ نہیں ہوا کیا ہے، انگلستان میں بادشاہ جان کے زما
میگنا کارٹا ہوا، فرانس میں لوئی شانزدہم کے عہد کا خونی انقلاب ہو، چائے نے ایک معمولی ٹیک

برطانوی امپائر سے امریکہ کی علیحدگی ہو یا گذشتہ دو عظیم عالمگیر لڑائیوں کی خونریزی ہو، ہٹلر اور مسولینی کے عبرتناک انجام کی داستان ہو، یا جرمنی کی غیور قوم کا بٹوارہ ہو، روڈیشیا میں کالے اور گوروں کی جنگ ہو یا عربوں اور یہودیوں کے انتہائی تصادم کی ہلاکت آفرینی ہو، ان سب میں راج ہٹ ہی کی کارفرمائی ہے۔

خود ہندوستان کے اندر بیسویں صدی کے شروع میں تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے کی ضد نہ ہوتی تو اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی، قانون ساز اسمبلیوں میں چند نشستوں کے نہ دینے کی ہٹ نہ ہوتی تو ہندو مسلمان کے اختلافات کی خلیج وسیع نہ ہوتی، کلچر کی تعریف منوانے پر اصرار نہ ہوتا، تو دو قومی نظریہ وجود میں نہ آتا، سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کو رد کرنے پر بے جا دباؤ نہ ڈالا جاتا تو اس برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی،

مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں بھی راج ہٹ کی اعصابی جنگ جاری ہے، اگر اس کی آڑ میں دباؤ ڈال کر یہاں کے مسلمانوں کو چین اور روس کے مسلمانوں کی طرح بنانے کا خیال ہو تو یہ ممکن نہیں ہو سکے گا کیونکہ اس سرزمین کے چپہ چپہ پر ان کے مذہبی، روحانی، تاریخی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور علمی آثار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ان کو یہاں باعزت طریقہ پر رہنے کا حق ہے، وہ یہاں باہر سے ضرور آئے، آریائی نسل کے ہندو بھی باہر سے آئے مگر انھوں نے یہاں چھوت چھات پھیلا کر انسانوں میں جو تفریق پیدا کی، وہ اب تک دیکھی جا سکتی ہے، مسلمان یہاں آئے تو نہ صرف انسانی مساوات کا پیام لائے بلکہ یہاں کی خاک کو اپنی امیدوں کا تجلی کدہ بنا کر تاریوں، منگولوں، نادر خانیوں، احمد ابدالیوں اور انگریزوں جیسے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اس کیلئے اپنا خون بھی بہاتے رہے، اسکی ہر صبح کو جاں نواز اور اسکی ہر شام کو دلنواز دیکھنے میں لذت محسوس کی، اور یہ کہا تھے کہ اس کی سرزمین تمام روے زمین کیلئے زینت ہے، اسی طرح جیسے نازنیں کے رخسار پر تل ہو،

سوادش شدہ زیب روے زمیں چو خالے بہ رخسار ہر نازنیں

پھر اسی محبت میں یہاں کے اصلی باشندوں سے زیادہ وطن دوست بن کر اپنے فن تعمیر کے شاہکاروں نئے نئے شہروں، سڑکوں، پلوں، نہروں، باغبانی، چمن آرائی اور فنون لطیفہ کے اعلیٰ نمونوں اور روزمرہ زندگی کی زینت و آرائش کے

[illegible] اگر فردوس بر روئے زمیں است [illegible]

اس حیثیت اور خطرہ سے کہ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا جنم جا رہا گیا تو کیا وہ اس کو گوارا کریں گے؟

ہماری حکومت مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان کے مسلمانوں کے دلوں کی تسخیر کرنے میں لگی ہوئی ہو مگر اپنے یہاں کے مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی رعایتوں کے دینے میں فراخدلی اور فیاضی نہیں دکھاتی، حالانکہ یہاں کے مسلمانوں کی تعداد افغانستان کیا بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے تمام ملکوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہو اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کے مالک بن جائیں، سیاسی مصلحتوں سے ان کو اس ملک کی اقلیت قرار دیدیا گیا ہے مگر صحیح معنوں میں وہ اس کی دوسری بڑی اکثریت تسلیم کیے جانے کے مستحق ہیں، ان کو مطمئن رکھنا اسلامی ممالک سے بھی اچھے تعلقات پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے،

مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا ایک صنم کدہ ہے جسکی صنم تراشی میں وہ خود اس کے آذر بننا چاہتے ہیں، یہ ان کے احساسات کا ایک گلکدہ بھی ہے جسکے وہ خود باغباں ہونیکے خواہاں ہیں، یہ ان کے خیالات کا ایک میکدہ بھی ہے، جس کے ساقی بنکر اسکے شیشہ و ساغر کی گردش اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا پسند کرتے ہیں، یہ کوئی بڑی رعایت نہیں، شبنم چاٹ کر پیاس بجھانے کی اجازت طلبی ہے جو اگر نہیں دی گئی، تو خود حکمرانی اور جہانبانی کو خیر اندیشی اور سلامت روی سے محروم کرنا ہے،

جمہوری حکومت میں ایک سیاسی جماعت کی اکثریت کو ایک سیاسی جماعت کی اقلیت کو دبا کر رکھنے کا حق حاصل ہو مگر کیا ایک مستقل مذہبی اکثریت کو ایک مستقل مذہبی اقلیت کو دبا کر رکھنے کا وہی حق ہو؟ کیا ایسی مذہبی اکثریت اپنے ہر حکم کو بہ جبر منوانے کا اختیار رکھتی ہو؟ کیا اسکی ہر خواہش حکم اور قانون کی حیثیت رکھتی ہو، اس کا کوئی فیصلہ اقلیت کُش ہو تو کیا اقلیت اس کو بھی ماننے کے لئے مجبور ہو؟ ان سوالات کے پارلیمانی انداز کے جوابات تو ملک کے مزاج کا صحیح ترجمان نہیں بن سکتا ہو جو کہا جائے اس پر اتنی عمل کیا جائے، اس وقت ہماری حکومت کے لئے مسلم یونیورسٹی ایک تجربہ گاہ ہو جہاں مسلمانوں کا شیشۂ دل توڑا یا جوڑا جا سکتا ہے۔

ع :- ٹھکرا بھی دو [illegible]

مقالات

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

از۔ مولانا سید سلیمان ندوی رح

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جا سکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب ایک خاندان تھا، تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کا قالب اختیار کیا، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاوں نے اپنی اس عزت اور شہرت کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے بجائے اس کو اپنے بیجا غرور سے اپنا خاندانی حق یا ما فوق بشر قویٰ سے اپنا متصف ہونا سمجھا، اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ ہندو راجاؤں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی ہر رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا، اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا

نورِ نظر تھا، اور کوئی چاند کا ٹکڑا، اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے آثار تو سب ہی تھے،

عراق کے نمرود جبار بنے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کو رَع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک وہ تھا، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہلواتے تھے، اسی لیے ان کو ایرانیوں نے اپنی زبان میں بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی خدا کے اوتار بادشاہوں سے خالی نہیں، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے، اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے،[1] اس روشنی کے زمانہ میں بھی اور پھر اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے، کہ جاپان کا شہنشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے، جس کی وہاں پوجا ہوتی ہے،

روما کے بانی روملس اور اس کا بھائی دونوں ستارۂ مریخ کی اولاد تھے،[2] ولادت مسیحؑ کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے، اور ان کی پرستش کی جاتی تھی،[3] یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی، جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پاکر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں ملکوں میں قائم ہوتی رہیں، جن کو دیکھکر ارباب تاریخ اور علماء سیاست نے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم مضمون یونان [2] تاریخ روما ص ۳۴ دار الترجمہ حیدرآباد دکن

[3] ایضاً ص ۲۲۹

طریقہ حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری،

۱۔ اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہو یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بنکر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے،

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے، جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی اثر سے خاندانی تسلسل کی بنا پر حکومت کرتا ہو، اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا کے اکثر ملکوں میں بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد ملکر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسا کبھی یونان میں تھا،

۴۔ اور اگر یہ شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کی طرف سے منتخب کئے ہوئے افراد کے ہاتھ میں دیکر خود کو صرف ظاہری بادشاہی کے عام رسوم تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے،

۵۔ زعیمی (آمرانہ) طرز حکومت ہے جس میں کوئی شخص کسی خاندان کا نمائندہ بنکر نہیں بلکہ اپنی ذاتی طاقت سے، یا کسی جماعت کا رکن بنکر اپنی جماعت کے سب سے بڑے نمائندہ کی حیثیت سے ملک پر حکمراں ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی کو لفظوں میں بادشاہ نہیں تھے مگر ان کا حکم شخصی بادشاہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا ہی ہے، کہ یہ خاندان کے نہیں جماعت کے نمائندے تھے،

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد ملکر خود اپنے لیے کسی مدت متعینہ کے لئے

اپنا ایک رئیس منتخب کرلیں جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے، اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے۔ فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی قدر کم اختیار رکھتا ہے، جس قدر انگلستان کا بادشاہ، وہاں اصل ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے، اور امریکہ میں وزیروں کا سلسلہ نہیں، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کا کارکن نمایندہ ہے، اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سکریٹری ہیں، اور اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریۂ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے، جو مزدوروں اور کسانوں کی انجمنوں کی نمایندگی پر مبنی ہے۔

اوپر کی سطروں میں نظریۂ طرز حکومت کی یہ تقسیم کسی خاص سیاسی مفکر کی پیروی میں نہیں کی گئی ہے، بلکہ انسانی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب غور کیا گیا ہے، تو عموماً یہ کیا گیا ہے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھکر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ)

قوت پکڑ رہی ہے، اس کو زعیمی حکومت ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولیں دور میں عملاً جس طرز کی حکومت بنا کر کھڑی کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کی ہیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری، اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات کے مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ مستقل طور سے ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جس میں ان سب کے فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح سے خالی ہے، اس لئے وہ اس کے دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کو اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کو پہچانئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت گو تمامتر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ خدا سے احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ ایک انسان محض ہوتا ہے، البتہ مسلمانوں نے اپنے مشورہ سے، یا سابق امام نے اپنی رائے سے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اُن احکام پر مبنی ہے جو رسول کے

ذریعہ سے اس کو ملے، الٰہی کہا جا سکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے، اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو قساماً دستوری کہہ دینا ممکن ہے، اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے، اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے، اس کو زعیم امت یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر یہ بالکل ظاہر ہے کہ مغربی اہلِ سیاست کے بنائے ہوئے حکومت کے نظریوں میں سے کوئی ایک نظریۂ حکومت بھی اسلامی طرزِ حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی ہے، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک نوعیتِ حکومت کی ظاہری شکل انتخاب کا طریقہ، اربابِ شوریٰ کی ترتیب اور تعیین اور ان کے فرائض وحقوق اور اُن کے انتخاب اور اظہارِ رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل کی ظاہری صورتیں اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز امیر ورئیس اور حکومت کے ارکان وعمال کا تقویٰ یعنی اللہ تعالےٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس ہے، اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزو کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اسی کے حکم

بمنشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بتائے ہوئے اور بنائے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک اسی کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ یہ چاہتی ہیں کہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون اور قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، اسی کا اثر یہ ہے کہ عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھکر دوسرا قانون بناتی ہیں، اور پھر تیسرا اور چوتھا قانون، اور پھر اس قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے اسی طرح مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم ان کو چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصولِ اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا سوال ان کے دل کی ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً روک دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت اور زمانۂ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اسکے لئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم اور ایمان و عمل صالح کی تربیت ہو، اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام کو

...کے ذریعے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے، اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لیے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ علیہ وسلم کے حالات و اخلاق و عادات و غزوات و تعلیمات اور ہدایات کا یہ عظیم الشان کتابی سلسلہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے، مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر بڑے استناد، صحت، اہتمام اور روایتہائے تاریخی کی کامل تنقید کے ساتھ مرتب کیا جا رہا تھا، اس کی ساتویں جلد جو معاملات پر تھی زیر تالیف تھی، اور اس کے کچھ اوراق لکھے جا چکے تھے کہ فاضل مصنف کو پے درپے ایسے حوادث پیش آئے، کہ وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور ناتمام رہ گئی، یہی ناتمام اوراق نظریۂ حکومت کے نام سے کتابی شکل میں عنقریب طبع ہو کر شایع ہونے گئے تھے جو بالکل مکمل ہیں وہ یہ ہیں:

حصہ اول، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات واقعات و غزوات جسمیں شروع میں فن سیرت پر ایک مفصل مقدمہ ہے، قیمت

حصہ دوم، اقامت امن تاسیس خلافت تکمیل شریعت آپ کی وفات اور اخلاق و شمائل و عادات کا مفصل بیان، قیمت ... ۱۲

حصہ سوم۔ مکالمۂ الٰہی نزول ملائکہ، عالم رؤیا، معراج نبوی شرح صدر وغیرہ کا بیان، قیمت ... ۲۰

حصہ چہارم۔ منصب نبوت کی تشریح، تبلیغ نبوی کے اصول اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل حکیمانہ مباحث، قیمت ۲۰

حصہ پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ قیمت ... ۱۵

حصہ ششم۔ اسلامی و اخلاقی تعلیمات فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل، قیمت ... ۲۰

اس پورے سٹ کی قیمت ... ۱۳۳ ہے الگ الگ حصے بھی مل سکتے ہیں۔ "منیجر"

جمالی

لودی اور مغل دور کا شاعر

از۔ ڈاکٹر ظفرالہدیٰ مرحوم مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

ابتدائی حالات زندگی حامد بن فضل اللہ نام ہے، لیکن جمالی کے نام سے مشہور رہیں[1]، کنبوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، بعض تذکروں میں ہے کہ ان کا اصل نام جلال خان اور تخلص جلالی تھا،[2] بعد میں اپنے خال مکرم اور مرشد شیخ سماء الدین کے مشورہ سے بدل کر نام جمال خان اور تخلص جمالی رکھ لیا[3]

---

[1] سیرالعارفین مصنفہ جمالی مخطوطہ (ندوہ) ورق ۱۲ الف، مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ورق ۲ الف (اردو ترجمہ ص ۳۰۲) می گوید معتقد اہل اللہ حامد بن فضل اللہ الراجی فی حضرت المتعال المعروف درویش جمالی۔ ص ۹۹ الف بھی دیکھیے سیرالعارفین مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال می گوید احقرالاصحاب مصنف ایں کتاب معتقد اہل اللہ جمالی فضل اللہ گل رعنا ورق ۱۲۹ الف (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) جمالی نے اپنے ایک شعر میں اپنا نام جمالی بن فضل اللہ لکھا ہے'

نامم از آں جمالی فضل اللہ آمدہ کز فیض آں جمال فزوں شد فضائلم

[3] اخبارالاخیار ص ۲۱۳، مرآۃ العالم ورق ۲۹۶ الف، روز روشن ص ۱۵۲، مرآۃ الآفتاب نما ص ۲۶۰۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ

بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا[۱۱] اوائل عمر ہی میں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا، جسے دلی کے ادبی ماحول نے اور بھی بڑھا دیا تھا، بہت کم مدت میں تمام علوم متداولہ میں دسترس حاصل کر لی[۱۲]۔

دلی دربار میں، سلطان بہلول کے دور حکومت میں جمالی گمنام رہے، اس زمانہ میں انھوں نے اپنا بیشتر وقت اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳) ۳۵ صاحب ریاض العارفین نے ص ۴۸ پر لکھا ہے، "پیر شیخ بہاءالدین دسماءالدین کنبو کہ شیخ صاحب حال دادراخال بود ارادت داشتہ" لیکن نام غلط لکھا ہے، ان کے پیر اور خال معظم سماءالدین تھے، ریاض الشعراء، ورق ۲۲۰ ب، مرآۃ العالم ورق ۲۹۷ الف، مخزن الغرائب ورق ۲۰۷ الف، اخبار الاخیار ص ۲۱۳، سیر العارفین ورق ۲ ب، خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۵۵، مفتاح التواریخ ص ۲۲۰۔ صاحب ریاض الشعراء نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سماءالدین انکے پیر بھی تھے، اور خال معظم بھی، اصلش کنبو است، ارادت بخالوے خود شیخ سماءالدین کنبو داشت، دیکھیے ورق ۲۲۰ ب، مخطوطہ ندوہ، ورق ۱۱۰ ب مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، صاحب مخزن افاغنہ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سماءالدین ان کے سسر بھی تھے، "شیخ سماءالدین کنبو کہ پیر و مرشد وصبیۂ ایشاں درحبالۂ عقد شیخ جمالی بود"، مخطوطۂ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ورق ۷۰ ب، لیکن دوسرے تذکرہ نگار حضرات اس معاملہ میں خاموش ہیں، جمالی نے خود بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، مگر یہ عین ممکن ہے کہ خونی اور روحانی رشتہ کی وجہ سے شیخ سماءالدین نے اپنی لڑکی کی شادی ان کے ساتھ کر دی ہو۔

۱۱ اخبار الاخیار ص ۲۱۴، تذکرہ خوشگو ورق ۱۱ الف۔ ۱۲ ایضاً ص ۲۱۴ ایضاً ورق ۱۲ الف

گزارا[۱] سلطان سکندر لودی کے عہد میں ان کی قسمت کا ستارہ چمکا اور شہرت پھیلنے لگی، سلطان سکندر لودی نہ صرف علم دوست تھا، بلکہ خود بھی بڑا عالم اور بلند پایہ شاعر تھا، درویشوں اور صوفیوں سے ارادت رکھتا تھا، جمالی درویش بھی تھے، اور شاعر بھی، اس لیے بہت جلد انھیں شاہی دربار میں رسائی حاصل ہو گئی، سکندر لودی نے ان کی بڑی عزت افزائی کی[۲]، اور دربار میں بلند مقام عطا کیا[۳]۔ وہ ان سے اپنے اشعار پر اصلاح لیا کرتا تھا[۴]، اس طرح وہ بادشاہ کے استاد بھی ہو گئے، سکندر لودی نے جمالی کو بہت سی مراعات سے نوازا، جمالی نے اپنے سات قصیدوں میں جو ان کے دیوان میں شامل ہیں ——— ان مراعات کا تذکرہ کیا ہے، انھوں نے سلطان کی موت پر بڑا دردناک مرثیہ لکھا، اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں،

خلق حیران و پریشان کہ شہنشاہ چہ شد	ہمہ ہر سینہ زنان دست کہ اللہ چہ شد
ہر دو آتش غم سوخت، شفق خوں بارید	انجم از چرخ فرو ریخت کہ آں ماہ چہ شد

---

[۱] مخطوطہ سیر العارفین (ندوہ) ۳۵۱ ب مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۰ تا ۱۰۱ ب اردو ترجمہ ج ۲ ص ۵۶ - ۵۵، در ایامے کہ شیخ سماء الدین قدس سرہٗ در دار الملک دہلی متوطن بودند این احقر ...... اغلب بحضرت ایشاں مشرف می شد ندوہ کے مخطوطہ میں محض "شد" درج ہے۔ [۲] مخطوطہ ندوہ ورق ۸۴ ب تا ۹۴ الف باین درویش محبت از دیگران بیش داشت ایضاً ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کرزن) مخطوطہ ورق ۹۹ الف، باین درویش از دیگران رغبت بیش ...... اردو ترجمہ ج ۱ ص ۱۱۱ [۳] فرشتہ ج ۱ ص ۸۸، طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۴۰ تاریخ داؤدی ورق ۱۱ الف [۴] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۲۵ - سلطان سکندر اشعار خویش بروی گزرانید، مرآۃ العالم کا ورق ۹۳ بھی دیکھیے۔

ظلمت آباد شد آفاق ز شام غم او — یارب آں طلعتِ خورشید سحرگاہ چہ شد

خوں گرہ شد بگلو زآہ دمم شد مسدود — درغم آں کہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد

دیدہ آن فرخت و آں بہجت آن حال چہ گشت — اوج آن دولت و آن مسند آں گاہ چہ شد

تابہ نہال دے افسوس کناں می رفتم — ہیچ مردے نشد از نفتنش آگاہ چہ شد

نیک خواہاں وے آں لحظہ اجل خواہ شدند — کاں خدا داد و خدا ایں و خدا خواہ چہ شد

با تنعم گفت پندار کہ او در خاکست — قدمش ہمچو پیمبر بسرِ افلاک ست

اسلامی ممالک کا سفر جمالی نے اسلامی ممالک کا طول طویل سفر کیا تھا[1] سفر کے دوران مکہ اور مدینہ کی زیارت کی اور یمن، بیت المقدس، روم، شام، عراق عرب، عراقِ عجم، آذربائیجان، گیلان، مازندران اور خراسان ہوتے ہوئے واپس دہلی آئے[2] اس طویل اور صعوبت انگیز سفر کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی "مہر و ماہ" میں کیا ہے[3]

گہے با دام و درد دمساز گشتہ — گہے با خار و خس ہمراز گشتہ

---

[1] صاحب مرآۃ العالم نے ورق ۳۰۶ الف پر لکھا ہے "بعد فوت سلطان سکندر لودی سفر اختیار کردہ" لیکن یہ بیان درست نہیں ہے، کیونکہ سفر سے واپسی کے وقت سلطان سنبھل میں تھا، اور اس نے انھیں وہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی، دیکھئے تاریخ خان جہانی ص ۲۰۲-۲۰۱ اور تاریخ شبی ص ۴۴-۴۴، [2] سیر العارفین مخطوطہ (ندوہ اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۲ الف تا ۲ ب، اردو ترجمہ جلد اول ص ۲- بحضرت دار الخلافہ ہند یعنی شہر مشہور پر نور دہلی کہ جائے معروف دما و رائے مالوف این درویش است رسید۔ [3] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۲ الف یا ۱۱۰ ب۔

ز دامانِ مرادم دست کوتاہ	۔۔۔۔ ز شب دوری و غم راہ
غم و درد و بلا در پیش کردہ	توکل را رفیق خویش کردہ
غم راہ درازش می تواں گفت	ز ہر ردے کہ رازش می تواں گفت
ندادہ خویش را یک لحظہ آرام	گہے در روم دگاہے جانب شام
گہہ از مصر وگہہ از بیتِ مقدس	بہر وادی رواں تنہا و بے کس
گہے در مکہ گاہے در مدینہ	سرشک آسا رواں از سوز سینہ
ضعیف و ناتواں چوں چشمِ ایشاں	چو زلفِ دلبراں خاطر پریشاں
دلے بے ہند خاطر می نیاسود	ز بعد مکہ ۔۔۔ درعجم بود
چو طوطی در قفس مہجور بودم	ز ہندوستاں اگرچہ دور بودم
سوادِ اعظم آمد ہند معمور	خراساں در بیاضے داشت پُرنور

اس سفر میں وہ ممتاز شخصیتوں، مشہور عالموں اور بلند پایہ صوفیوں سے ملے
۔ سے ان کے تجربہ اور علم میں اضافہ ہوا، حرمین شریفین کی زیارت کے بعد وہ
۔ت گئے، اور شیخ زین الدین خوافی، مولانا رومی، شیخ عبدالعزیز جامی، مولانا
۔ الدین عبدالرحمن جامی، خلاصۃ العلما شیخ الاسلام مولانا مسعود شروانی، مولانا حسین
۔عظ، قاضی معین الدین واعظ اور مولانا عبدالغفور لاری سے ملاقات کی، ہرچند کہ
۔ سب نے جمالی کی پذیرائی کی لیکن انھوں نے مولانا جامی کے ساتھ ہی قیام پسند کیا۔[1]

---

۵ سیر العارفین مخطوطہ ندوہ ورق ۵۰ ب تا ۵۱ الف، مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف
۔ال، ورق ۔۔ الف و ب، این احقرالانام در ایام عزیمت کعبۂ امن فرجام در شہر ہرات
۔یدو با کابر آنجائے مثل حضرت شیخ صوفی کہ از خلفائے حضرت شیخ زین الدین خوافیست و مولانا محمد ۔۔

بعض اندازہ کی بنا پر بیان کیا تھا، جمالی نے وہ پرندہ قریب کے تالاب میں ڈال دیا، اور کہا
تشریح صحیح نہیں، سال، ہندوستان کے ایک درخت کا نام ہے، جس کی لکڑی سے کشتی
بنائی جاتی ہیں،

اس کے بعد مولانا نے جمالی کے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی، جمالی نے یہ کہتے ہوئے
کہ انھیں جمالی کا صرف ایک شعر یاد ہے، یہ شعر سنایا سے

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

جمالی نے اپنی شخصیت چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن زیادہ دیر تک وہ اپنے
آپ کو چھپا نہ رکھ سکے، اور مولانا نے پہچان لیا کہ وہ خود ہی جمالی ہیں،

یہ خوشگو کا بیان ہے، ریاض الشعراء[۱] تذکرۂ حسینی[۲] اور مخزن الغرائب[۳] کے
مصنفوں نے مولانا جامی اور شیخ جمالی کی ملاقات کا حال دلچسپ انداز میں اس طرح
بیان کیا ہے کہ جمالی، مولانا جامی کے تکیہ کے پاس جاکر بے تکلفی سے بیٹھ گیا، مولانا نے
سر سے پاؤں تک انھیں بغور دیکھا، اور ایک مضحکہ خیز سوال کیا، جمالی نے بھی حاضر
جوابی سے کام لیا[۴] اور بڑا دلچسپ جواب دیا، اس کے بعد مولانا نے پوچھا کہ وہ کہاں سے
آرہے ہیں، جمالی نے بتایا کہ "ہندوستان" سے، پھر مولانا کی فرمائش پر یہ شعر سنایا

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

---

[۱] مخطوطہ (ندوہ) ورق ۲۲۰ ب تا ۲۲۱ الف (مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
ورق ۱۱۰ ب [۲] ایضاً ۸۳ [۳] ایضاً ورق ۲، [۴] ریاض الشعراء (ندوہ) مخطوطہ ورق
ب "میان تو و سگ چہ فرق است گفت یک وجب" مخزن الغرائب ورق ۲، "میان تو و سگ
چہ فرق است گفت یک وجب" یہ سنکر مولانا کچھ دیر تک خاموش رہے کیونکہ ان کے اور جمالی کے درمیان
اتنا ہی فاصلہ تھا۔

مولانا نے نام پوچھا تو جواب دیا "جَمَعَ مَالاً" مولانا نے کہا "جمال" جمالی نے مزید کہا "وَعَدَّدَہٗ" (یعنی اس میں دس جوڑ یئے) بحساب جمل "یا" (ی) کی قیمت دس ہے، اس طرح مولانا کو معلوم ہوا کہ جمالی ان سے ہمکلام ہے، اتنا معلوم ہونا تھا کہ مولانا تعظیماً اٹھے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر سینے سے لگا لیا۔

بارہویں صدی ہجری میں یہ دلچسپ کہانی بہت مشہور تھی، تذکرہ نگاروں نے اسے واقعہ سمجھ کر لکھ دیا تھا، آج بھی یہ کہانی برصغیر ہند و پاک میں مشہور ہے، صاحب روز روشن نے بھی [1] اس کہانی کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، یہ ممکن نہیں کہ مولانا جامی جیسا عالم اور صوفی اتنا غیر مہذب ہو کہ ایک مہمان سے ایسا ناشایستہ سوال کرے، علاوہ ازیں اس کہانی کا آخری حصہ محلِ نظر ہے، قدیم مصنف صاحب مرأۃ العالم نے لکھا ہے کہ ایک گمنام شخص فن معمہ میں طاق تھا، اسی نے معمہ میں جمالی کا نام قرآن کی ایک آیت سے نکالا تھا۔ [2]

«گویند شخصے در فن معما مہارت داشت و اکثر اسما از آیات قرآنی و حدیث نبوی بطریق معما بر می آورد، پیش جمالی آں شخص بر سبیل مطائبہ از و پرسید کہ از کدام نام من بر آوردہ او گفت "جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَہٗ" یعنی جیم کہ مع مال باشد "جمال" حاصل می گردد "وَعَدَّدَہٗ" را کہ "یا" باشد یعنی ہرگاہ با وضم نمودی جمالی حاصل می شود۔»

گیارہویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنف سکندر عرف منجھو نے اس معمہ گو شخص کا نام "اختیار خان" لکھا ہے، [3] اختیار خان چمپانیر قلعہ کا کماندار تھا، مغل بادشاہ ہمایوں نے

---

[1] روز روشن صفحہ ۱۵۴ [2] مرآۃ العالم ورق ۲۹۶ یا ۲۹۰ [3] مرآۃ سکندری ص ۲۵۲ پر

مولانا جامی سے ملاقات تذکرہ نگاروں میں اس بات پر اختلاف ہے کہ جمالی کی مولانا جامی سے پہلی[1] ملاقات کس طرح اور کن حالات میں ہوئی۔

خوشگو کا بیان[85] ہے، کہ سلطان حسین مرزا کے دور حکومت میں جمالی خراسان آئے تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک جلوس گاتا بجاتا مولانا جامی کے مکان کی طرف جارہا ہے، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مولانا جامی نے ایک بہت اچھی غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے[86]

چہ خوش است صبحدمے کہ ازاں گل نورسم خبرے رسد

زشمیم زلف معنبرش بمشام جان اثرے رسد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷) کہ از واصلان حق بود و شیخ عبد العزیز جامی کہ در مشیخت و معرفت ممتاز بود وحضرت مولانا نور الدین عبد الرحمن جامی کہ یکے از محققان روزگار و در علم ظاہر و باطن نامدار و در شاعری خسرو وقت بود قدس سرہم و با حضرت خلاصۃ العلماء شیخ الاسلام کہ از دست شاہ اسماعیل شہید شہادت بکام کشید و از شدت ظلم آں بے باک ذرہ از عقیدۂ پاک نگرویدہ وحضرت مولانا مسعود شیروانی کہ در پیشۂ ہر علم شیرے بود وحضرت مولانا حسین واعظ کہ یکے از مشاہیر روزگار وحضرت قاضی معین واعظ کہ برگزیدۂ درگاہ پروردگار بود وحضرت مولانا عبد الغفور کہ یکے از مقبولان باری بود دیرہم صحبت داشت

صاحبان اخبار الاخیار ص ۲۱۴، ید بیضا ورق ۴۱ ب اور شمع انجمن ص ۱۰۲ نے لکھا ہے، جمالی خراسان میں سلطان حسین مرزا کے دور حکومت میں جامی اور دوانی سے ملے، صاحب خزینۃ الاصفیا ص ۴۸ ج ۲ نے مولانا رومی کے نام کا اضافہ کیا ہے، دوانی متوفی ۹۰۲ھ سے جمالی کی ملاقات مشکوک ہے، دوانی کی شخصیت اتنی بلند ہے کہ اگر جمالی ان سے ملے ہوتے تو ضرور ذکر کرتے، مولانا رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳) کا نام کتابت کی غلطی کی وجہ سے آگیا ہے، اصل میں روحی ہے، سیر العارفین مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)

یہ جلوس اس غزل کا جشن منا رہا ہے۔ جمالی، مولانا کی شاعرانہ عظمت کے مداح تھے لیکن یہ غزل سن کر مایوسی ہوئی، اور کہنے لگے کہ "معلوم ہوتا ہے مولانا نے شیخ سعدی کی گلستاں نہیں پڑھی ہے" میں اتنی دور سے ان کی تعریف سُن کر بیکار ان سے ملنے آگیا پھر انھوں نے "گلستان" کی "تمہید" سے یہ شعر پڑھا ؎

بلغ العلیٰ بکمالہ. کشف الدجیٰ بجمالہ حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ وآلہ

جمالی کی ان باتوں کی خبر مولانا جامی تک پہونچ گئی، چنانچہ جمالی جب ان سے ملنے گئے، تو انھوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، وہ انکے کمرے میں داخل ہوئے انھیں سلام کیا اور بے جھجک ان کے پاس جاکر قالین پر بیٹھ گئے، اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ پاؤں میں کیچڑ لگی ہوئی ہے، مولانا نے وطن دریافت کیا تو بے جھجک جواب دیا "ہندوستان" اس بے جھجک جواب سے مولانا بہت خوش ہوئے اور کاغذ کا ایک پرزہ بڑھاتے ہوئے بولے کہ "میں نے امیر خسرو کے اس شعر کی شرح لکھی ہے، جس میں اس نے چاند کی تعریف کی ہے، ؎

ماہ تو ے کامل بدلے از سال خاست یک مہ نوگشتہ بدہ سال راست

مولانا اس شعر کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے، انھوں نے لفظ "سال" کا مفہوم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸) ورق ۱۰۰ ب۔ اگرچہ تمام این بزرگوار اں باین حقیر محبت عظیم و مودت مستقیم داشتند خاصا تکیہ گاہ من درویش خانہ حضرت مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی قدس سرہ بود"

سلہ تاریخ خوشگو (شیرانی) ورق ۱۷ ب دیکھئے اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۳۳ء) صفحہ ۴۰-۴۱ سکندر لودی وغیرہ مصنفہ لیسین خاں نیازی سلہ کلیات جامی ص ۲۳ (نول کشور پریس مطبوعہ ۱۹۱۲ء) چہ خوش است کی جگہ چہ خجستہ لکھا ہے۔

محض اندازہ کی بنا پر بیان کیا تھا، جمالی نے دو پرندہ قریب کے تالاب میں ڈال دیا، اور کہا آپ کی تشریح صحیح نہیں، ساک، ہندوستان کے ایک درخت کا نام ہے، جس کی لکڑی سے کشتیاں بنائی جاتی ہیں،

اس کے بعد مولانا نے جمالی کے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی، جمالی نے یہ کہتے ہوئے کہ انھیں جمالی کا صرف ایک شعر یاد ہے، یہ شعر سنایا ؎

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن — آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

جمالی نے اپنی شخصیت چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن زیادہ دیر تک وہ اپنے آپ کو چھپا نہ رکھ سکے، اور مولانا نے پہچان لیا کہ وہ خود ہی جمالی ہیں،

یہ خوشگو کا بیان ہے، ریاض الشعراء[1] تذکرۂ حسینی[2]، اور مخزن الغرائب[3] کے مصنفوں نے مولانا جامی اور شیخ جمالی کی ملاقات کا حال دلچسپ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جمالی، مولانا جامی کے تکیہ کے پاس جا کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا، مولانا نے سر سے پاؤں تک انھیں بغور دیکھا، اور ایک مضحکہ خیز سوال کیا، جمالی نے بھی حاضر جوابی سے کام لیا[4] اور بڑا دلچسپ جواب دیا اس کے بعد مولانا نے پوچھا کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں، جمالی نے بتایا کہ "ہندوستان سے" پھر مولانا کی فرمائش پر یہ شعر سنایا:

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن — آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

---

[1] مخطوطہ (ندوہ) ورق ۲۲۰ ب تا ۲۲۱ الف (مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۱۱ ب [2] ایضاً ۴۳ [3] ایضاً ورق ۷، [4] ریاض الشعراء (ندوہ) مخطوطہ ورق ۲ ب "میان تو و سگ چہ فرق است گفت یک وجب" مخزن الغرائب ورق ۲، "میان تو و سگ چہ فرق است گفت یک وجب" یہ سنکر مولانا کچھ دیر تک خاموش رہے کیونکہ ان کے اور جمالی کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا۔

مولانا نے نام پوچھا تو جواب دیا "جَمَعَ مَالاً" مولانا نے کہا "جمال" جمالی نے مزید کہا "وَعَدَّدَہٗ" (یعنی اس میں دس جوڑیئے) بحساب جمل "یا" (ی) کی قیمت دس ہے، اس طرح مولانا کو معلوم ہوا کہ جمالی ان سے ہمکلام ہے، اتنا معلوم ہونا تھا کہ مولانا تعظیماً اٹھے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر سینے سے لگا لیا۔

بارہویں صدی ہجری میں یہ دلچسپ کہانی بہت مشہور تھی، تذکرہ نگاروں نے اسے واقعہ سمجھ کر لکھ دیا تھا، آج بھی یہ کہانی برصغیر ہند و پاک میں مشہور ہے، صاحب "روز روشن" نے بھی[1] اس کہانی کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، یہ ممکن نہیں کہ مولانا جامی جیسا عالم اور صوفی اتنا غیر مہذب ہو کہ ایک مہمان سے ایسا ناشایستہ سوال کرے، علاوہ ازیں اس کہانی کا آخری حصہ محلِ نظر ہے، قدیم مصنف صاحب مرآۃ العالم نے لکھا ہے کہ ایک گمنام شخص فن معمہ میں طاق تھا، اسی نے معمہ میں جمالی کا نام قرآن کی ایک آیت سے نکالا تھا[2]

"گویند شخصے در فن معما مہارت داشت و اکثر اسما از آیات قرآنی و حدیث نبوی بطریق معما بر می آورد، وہ پیش جمالی آں شخص بر سبیل مطائبہ از و پرسید کہ از کدام نام من بر آوردۂ او گفت "جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَہٗ" یعنی جیم کہ مع مال باشد "جمال" حاصل می گردد "وَعَدَّدَہٗ" را کہ "یا" باشد یعنی ہرگاہ با وضم نمودی جمالی حاصل می شود۔"

گیارہویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنف سکندر عرف منجھو نے اس معمہ گو شخص کا نام "اختیار خان" لکھا ہے،[3] اختیار خان چمپانیر قلعہ کا کماندار تھا، مغل بادشاہ ہمایوں نے

---

[1] روز روشن صفحہ ۱۵۲ ۔ [2] مرآۃ العالم ورق ۳۰۶ ب، ۳۰۶ [3] مرآۃ سکندری صفحہ ۲۵۲ پر

جب قلعہ فتح کیا تو وہ بھی قیدی بنا کر لایا گیا، شیخ جمالی بھی اس معرکہ میں ہمایوں کے ساتھ تھے انھوں نے اختیار خاں سے اپنا نام قرآن کی آیت سے نکالنے کی فرمایش کی تو اختیار خاں نے برجستہ کہا "جَمَعَ مَالاً" اس پر جمالی نے کہا کہ انکا نام جمال نہیں جمالی ہے، تب اختیار خاں نے کہا "وَعَدَّدَہٗ" جمالی اس کی اس مہارت سے بہت خوش ہوا، اور اسکی تعریف کی۔[۱]

یہ واقعہ ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء کا ہے، کیونکہ اسی سال ہمایوں نے چپانیر کا قلعہ فتح کیا تھا، اور اسی سال جمالی کا انتقال ہو جاتا ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں سفر ہرات میں جمالی نے مولانا جامی کو اس معمہ میں جواب دیا ہو، جب کہ وہ سکندر لودی کے عہد ہی میں اپنے طویل سفر سے ہندوستان واپس آ گئے تھے۔

جمالی کا بیان، مندرجۂ بالا کہانی کے سلسلہ میں جمالی خود بھی خاموش ہیں، وہ محض اتنا لکھتے ہیں۔[۲] کہ وہ مولانا جامی سے ملے اور ان کے ساتھ قیام کیا، ان کے درمیان "لمعات" کی قدر و قیمت اور شیخ محی الدین ابن عربی کے پیر قونیہ کے شیخ صدر الدین اور شیخ فخر الدین کے مراتب کے بارے میں باتیں ہوئیں۔

پروفیسر عبد الغنی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ مغل کورٹ"[۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) لکھا ہے، کہ اختیار خاں منجم شاعر اور ظریف انسان تھا، معمہ گوئی کا ماہر تھا، مختلف علم و فن پر اسے دسترس حاصل تھی، اس کی ظریفانہ صلاحیت نے ہمایوں کا بھی دل جیت لیا تھا

[۱] مراۃ سکندری صفحہ ۲۵۰ روزے شیخ جمال ..... شاعر کہ در آں یورش ملازم رکاب سعادت ایاب بود بہ اختیار خان گفت ما شنیدیم کہ شما در فن معما مہارت تمام دارید اسم مرا از کلام اللہ استخراج نمایند خان بدیہ گفت "جَمَعَ مَالاً" شیخ گفت اسم من جمالی است و خان فی الحال خواند "وَعَدَّدَہٗ"

[۲] سیر العارفین مخطوطہ (ندوہ) ورق ۵۰ ب تا ۵۱ الف مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ورق ۱۰۰ ب تا ۱۰۱، اردو ترجمہ ج اول ص ۱۱۳ تا ۱۱۴ [۳] جلد اول ص ۱۱۶

(History of Persian Language And Lit
erature at Mughal court) میں جمالی کو مولانا جامی کا شاگرد
بتایا ہے، لیکن اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی، جمالی نے بھی اپنی کسی تصنیف میں اسکا
تذکرہ نہیں کیا ہے۔

سیر العارفین[1] میں مولانا جامی کا ذکر جمالی نے کیا ہے، لیکن کسی بیان سے
یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ مولانا جامی کے شاگرد تھے، حقیقت بس اتنی ہے کہ جمالی اور
مولانا جامی کے درمیان دوستانہ مراسم تھے، اور دونوں میں علمی بحث و مباحثے ہوا
کرتے تھے، مباحثے کے دوران جمالی کے دلائل مولانا جامی کو متاثر بھی کرتے تھے۔

سفر سے واپسی | اسلامی ممالک کے سفر کے بعد جمالی اپنے پیر و مرشد شیخ سماء الدین

---

[1] سیر العارفین مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۰ الف او
حضرت مولانا نور الدین جامی کہ یکے از محققان روزگار و در علم ظاہر و باطن نامدار و در
شاعری خسرو وقت بود۔ ایضاً مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۱ ب
"حضرت مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی قدس سرہ" اور "حضرت مولانا نور الدین عبد الرحمٰن
جامی علیہ الرحمۃ" ایضاً ورق ۲۲ ب تا ۲۰ الف "دراں ایام کہ ایں اضعف انام در
دار السلام ہری بود بصحبت خدمت مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی قدس سرہ العزیز
(ورق ۱۲۰ الف) و مولانا عبد الغفور لاری بزیارت حضرت سید مذکور (سید صدر الدین بن
احمد نجم الدین ہروی المعروف بہ سید حسینی) مشرف گشتہ نماز ظہر و عصر ہانجا گذاردیم و بسے فیض وراحت
حاصل نمودیم"۔ مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۴ ب بھی دیکھیے، ؎

بداں خوان کرم حرفے کہ بگذاشت	ازآں جامی نصیب خویش برداشت
چو برخوانش رسیدم من ازاں پس	نشد میل دلم برخوردہ کس

کے پاس دہلی لوٹ آئے۔[1] اس وقت سکندر لودی،[2] سنبھل میں تھا، اس نے جمالی کی آمد پر ایک استقبالیہ نظم لکھی، اور اسے جمالی کے پاس دہلی بھیجا۔

سفر سے واپس آکر جمالی عزلت گزیں ہو گئے،[3] اور سکندر لودی کی موت[4] (یکشنبہ، ذیقعدہ ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) کے بعد تو اس نے بالکل ہی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔[5] سکندر لودی کی موت کے چند سال بعد ہی لودی سلطنت پر زوال آگیا اور مغل سلطنت اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوئی، اہل علم چار طرف سے کھنچ کر مغل دربار میں آنے لگے، جمالی کی اعلیٰ شخصیت اور شاعرانہ عظمت نے انھیں بھی مغل دربار میں پہونچا دیا۔[6] پہلے دو مغل بادشاہ بابر اور ہمایوں نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔[7] جمالی نے دونوں کی مدح میں کچھ قصیدے لکھے ہیں۔

پیر و مرشد سے محبت | جمالی صوفیوں کے چشتی سلسلے سے منسلک تھے، ان کے نامور پیر شیخ سماء الدین، شیخ کبیر کے شاگرد اور سید جلال الدین بخاری کے پوتے تھے، شیخ سماء الدین

---

[1] سیر العارفین مخطوطہ (ندوہ) ورق ۲ الف۔ ۲ ب مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۲ ب اردو ترجمہ جلد اول ص ۳ [2] تاریخ خان جہانی ص ۱۰۲ تا ۱۰۴، تاریخ شاہی ص ۴۸۔ ۴۷ [3] تاریخ خوشگو (شیرانی) ورق ۱۲ ب "در زمان سلطان سکندر لودی ہندوستان معاودت نمو دلبقیہ عمر کنج عزلت گزید" [4] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۴۴ [5] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۴ ہفت اقلیم مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۸ ب [6] روز روشن ص ۱۵۲ "بعد وفات سلطان میل بہ بے تعلقی و آزادی نمودہ" [7] مرآۃ العالم ورق ۲۰۶ ب "بخدمت آنحضرت رو مشمول عواطف بادشاہی گردید" [8] تاریخ خوشگو ورق ۱۲ ب "پیش از بادشاہ اعتماد تمام داشت۔۔۔ ہمایوں بادشاہ نیز بصحبت وے بسیار راغب بود، ہمواره بخدمتش می رسید" تاریخ علمائے ہند

ملتان سے ہجرت کی اور رنتھنبور اور بیانہ ہوتے ہوئے دہلی میں آکر قیام کیا، یہ واقعہ سلطان بہلول (متوفی ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء) کی موت سے پہلے کا ہے۔[۱] دہلی ہی میں شیخ سماء الدین نے پیرانہ سالی میں ۱۷ جمادی الاول ۹۰۱ھ میں وفات پائی۔[۲] ان کی موت پر جمالی نے درج ذیل قطعۂ تاریخ لکھا۔[۳]

مرشد انس و ملک شاہ سماء الدین چو رفت — اے جمالی بر سریر عرش آمد کام او

سال تاریخش بگو "ہشت آمدہ بر نام او" — ہشت خلد آمد بنام او اگر پرسد کسے

۹۰۱

جمالی کو اپنے شیخ سے بڑی عقیدت تھی، اسی وجہ سے سیر العارفین میں انھوں نے شیخ کا بڑا طویل تذکرہ لکھا ہے، جمالی کا بیان ہے کہ وہ اپنے شیخ سے[۴] قلعہ رنتھمبور کے قریب بلاتیہ گاؤں میں ملے اور بیعت کی، وہاں انھیں شیخ کی خدمت کا موقع ملا، وہ شیخ کے کمرہ میں ان کے وضو کے لیے پانی لیجاتے، کنگھی اور تولیہ پیش کرتے۔ ایک دوسری جگہ لکھا ہے[۵] کہ آدھی رات سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴) ہر یکے از شاہان صدر الذکر (سلطان لودی، بابر بادشاہ، ہمایوں شاہ) احترامش می کردند" اخبار الاخیار ص ۲۱۲ "در پیش بابر بادشاہ نیز معتبر بود و بنام او قصیدہ گفتہ" ید بیضا ورق ۴۱ ب "ابتدائے او از سلطان بہلول بود و پیش بابر بادشاہ و ہمایوں بادشاہ ... عالی داشتہ" خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۲۸ "بحضور بابر بادشاہ عزت تمام داشت و بنام او قصیدہ نوشتہ و بنام ہمایوں بادشاہ غازی نیز قصیدہ ہا تحریر کردہ" ہفت اقلیم ورق ۳۹ ب "و جنت آشیانی ہمایون بادشاہ را بصحبت شیخ (جمالی) میلے موفور بودہ ہموارہ با او مجالست می نمود۔"

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۰۹ "وفات او ہفدہم جمادی الاول سنۃ احدی و تسعمائۃ"

[۲] سیر العارفین (ندوہ) مخطوطہ ورق ۴۲ ب "وفات حضرت ایشان در ہفدہم جمادی الاول بود تاریخ وفات این است ...."

[۳] سیر العارفین مخطوطہ (ندوہ) ورق ۸۵ الف اور مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۱ ب تا ۱۰۲ الف در ایام کہ حضرت زبدۃ الاولیا شیخ سماء الدین قدس سرہ در قصبہ بلاتیہ نزدیک قلعہ رنتھمبور ساکن بودند این درویش بعد از تشریف بیعت در مید السکو

جمیع محمد شیخ کی خدمت میں حاضر رہتا، استنجا کے لیے ٹوکری میں سر پر رکھ کر کلوخ لایا کیا۔ غرض ایک عرصۂ دراز تک شیخ کی خدمت میں رہے،[۱] شیخ کو بھی ان پر فخر تھا، اور بڑی محبت کرتے تھے۔ سیر العارفین میں جمالی لکھتے ہیں۔[۲]

مکہ و مدینہ کی زیارت کے بعد میں اسلامی ممالک کے سفر پر تھا تو شیخ (سماء الدین) تہجد کی نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے، بسم اللہ الرحمٰن اللھم ارجع الجمالی الینا سالما غانما وارزقنا مشاھدۃ جمالہ بنور لقائہ برحمتک یا ارحم الراحمین (اے خدا جمالی کو تو انا و تندرست سفر سے واپس لا اور اس کا پیارا چہرہ دکھا) اسی سفر سے واپسی کے بعد انھوں نے مجھے سینے سے لگایا، اور بوسہ دیا اور تہجد کی دعا قبول کرنے پر خدا کا شکر بجا لائے۔[۳]

جمالی کے دیوان میں شیخ کی شان میں بارہ[۱۲] قصیدے اور ایک مرثیہ ملتا ہے، قصیدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے شیخ سے گہری محبت تھی، اور ان پر ناقابل شکست اعتماد تھا، مرثیہ کا ہر شعر جذبات میں ڈوبا ہوا ہے، جو ان کے مغموم دل کی ترجمانی کرتا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۱۰۵) خدمت ایشاں می کرد چنانچہ در حجرہ خاص ایشاں طشتی و مشربہ آبی برائے وضوء ایشاں می بردو شانہ ورسال می نہاد [۱] ایضاً (ندوہ) ورق ۱۵۱ الف ایضاً (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۶۷ ب، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۰ [۲] ایضاً (ندوہ) ورق ۱۵۱ ب ایضاً (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۶۷ ب اردو ترجمہ جلد دوم ۳۲ "سالہا این حقیر در خدمت آں می بود" [۲] ایضاً (ندوہ) ورق ۱۵۹ ب ایضاً (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۸۲ ب، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۷۰ [۳] ایضاً (ندوہ) ورق ۹۵ تا ۱۰۲ الف ایضاً (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۸۲ ب تا ۱۰۳ الف

مرثیہ کے آخری دو شعر درج ذیل ہیں، ؎

یارب چہ حالتست کہ امروز در جہاں — صبر و قرار از دلِ ابرار غائب ست

یعنی سوار دولت و دین زیر خاک شد — زیں غم ہزار جامۂ اسلام چاک شد

جمالی کی موت | جمالی، ہمایوں کے ساتھ ایک جنگی مہم پر ۹۴۲ھ/۱۵۳۵-۳۶ء میں گجرات گئے،[۱] اور وہیں ۱۰ ذیقعدہ کو وفات پا گئے، لاش دہلی لائی گئی،[۲] اور اپنے گھر میں جسے انھوں نے خود تعمیر کرایا تھا دفن کئے گئے۔[۳] ان کے مقبرہ کے قریب ہی مشہور چشتی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی متوفی ۶۳۴ھ/۱۲۳۶-۳۷ء کا مزار ہے، جمالی کا مقبرہ آج بھی مرجع خلائق ہے مقبرے کا

۱؎ اخبار الاخیار صفحہ ۲۰۱، مرآۃ العالم ورق ۴۹۶ ب، ۳ بیضاً ورق ۴۱ ب، خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۸۰، گل رعنا ورق ۱۲۹ الف، مرآۃ سکندری ورق ۲۵۲، مرآۃ آفتاب نما ص ۲۰۰، تاریخ علمائے ہند ص ۴۳، روز روشن ص ۱۵۰، خزینۃ العامرہ مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۲۹ ب ۲؎ اخبار الاخیار ص ۲۰۱، ہفت اقلیم ورق ۱۲۹ الف، خزینۃ الاصفیا ج دوم ص ۸۰، مرآۃ سکندری ص ۲۵۲، لیکن صاحب تذکرۂ حسینی لکھتا ہے "درعہد ہمایوں بادشاہ مراجعت بدھلی نمودہ نقد ودیعت سپرد و قبرش درجوار مزار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ است" چونکہ جمالی کا مزار دہلی میں ہے، اس لیے حسین دوست کو غلط فہمی ہوئی کہ اس کا انتقال بھی مراجعت کے بعد دہلی ہی میں ہوا، خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۸۰ "وفات آں جامع الکمالات در دہم ذیقعدہ نہصد و چہل و دو ہجری در سالے کہ ہمایوں بادشاہ بگجرات رفتہ بود ہمراہ لشکر بادشاہ بوقوع آمد" آئینہ محمدی مصنفہ محمد حارثی بدخشی (بحوالہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۸ء ص ۷، امتیاز علی عرشی) "شیخ جمالی کنبو دہلوی شاعرے مشہور از مشایخ طریقت دہم ذیقعدہ در گجرات فوت شدہ بدہلی نقل کردند۔"

کا اندرونی حصہ دیدہ زیب ہے، اندرونی حصہ میں ان کے کچھ اشعار کے علاوہ ایک غزل بھی چونے سے لکھی ہوئی ہے، غزل کا مطلع ہے،[1]

اگر بکفر کشد سر سیاہ کاری ما ۔۔۔ بود بعفو تو چشم امیدواری ما

صاحب مخزن الواصلین نے ان کی موت پر ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے، جس کا آخری شعر ہے[2]

سال نقلش بعزت و تمکیں ۔۔۔ خردم گفت "ماہ خلد بریں"
۹۴۲ھ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۷) [3] اخبار الاخیار ص ۲۱۴، مراۃ العالم ورق ۳۹۶ ب، ید بیضا ورق ۴۱ ب خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۸۸، گل رعنا ورق ۹۲ الف، مراۃ سکندری ص ۲۵۶، مراۃ آفتاب نما ص ۲۶۵ [4] آئینۂ محمدی بحوالہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۴ء ص ۵، امتیاز علی عرشی، [5] مراۃ العالم ورق ۳۹۶ ب اخبار الاخیار ص ۲۱۴، تذکرہ حسینی ص ۳۸ [6] اخبار الاخیار ص ۲۱۴ "مقبرہ او در مقام خواجہ قطب الدین است قدس سرہ بغایت منزہ و لطیف بحضور خود ساختہ و خانہ کہ حالا قبر او در واست در حالت حیات مسکنش بود، مراۃ العالم ورق ۳۹۶ ب، خانہ کہ حالا قبر او در واست در حالت حیات مسکنش بودہ۔ [1] مفتاح التواریخ ص ۲۲۲ "اندرون روضۂ او کہ بسیار خوب و مرغوب ساختہ اند و غزلے از غزلہائے او و چند ابیات از چونہ مرقوم نمودہ اند مطلع اش این است

اگر بکفر کشد سر سیاہ کاری ما ۔۔۔ بود بعفو تو چشم امیدواری ما

[2] مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) نمبر ۹۵، ص ۸۰، صاحبان ہفت اقلیم (ورق ۹۵ الف) مراۃ العالم (ورق ۳۹۶) اور تذکرۃ العلما (ص ۴۴) نے لکھا ہے کہ اس کا مادۂ وفات "خسرو ہند" ہے۔ اس مادے کی قیمت عددی ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء ہوتی ہے، اسی بنیاد پر خوشگو نے ورق ۱۳ الف پر لکھا ہے، "در نہصد و بست و پنج در گذشت خسرو ہند" تاریخ وفات است ۔۔۔۔۔

جمالی کی حب الوطنی جمالی کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی حرمین شریفین کی زیارت اور اسلامی ممالک کے سفر کے دوران وطن کی یاد برابر ستاتی رہی۔[1] مثنوی "مہر و ماہ" کے آخر میں بعنوان "خاتمہ کتاب" مندرجہ ذیل اشعار ان کی حب الوطنی کے آئینہ دار ہیں[2] ؎

زبعد مکہ سیرم در عجم بود ولے بے ہند خاطر می نیاسود

زہندوستاں اگرچہ دور بودم چو طوطی در قفس مہجور بودم

خراساں گر بیاضے داشت پر نور سواد اعظم آمد ہند معمور

دہلی سے جہاں وہ پیدا ہوئے، اور جہاں ان کی پرورش ہوئی انھیں بہت محبت تھی، دہلی کے اس صبر آزما سفر میں دہلی کی یادیں ہمت بندھاتی رہیں[3] ؎

بغربت خاطرم کم جمع بودے ولے فکرم مثال شمع بودے

اگرچہ بودم از دہلی بسے دور دلم می یافت از حب الوطن نور

اور دوستوں اور ہمنشینوں کی یاد آتی رہی[4] ؎

(بقیہ حاشیہ ۱۰۸) وآنکہ صاحب طبقات شاہجہان وفات دے در نہصد و چہل دو نوشتہ غلط است۔

ز ششم نور کا یہ بیان غلط ہے، کیونکہ جمالی بابر اور ہمایوں کے دور حکومت میں زندہ تھا، صاحب مفتاح التواریخ نے اس غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے (ص ۱۲۰) پر لکھا ہے "و اتفاقاً 'خسرو ہند' [۹۴۲] تاریخ وفات اوست' حقیقت میں جمالی کی تاریخ وفات کا مادہ 'خسرو ہند بودہ' ہے لفظ 'بودہ' کے چھوٹ جانے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی، منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۴۳ پر لکھا ہے "خسرو ہند بودہ" تاریخش یافتہ اند۔ [1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۳ الف ؎

زشوق کعبہ و مہر مدینہ چو مجمر روز و شب می سوخت سینہ

مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۳ ب ؎ قدم بر داشتم در راہ بالجز ۔ زعم فضائے ربع مسکوں را زدم سیر

ز آن جشنیان قدیم — جگر می سوخت چو نابیم

بیاد روئے ہر مشکین کلالہ — مدام از نرگسم می ریخت لالہ

شبا روزے بیاد روئے ایشاں — چو زلف لالہ رخساراں پریشاں

زخون دیدہ ہر دم اشک ریزاں — چو اشک از دیدۂ مردم گریزاں

تصانیف: مندرجۂ ذیل تصانیف ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔

(۱) سیر العارفین[51]:- یہ برصغیر ہند و پاک کے مسلم درویشوں کی سوانح حیات ہے،

(۲) مثنوی مہر و ماہ[52]:- یہ ایک رومانی مثنوی ہے۔

(۳) مثنوی مرآۃ المعانی[53]:- یہ بھی مثنوی ہے لیکن اس کا موضوع تصوف ہے،

(۴) مثنویات جمالی[54]:- یہ دیگر مثنویات کا مجموعہ ہے۔

(۵) دیوان جمالی[55]:- یہ اس کا دیوان ہے۔

سیر العارفین: یہ کتاب مغل بادشاہ ہمایوں کے نام[56] معنون ہے، اور ہندوستان کے دسویں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۹) [52] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۰ ب۔ [53] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۰ ب [54] ایضاً ورق ۱۳ ب۔ [55] ندوۃ العلماء کتب خانہ لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۳۶، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کرزن) مخطوطہ نمبر ۱، [56] پنجاب یونیورسٹی (مجموعہ شیرانی) مخطوطہ نمبر ۵۲۴۔ [57] ایضاً مخطوطہ نمبر ۸۰، [58] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ ۴۴۶ (مثنویات جمالی) یہ جمالی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے لیکن اس میں شبہ ہے کہ یہ جمالی ہی کی تصنیف ہے تفصیل آگے آتی ہے۔ [59] رام پور اسٹیٹ لائبریری مخطوطہ۔ [60] سیر العارفین مخطوطہ (ندوۃ) ورق ۳ تا ۴ الف (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۴ الف تا ۴ ب اردو ترجمہ جلد اول ص ۳ تا ۴ ہمایوں ۹۳۷ھ میں تخت نشین ہوا اور جمالی

تیرہ مسلم صوفیوں کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

(۱) خواجہ معین الدین سجزی ورق ۴ ب تا ۱۰ ب مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

(۲) شیخ بہاء الدین زکریا ورق ۱۰ ب تا ۴۴ ب " " "

(۳) قطب الدین بختیار اوشی ورق ۴۴ ب تا ۵۹ الف " " "

(۴) شیخ فرید الدین مسعود (گنج شکر) ورق ۵۹ الف ۸۰ الف " " "

(۵) شیخ صدر الدین عارف ورق ۸۰ الف تا ۱۰۱ الف " " "

(۶) حضرت نظام الدین (اولیا) محمد بدایونی ورق ۱۰۱ الف تا ۱۳۱ ب " " "

(۷) شیخ رکن الدین ابوالفتح بن صدر الدین عارف ورق ۱۳۱ ب تا ۱۴۰ " " "

(۸) شیخ حمید الدین ناگوری ورق ۱۴۰ ب تا ۱۴۶ ب مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی " "

(۹) شیخ نجیب الدین متوکل ورق ۱۴۶ ب تا ۱۵۲ الف " " "

(۱۰) شیخ جلال الدین ابوالکاظم تبریزی ورق ۱۵۲ الف تا ۱۶۰ الف " " "

(۱۱) شیخ نصیر الدین محمود اودھی ورق ۱۶۰ الف تا ۱۶۴ ب " " "

(۱۲) سید جلال الدین بخاری المعروف جہانیان جہان گشت، ورق ۱۶۵ الف تا ۱۷۳ الف۔ "

(۱۳) شیخ سماء الدین ورق ۱۷۳ الف ۱۸۴ ب " " "

ترکیب و تحریر: جمالی کے چند دوستوں نے انھیں ترغیب[1] دی کہ جن بزرگوں سے ملاقات

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۰) ۹۴۲ھ میں فوت ہوا۔ اس لئے سیر العارفین کا زمانہ تصنیف ۹۳۶ھ/۱۵۳۰ء اور ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء کے درمیان ہے۔ [1] سیر العارفین (ندوۃ) مخطوطہ ورق ۳ تا ۴ الف، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ ورق ۳ الف تا ۳ ب

کی ہے، اور جن کے روضۂ مبارک کی زیارت کی ہے، ان کی سوانح حیات مرتب کریں، یہ ایک عظیم الشان کام تھا، اور اس کے لیے کافی وقت اور محنت درکار تھی اس لیے جمالی نے سوانح لکھنے کے لیے صرف ہندوستان کے صوفیوں[1] کا انتخاب کیا، اور پھر اسے صرف چشتی اور سہروردی صوفیوں تک محدود کر دیا، اور اس کا نام سیر العارفین رکھا[2]۔ ہندوستان کے صوفیوں کی سیرت پر مشتمل پیشتر کتابوں کی صحت، جمالی کی نظر میں مشکوک تھی، ان کا خیال تھا کہ ان کتابوں میں مشتبہ اور غیر مصدقہ واقعات کی بھرمار ہے، اس لئے انھوں نے اپنی کتاب میں روایات کی صحت کا خاص خیال رکھا[3]۔ بقول خود ان کی اس تصنیف کے ماخذ مندرجۂ ذیل کتابیں ہیں۔

(۱) طبقات ناصری[4]:۔ مصنفہ منہاج سراج

(۲) فوائد الفواد[5]:۔ مصنفہ حسن دہلوی

(۳) خیر المجالس[6]:۔ مصنفہ شیخ نصیر الدین اودھی

(۴) تاریخ فیروز شاہی[7]:۔ " مولانا ضیاء الدین برنی

(۵) سیر الاولیاء[8]:۔ " شیخ وجیہ الدین کرمانی

---

[1] ایضاً ورق ۳ ب [2] ایضاً ورق ۴ ب " داین مجموعہ معرفت را کہ اکثر احوال واعمال صورت وسیرت عارفان صاحب کمال است سیر العارفین نام نہادم تا از برکت ملاحظہ مذاکرہ ایشاں خوانندگان ومستمعان حاضر وغائب را نعمتی عظیم ودولت مستقیم روئے دہد۔" [3] سیر العارفین مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کرزن) ورق ۳ ب تا ۴ الف [4] سیر العارفین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کرزن) مخطوطہ ورق ۸، ۲ ب، ۵۶ ب وغیرہ [5] ایضاً ورق ۸۸ ب، ۸۹ ب، ۱۰۳ ب، ۱۰۸ ب وغیرہ [6] ایضاً ورق ۵۳ الف، ۸۴ ب، ۵۹ الف، ۸۰ ب، ۱۱۵ الف، ۲۳ الف وغیرہ۔

جمالی نے اپنی کتاب میں روایات بالاسناد درج کیا ہے، جہاں ماخذ کے حوالے نہیں ہیں، وہاں اس نے لکھا ہے کہ فلاں واقعہ یا تو کسی مستند کتاب میں اس نے پڑھا ہے، یا اپنے پیر شیخ سماء الدین یا کسی معتبر آدمی سے سنا ہے[۱]

اس کتاب میں اگرچہ تاریخی مواد ملتے ہیں، پھر بھی اسے "تاریخ" کا درجہ حاصل نہیں، یہ عام سوانح حیات کی طرح برصغیر کے تیرہ[۲] مسلم صوفیوں کی سوانح حیات ہے، اس میں صوفیوں کے کرامات کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا گیا ہے، صوفیائے کرام اور بادشاہان وقت کے آپس کے تعلقات پر تقریباً تمام تذکرہ نگار اور مؤرخین خاموش ہیں، لیکن جمالی نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور یہی اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔

بدایونی نے اپنے مخصوص ناقدانہ انداز میں اس کتاب کی تعریف کی ہے، وہ لکھتا ہے "خالی از سقمے و تناقضے نیست"[۳] نظام الدین[۴]، فرشتہ[۵] اور دوسرے مصنفین نے بھی اس سے حوالے دیئے ہیں۔ صاحب روز روشن[۶] لکھتا ہے، "کتاب سیر العارفین وے قابل معائنہ ارباب ذوق است" جمالی نے خود اس کتاب کو "مجموعہ معرفت" کہا ہے[۷]، "و این مجموعہ معرفت را کہ اکثر احوال و اعمال صورت و سیرت عارفان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۲) ۵؎ ایضاً ورق ۱۰، ۱۲۰ ب۔ ۶؎ ایضاً ورق ۱۲۰ الف "نقل است از سید وجیہ الدین مبارک کرمانی المعروف بہ سید خورد کہ کتاب سیر الاولیا مرقوم نمودہ است" ورق ۱۴۴ ب بھی دیکھئے۔ ۱؎ سیر العارفین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کرزن) مخطوطہ نمبر ۱، ورق ۱۰، الف ۴۹ ب، ۱۳۲ ب، ۱۲۵ ب، ۱۴۴ ب، ۱۶۳ ب، ۱۸۰ الف، ۱۸۱ ب وغیرہ ۲؎ منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۵ (ریکنگ) ص ۴۳۰ ۳؎ طبقات اکبری (انگریزی مصنفہ بی۔ ڈیو) ص ۵ ۴؎ فرشتہ جلد اول ص ۲ ۵؎ روز روشن ص ۱۵۱ ۶؎ سیر العارفین (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۴۹

صاحب کمال است سیر العارفین نام نہادم تا از برکت ملاحظۂ تذکرہ ایشاں خوانندگان ومستمعان حاضر و غائب را نعمت عظیم و دولت مستقیم روئے دہد"

<u>انداز تحریر</u> اس کتاب کی ابتدا "تعارف" سے ہوتی ہے، اس کے تیرہ باب ہیں عبارت سلیس اور غیر مسجع ہے، حمد، نعت اور منقبت کے اشعار بہت استعمال کئے گئے ہیں، یہ اشعار صوفیوں سے اور خصوصاً شیخ سماء الدین سے جمالی کی گہری عقیدت کے آئینہ دار ہیں۔ اشعار مثنوی کے مختلف مروجہ بحروں میں ہیں، ان کی زبان سلیس اور صاف ہے، ایسی تمام نظموں میں اس نے اپنا تخلص ضرور استعمال کیا ہے، جو اس کے صوفیوں کے ساتھ گہرے تعلق کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔

او مالک ملک لایزالی است	در سلک محبتش جمالی است[1]
دایم او را مقام عالی باد	نظرش جانب جمالی باد[2]
جمالی یکے از ثنا خوان اوست	بصد جان محب محبان اوست[3]
بملک فقر جز نعمت نہ بودش	جمالی ریزہ چین خوان جودش[4]
ہموارہ محبتش ملایم	در دام جمالیست دایم[5]
او صدر مشایخ معانی است	در خدمت او دل جمالی است[6]
چوں دل شس ناظر جمالی گشت	زاں نظر گنج لایزالی گشت[7]

[1] سیر العارفین مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۶۷، یہ شیخ بہاء الدین کے بارے میں

[2] ایضاً ورق ۴۵ الف یہ قطب الدین بختیار اوشی کے بارے میں ہے۔

[3] ایضاً ورق ۱۰۱ الف یہ نظام الدین اولیا کے بارے میں ہے۔

[4] ایضاً ورق ۱۳۲ الف یہ شیخ رکن الدین ابو الفتح کے بارے میں ہے۔

صوفیوں کی مدح و ستائش میں جمالی نے ہر چند حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے پھر بھی اپنے پیر و مرشد کی تعریف میں وہ مبالغہ آرائی سے باز نہ رہ سکا۔ اشعار میں اس نے صوفیوں کے نام بہت چابکدستی سے استعمال کئے ہیں۔ چند نمونے درج ہیں۔

آں معین دین و ملت بے نظیر فارغ از دنیا بہ ملک دیں امیر[۵۸]

سلطان سریر ملک تمکین یعنی کہ بہار ملت دین[۵۹]

بملک فقر شاہنشاہ و مقصود فرید دین و ملت شیخ مسعود[۶۰]

کلامش پاک از طامات و از شطح یگانہ شیخ رکن الدین ابوالفتح[۶۱]

خورشید سپہر عز و تمکین یعنی کہ حمید دولت دین[۶۲]

کردہ روشن تمام روئے زمین آفتاب جہان نجیب الدین[۶۳]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴) شہ ایضاً ورق ۱۳۸ ب - یہ شیخ حمید الدین ناگوری کے بارے میں ہے۔

[۵۶] ایضاً ورق ۱۲۵ الف یہ حضرت مخدوم جہانیاں کے بارے میں ہے۔

[۵۷] ایضاً ورق ۱۱۳ ب یہ شیخ سماء الدین کے بارے میں ہے۔

[۵۸] ایضاً ورق ۹۴ یہ خواجہ معین الدین سجزی کے بارے میں ہے۔

[۵۹] ایضاً ورق ۱۰۱ ب یہ شیخ بہاء الدین زکریا کے بارے میں ہے۔

[۶۰] ایضاً ورق ۵۹ الف یہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں ہے۔

[۶۱] ایضاً ورق ۱۳۲ الف یہ شیخ رکن الدین ابوالفتح کے بارے میں ہے۔

[۶۲] سیر العارفین مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۳۸ یہ شیخ حمید الدین ناگوری کے بارے میں ہے۔

[۶۳] ایضاً ورق ۱۴۲ ب یہ شیخ نجیب الدین متوکل کے بارے میں ہے۔

آمد ز خدا بفتح بابش   مخدوم جہانیاں خطابش [۱]

رہبر انس و جاں ز روئے یقیں   پیشوائے جہاں سمار الدین [۲]

کتاب کے نثری حصہ میں عربی کے الفاظ اور محاورے کثرت سے لئے گئے ہیں۔ لیکن زبان صاف اور سلیس ہے، کہیں کہیں مسجع عبارت بھی ملتی ہے خصوصاً تعارفی حصہ مرصع و مسجع ہے۔ شیخ بہاء الدین زکریا کے تعارف سے چند جملے مونۃً درج ذیل ہیں [۳]:

" آں گوہر درج شریعت و آں اختر برج معرفت و حقیقت آں راہنمائے مناول تصدیق و آں ابواب کشائے معارف تحقیق آں مرشد سالکان صاحب حال و آں رہبر رہروان اہل کمال، آں زبدۃ الاتقیا و آں خلاصۂ اولیا ر بہاء الدین زکریا قدس سرہ العزیز از اولیا کبار بود در روش مشیخت صاحب اعتبار و در علم ظاہر مجتہد زماں و در اسرار باطن سلطان سریر عرفان و در عہد خویش از بے نظیران روزگار بود در کشف و کرامات عدیم المثال و در عبادت و ریاضت مستقیم احوال "

تعارفی حصے کے علاوہ باقی کتاب سلیس زبان میں لکھی گئی ہے مثلاً [۴]:

" ہر کس از انعام مستقدام حضرت عزت محروم منہ۔ اول پیرے کہ در معاصی دل و جان خود محکم بندد و دوم جوانے کہ بامید توبہ باطن خود را بمعصیت پسندد سیوم سلطانے کہ باوجود حصول و نیل مرادات جزوی و کلی چراغ سلطنت خود ط

۱؎ سیر العارفین مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۲۵ الف یہ شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بارے میں ہے۔ ۲؎ ایضاً ورق ۱۱۳ ب یہ شیخ سمار الدین کے بارے میں ہے۔ ۳؎ ایضاً ورق ۱۰ ب تا ۱۱ الف ۴؎ ایضاً ورق ۱۰۹ الف و ب

بہ صرصر دروغ بے فروغ گرداند۔ بایپر فرمان شود کہ اے موئے سفید سیہ دل

ترا بعد از ضعف پیری چہ امید زیستن بود کہ دیوار تو بہ مستحکم نہ ساختی . . . .

. . . وبا جوان ہم ادھند کہ اے جوان نادان ندانستی کہ شیخ وشاب و اطفال

رانا صیہ حیات . . . . . وقضاے ربانی است تو کہ بامید توبۂ پیری بصحرائے

معصیت بہ نخوت خرامیدی عاقبت ندیدی کہ بہ پیری نرسیدی کہ تائب گردی

وبادشاہ کاذب را بہ ایں خطاب وعتاب در اضطراب اندازند کہ اے غافل

روزگار، دروغ از بہر طلب عقبٰی بنا شد مگر از براے ضبط وربط دنیاے فانی

از ان چہ کم داشتی کہ تخم کذب درمزرع اعمال پیوستہ می کاشتی ''۔

جمالی نے کبھی کبھی ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جیسے ''کھچری''[1]

'' چوں درآمدم دیدم کہ بر تخت پوش جالسند و طبقے از طعام

کھچری پیش ایشاں نہادہ تناول می فرمایند ''۔ (باقی)

---

[1] سیر العارفین، مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۰۰، یہ شیخ کبیر ابن

اسماعیل کے بارے میں ہے۔

بزم تیموریہ جلد اول

اقبال اور نئی دنیا

از

جناب ڈاکٹر عبدالمغنی شعبۂ انگریزی بی این ، کالج پٹنہ یونیورسٹی ،

مستقبل سے انسان کی دل چسپی ایک معروف و معلوم حقیقت ہے، اور دورِ حاضر میں تو اس دل چسپی نے ایک عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی ہے، چنانچہ باضابطہ ایک مکتبِ فکر مستقبلیت ([illegible] کے نام سے پیدا ہو گیا ہے۔ بیسویں صدی کے ادب کی دنیا میں کئی نامور شخصیتوں نے اس مکتبِ فکر کی ترجمانی کی ہے، درحقیقت جدید سائنسی انکشافات اور صنعتی ایجادات نے صدی کے اوائل میں تمدن کے نقشے کو اس تیزی اور سختی سے بدلنا شروع کر دیا تھا کہ ادیب اور شاعر اپنے خیالوں میں ایک نئی دنیا بسانے لگے تھے اور فن کارانہ تخیل کی وہ رو جو پہلے گذرے ہوئے زمانوں کے اساطیر کی داستان مرتب کرتی تھی اب اس نے آنے والے زمانوں کے افسانے رقم کرنے شروع کیے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے جو چیزیں مافوق الفطرت سمجھی جاتی تھیں اب انھیں ممکن الوقوع تصور کیا جانے لگا۔ اس طرح مستقبل کی تاریخ کا افسانہ لکھنے والوں میں انگریزی ادیب ایچ' جی' ویلز کا نام اور کام بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یورپ کے کئی مشاہیر ہیں جنھوں نے آنے والی زندگی کے متعلق پیش قیاسیاں کی ہیں۔ ان پیش قیاسیوں میں سائنس اور صنعت کے علاوہ معیشت اور سیاست کے انقلابات کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ خاص کر انقلابِ روس اور اشتراکیت کے عروج نے ان پیش قیاسیوں پر کافی اثر ڈالا۔ جارج برنارڈ شا کا ضخیم و بسیط ڈراما "میتھوسلاح کی طرف وا[illegible]

(Back To Methusilah) مستقبلی ادب کی ایک عظیم دستاویز ہے، جس میں بڑے فلسفیانہ انداز میں حکایت ہستی کی ابتدا سے انتہا تک کا ایک خیال انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جارج آرول کے ناول "۱۹۸۴ء" میں سائنس، صنعت اور اشتراکیت کی سازش سے پیدا ہونے والے ایک متوقع سیاسی و معاشی نظامِ زندگی کا نہایت بھیانک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی بات اپنے طور پر آلڈس ہکسلے نے اپنے ناول "نئی دنیا" میں کہی ہے۔ ناول کا پورا انگریزی نام The Brave New world بہت ہی طنز آمیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آرول اور ہکسلے کے مستقبلی افسانوں کا رخ منفیانہ اور قنوطی ہے، وہ موجودہ نہج پر انسان کی آیندہ ترقی سے بے حد خائف ہیں۔ ان کے شعور میں یہ بات جاگزیں ہو چکی ہے کہ سائنس، صنعت اور اشتراکیت کی خالص مادی ترقیات کا سیلاب کسی کے روکے نہ رکے گا اور بالآخر مستقبل کی نئی دنیا کو غرق کر کے چھوڑے گا، یعنی یوروپی نقطۂ نظر سے ترقیات گویا بوتل کا جن ہے جو ایک بار قابو سے باہر ہو کر پھر اپنے نکالنے والے ہی کو بے قابو کر دے گا۔

مغربی مادیت کی پیدا کی ہوئی نئی دنیا کو اقبال نے اس طرح متنبہ کیا تھا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ، جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مغربی تہذیب کے خانہ برباد اندرونی تضادات پر یہ ایک بہترین تبصرہ ہے۔ اس تبصرے میں شاخِ نازک کا لفظ بہت معنی خیز ہے اور اس کے بہتیرے مضمرات ہو سکتے ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ یورپ نے زرگری اور عیاشی کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ اس نے زندگی کا مقصد محض تجارت اور عشرت کو قرار دے لیا ہے، اور اس کے تمام علوم و فنون کا مطمحِ نظر سوداگری اور بوالہوسی ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ، کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

یہ اشعار ۱۹۰۷ء کی ایک غزل کے ہیں، جو اقبال کے پہلے مجموعۂ "بانگِ درا" میں شامل ہیں، یعنی اقبال نے بیسویں صدی کے پہلے ہی دہے میں یورپ کے تمدنی حالات اور تہذیبی کیفیات کا براہ راست مشاہدہ

[illegible] ۱۹۰۸ء تک کرنے کے بعد نئی دنیا کے متعلق اپنا تنقیدی جائزہ ان الفاظ میں پیش کر دیا تھا

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام — وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام
وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس — چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو — اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

یورپی تمدن و تہذیب پر ایک تبصرہ بالِ جبریل کی نظم "لینن۔ خدا کے حضور میں" پیش کرتی ہے:

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ خیالات مغربی یورپ کے سیاسی و معاشی نظام کے ایک باغی کے ہیں، جس نے اس کے مقابلے میں ایک نیا اور انقلابی نظام پیش کیا۔ لیکن خود اشتراکیت بھی "فیضانِ سماوی" سے اسی طرح محروم تھی جس طرح جاگیرداری، شہنشاہی، سرمایہ داری اور جمہوریت تھی۔ اگرچہ اقبال دنیا کے ان معدودے چند دانش وروں میں ایک تھے جنھوں نے سب سے پہلے اور آگے بڑھ کر بولشویک روس کے انقلاب ۱۹۱۷ء کا خیر مقدم کیا اور اس سے توقعات کا اظہار کیا، جیسا کہ بانگِ درا میں "خضرِ راہ" کے باب "سرمایہ و محنت" اور بالِ جبریل کی نظم "فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام)" کے

علاوہ دوسرے بہت سے اشعار سے واضح ہے، مگر بہت جلد نئی دنیا کے اس نئے نظام سے بھی اقبال کی توقعات ختم ہو گئیں۔ اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اشتراکیت بھی درحقیقت مغرب کے مادہ پرستانہ سماج ہی کی ایک لہر ہے اور اس مرض کا علاج نہیں جو اس سماج کو لاحق ہے یہ امید کہ اشتراکیت نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام پر ضرب کاری ضرور لگائی لیکن اس کشمکش سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کے دروازے نہیں کھلے اور زمام کار مزدور کے ہاتھوں میں آنے کے باوجود پرویزی حیلوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ضربِ کلیم کی نظم اشتراکیت اور بلشویک روس، اور ارمغانِ حجاز کی ابلیس کی مجلس شوریٰ اس سلسلے میں خاص کر لائقِ مطالعہ ہیں۔

فکری طور پر نئی دنیا کے متعلق اقبال کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ مادہ پرست، ظاہرہ بیں اور سطحی ہے، اس نے صرف "آفاق" کی سیر کی ہے، "انفس" کا تجسس نہیں کیا ہے، اس نے ترقی کے میکانکی اسباب کا سراغ ضرور لگایا ہے، مگر تہذیبی اقدار و اخلاقی معیار سے بیگانہ ہو کر اس کا سارا زور جسم کی پرورش پر ہے۔ روح کی تربیت سے وہ بالکل غافل ہے، یہ ایک خود کار اور بے جان ارتقا کی قائل ہے اور تخلیقی و تعمیری ارتقا کی اہمیت سے آگاہ نہیں، اس نے انسانیت کی قیمت پر حیوانیت کو فروغ دیا ہے۔ یہ صحت مند اور صحت بخش توازن سے خالی ہے۔ اس سلسلے میں ضربِ کلیم کی نظم "زمانہ حاضر کا انسان" فکر سے بھری ہوتی ہے۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار | عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ضرب کلیم کی یہ نظمیں بھی لائق مطالعہ ہیں۔ 'عصر حاضر' 'آزادیٔ فکر' 'مغربی تہذیب'
ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کسی سے کم 'ترقی پسند' تھے۔ وہ دورِ حاضر کے تمام
جدیدوں سے زیادہ "جدید" تھے۔ نئی دنیا کی نغمہ سرائی اور ایک بہتر مستقبل کی پذیرائی کرنے
والوں میں اقبال کا شاید ہی کوئی مدِ مقابل اب تک کے عالمی ادب میں ہو۔ وہ شروع
سے ہی حرکت تغیر، نمو، ارتقا اور انقلاب کے داعی تھے۔ اقبال زمانۂ حال سے نہ صرف
غیر مطمئن بلکہ بے زار تھے اور ان کی ساری توقعات مستقبل پر مرکوز تھیں، وہ اپنے آپ کو
اسی لئے 'شاعرِ فردا' کہتے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے کلام و پیام کا رخ بیشتر نوجوانوں
کی طرف ہے۔ اقبال کی رجائیت ان کی مستقبلیت (Futurism) ہی پر مبنی ہے، یہ
مستقبل ہی کا تصور تھا جس کی گرمیٔ نشاط سے وہ نغمہ سنج تھے۔

اقبال کا یہ فلسفیانہ شعر بہت مشہور ہے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

انھوں نے ۱۹۰۷ء ہی میں کہہ دیا تھا:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
('شمع اور شاعر' — بانگ درا)

اس کے بعد 'خضر راہ' کے آخری بند میں یہ تلقین کی تھی:

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اس سلسلہ میں 'مسجد قرطبہ' کے اختتامی اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

(بالِ جبریل)

ساقی نامہ، کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

مذکورہ نظم کے یہ اشعار بھی انقلاب و ارتقا ہی کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہیں:۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

نظم دو زمانے کے اشعار تغیر کے فلسفے اور مستقبل کے نظریے کو ایک خاص رخ دیتے ہیں:۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

(بالِ جبریل)

اقبال کی مستقبلیت کے رخ اور ربط کی توضیح و تشریح سے پہلے بالِ جبریل کی حسبِ ذیل غزلوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:۔

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

تو زمیں کے لیئے ہے نہ آسماں کے لیئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کے لیئے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اقبالؔ کی تمام تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ اس صدی کے ان مفکرون اور دانش وروں میں نہیں تھے۔ جو مستقبل برائے مستقبل، تغیر برائے تغیر اور ترقی برائے ترقی کے قائل اور علم بردار تھے بلکہ وہ تغیر و انقلاب کا ایک خاص مثبت اور تعمیری تصور رکھتے تھے، وہ ایک معمولی فلسفی اور سائنس داں کی طرح محض انکشافات و ایجادات کے تذکرہ پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایجاد و اختراع کے لیئے ایک نصب العین رکھتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کو ایک پسندیدہ، بلند تر اور عظیم تر منزل کی طرف بڑھائیں۔ اقبالؔ مستقبل کے پرستار نہیں، معمار تھے، وہ نئی دنیا کو سلام نہیں کرتے، پیام دیتے ہیں۔ وہ انسانیت کے سامنے نہ تو اس دنیا کے یادگار کی حیثیت سے آتے ہیں۔ اور نہ پرستار کی حیثیت سے، بلکہ صرف ایک پیغام بر کے طور پر۔ ان کا مقام ایک مفکر، مصلح اور معلم کا ہے۔ وہ ایک باشعور فن کار، اور با مقصد دانش ور ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور اور سطح کے دوسرے عالمی فن کاروں اور دانش وروں کے برخلاف نئی دنیا کے سفرات کو زیادہ گہرائی، وسعت اور بلندی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ان کے ہم عصر امید کا دامن چھوڑ دیتے ہیں، وہاں اقبالؔ بڑے نشاط انگیز انداز میں امید کا پیام دیتے ہیں، وہ ترقی پذیر سماج کے مرض کی تشخیص بھی کرتے ہیں۔ اور اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں "پیام مشرق" کے دیباچے کی یہ فکر سے بھری ہوئی عبارت ملاحظہ ہو۔

"...... حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ
ہم محض اس واسطے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے
روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس
نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی
خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک
نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن اسٹائن اور برگساں
کی تصانیف میں ملتا ہے، یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک
نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اور سانیٹی (سابق وزیر اعظم اطالیہ) سے انحطاطِ
فرنگ کی دل خراش داستان بھی سن لی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست
مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت
واقع ہو رہا ہے......

..... اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا
نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل
قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں
بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے......"

اس بیان سے دو اہم نکتے واضح ہوتے ہیں:۔

۱۔ اقبال مغرب کی تمدنی ترقیات کو صحیح رخ پر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء)
کو مغربی تہذیب کا نقطۂ زوال تصور کرتے تھے جو حقیقت دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء)
کے بعد پوری دنیا کو معلوم ہو گئی۔ اس کا اندازہ اقبال کی حکیمانہ بصیرت نے ستائیس سال

تھا تھا ان بنا پر ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ انسانیت کی آیندہ ترقی مغرب
نہیں بلکہ شاید اس سے بھی پہلے لگا لیا تھا... بلکہ
امامت و قیادت میں ممکن نہیں...
ان نے روس اور امریکہ کے بجائے اپنی امیدوں کا مرکز مشرق کو
بہ سی لیے بالآخر اقبال
تھا کہ جب تک سائنس اور صنعت کی ترقیات کی باگ ڈور مشرق
دے لیا ان کا خیال تھا ... انسانی ارتقا کا رخ درست نہ ہوگا۔ اقبال کو یہ بھی یقین تھا کہ بہت
ہاتھ میں نہیں آئی ... مشرق میں پھیل جائے گی مگر اندیشہ تھا کہ کہیں مشرق بھی مغرب کی تقلید نہ کرنے
اور نتیجتاً ان غلطیوں کو دہرائے جنھوں نے مغرب کی تباہی کا سامان کیا تھا۔ لہٰذا اقبال
کو متنبہ کرتے ہیں کہ اسے مغرب کی طرح ظاہر پرستی میں نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ حقیقت پسند
کام لینا چاہیئے اسے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ باطن کی اصلاح پر زور دینا چا
انسان ظاہر کی ترقیات کا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو اور اس طرح زندگی کا توازن برقر

ضرب کلیم کی مشہور نظم "شعاعِ امید" اقبال کے اسی موقف کی ترجمان ہے، وہ کہتے

ایک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن　　افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پو

لیکن

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر　　فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو س

اقبال درحقیقت عالمی سماج میں ایک ایسا انقلاب لانا چاہتے تھے جو مغر
پیدا کیئے ہوئے تمدنی انقلاب کی اصلاح اور صحیح طور پر اس کی تکمیل کر سکے، انکے نزدیک مغ
یکا کی نظام عالم انسانیت کے لیئے ایک خطرہ تھا، جسے دور کرنے کے لیئے ایک
متوازن انقلاب کی ضرورت تھی، جس میں مادی و صنعتی ترقی کے برابر روحانی و ا
ترقی بھی ہو۔ اور اسی کے نتیجے میں آدمیت عروج و کمال کے نقطے پر پہنچے گی۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

(بالِ جبریل)

اس عروج کے معیارِ کمال کی نشاندہی کے لیے اقبالؔ معراجِ نبویؐ کو معراجِ انسانیت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

وہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں　　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

(شبِ معراج۔ بانگِ درا)

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے　　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(بالِ جبریل)

تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا　　　ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

(بالِ جبریل)

اسی تصور کے تحت اقبالؔ نے مردِ کامل کا تخیل پیش کیا، جس کا ایک عام مظہر ان کا "مردِ مومن" ہے۔ اقبالؔ نئی دنیا کی تشکیل کے لیے اسلامی اقدار اور اسلامی نظام کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اس کی اصلی اور آفاقی شکل میں، بلا امتیازِ قوم و فرقہ و علاقہ۔ اقبالؔ کا خیال تھا کہ مغرب کی مادہ پرستی نے دنیا کو متحارب قوموں میں تقسیم کر دیا ہے، اسلام کا روحانی و اخلاقی نصب العین تصورِ توحید کے تحت ایک عالمی و آفاقی معاشرہ قائم کر کے پر امن ارتقا کا سامان کر سکتا ہے۔ یہی بات بعد میں آرنلڈ ٹائن بی نے اپنے مجموعۂ مضامین (Civilisation on Trial) میں کہی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ ختمِ رسالت کو انسانی فکر کی آزادی کا سب سے بڑا پروانہ سمجھتے ہیں۔ جو قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جو انسانِ کامل کا سب سے بڑا نمونہ ہیں، نئی دنیا کا پیغامبر اور قائد قرار دیتے رہے۔

"اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا کہ پیغمبرِ اسلام صلعم کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم و جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے، یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ اس لیے اسلام کا ظہور، جیسا کہ آگے چل کر پوری طرح ثابت کر دیا جائیگا استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں چوں کہ نبوت اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی، اس لئے اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل اسی طرح ہو گی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے، اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہ رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسان کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اسی لیے کہ ان سب میں یہی نکتہ مضمر ہے، اور یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب واردات باطن سے، جو بہ اعتبار نوعیت انبیا کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے، قرآن مجید نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر جگہ ہو رہا ہے"

(" اسلامی ثقافت کی روح" تشکیل جدید الٰہیات صفحہ)

اقبال نے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید در حقیقت انسانیتِ عامہ کی تشکیل جدید کے لیے ہی کرنی چاہی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نئی دنیا کی تعمیر کے لئے مغربی مفکرین کے برخلاف اقبال کا مطمح نظر سیاسی و معاشی یا سائینسی و صنعتی نہیں، بلکہ بنیادی اور اصولی طور پر دینی و اخلاقی

ہے۔ ان کے نزدیک سیاسی، معاشی، سائنسی اور صنعتی ترقیات کی حیثیت دینی واخلاقی مطمحِ نظر کے وسائل کارکی ہے۔

اسی تصور کے تحت اقبال نے مشرق کے ذریعہ انسانیت کی نئی تعمیر و ترقی کے لیے خودی کے اسرار کے ساتھ ساتھ بے خودی کے رموز بھی بیان کیے۔ ایک طرف وہ یہ چاہتے تھے کہ آج کا انسان اپنے آپ کو پہچانے، اپنی اصلیت کو جانے، اپنی حقیقت کو سمجھے، اپنی اہمیت سے آگاہ ہو، اور اپنی قوت وصلاحیت سے پورا پورا کام لے۔ دوسری طرف وہ فرد کو اجتماعی مفاد کا پابند دیکھنا چاہتے تھے اور اس مفاد کی خدمت کے لیے اس کے اندر نظم وضبط پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنے آپ کو پوری کائنات سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھے، تاکہ اس کی آفاقی ترقی کی راہ میں کوئی چیز، حتیٰ کہ اس کی اپنی ذات بھی حائل نہ ہو سکے۔ ان کے خیال میں کوئی فرد خلا میں رقص نہیں کر سکتا، اسے اپنی انفرادیت کے کرشمے دکھانے کے لیے ایک ماحول کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں مستقبل کا انسان اپنی ذات و کائنات دونوں کی تکمیل اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ انفس و آفاق کے درمیان ایک موثر توازن قائم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک طرف خودی کا عالم یہ ہے:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بالِ جبریل)

دوسری طرف بے خودی کی کیفیت یہ ہے:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(شمع اور شاعر۔ بانگ درا)

تب ہی ارتقا اس نقطۂ کمال پر پہنچتا ہے:۔

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

(بالِ جبریل)

اس توازن اور کمال کو اقبال خودی کی مسلمانی قرار دیتے ہیں۔ اس تصوّرِ خودی کا موازنہ سارتر کی وجودیت سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خودی ایک مثبت، متوازن اور مفید تصور ارتقا ہے جب کہ وجودیت ایک غیر معتدل، منفی اور مضر تخیل ہے۔ وجودیت خود پسندی ہے اور خودی خود شناسی۔ وجودیت خود پرستی ہے اور خودی خود نگری، وجودیت میں خود غرضی ہے اور خودی میں خود نگہداری، مغربی یورپ اور امریکہ کی سرمایہ داری ایک قسم کی وجودیت پر مبنی ہے، جب کہ مشرقی یورپ اور چین کی اشتراکیت اس وجودیت کا ایک انتہا پسندانہ ردِ عمل ہے، اور دونوں ہی مستقبل کے انسان کے لیے تباہ کُن ہیں، لہٰذا نئی دنیا کی ترقی صرف اس تصوّرِ خودی کی بنیاد پر ممکن ہے۔ جو وجودیت اور اشتراکیت دونوں کے نقائص سے پاک اور انفرادیت و اجتماعیت دونوں کے فطری و حقیقی تقاضوں کی تسکین اور تکمیل کرنے والا ہے۔

خودی کا یہ تصوّر ایک ایسے ارتقا کا تخیل پیش کرتا ہے جو حیاتِ انسانی کو جمود، انتشار اور موت سے نجات دلا سکتا ہے، جس کے مطابق کائنات ابھی نا تمام ہے، زندگی کی تکمیل باقی ہے، اور ترقی کی کوئی حد نہیں۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون (بالِ جبریل)

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

(ساقی نامہ — بالِ جبریل)

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(حیاتِ ابدی، ضربِ کلیم)

یہاں تک کہ انسان تقدیر کے چکر سے بھی نکل جاتا ہے، وہ خدا کا راز داں ہو جاتا ہے اور اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کا عیار بن جاتے ہیں:-

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں — ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

(بالِ جبریل)

لیکن خودی کا یہ ارتقا اسی وقت ممکن ہے جب وہ صاحبِ ایمان ہو اور اسلام کے نظریۂ حیات پر کاربند رہے۔ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو زمانے کا بندہ بن کر اپنے ارتقا کو بالکل محدود کردے یا خدا کا بندہ بن کر ایک آفاقی وجود اور لامتناہی ترقی کا حامل بن جائے :-

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ (بالِ جبریل)

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے، — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات (۱۰)

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

('احکامِ الٰہی' — ضربِ کلیم)

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی (بالِ جبریل)

مستقبل کی تمدنی ترقیات کی رہنمائی کے لیے اقبال انسانی تہذیب کا جو نصب العین رکھتے تھے اس کا نقشہ وہ اس طرح کھینچتے ہیں

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب — یگانہ اور مثالِ زمانہ گونا گوں

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

(مدنیتِ اسلام — ضربِ کلیم)

یہی مدنیت اقبال کے تصورِ خودی کا تہذیبی نصب العین ہے، جس کو اختیار کرکے انسان حیات و موت کے محدود تصورات سے بلند ہو جاتا ہے اور اس کا وجود آفاق کی طرح وسیع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خودی مقصود بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو اقبال مغرب کے نشاطی اور قنوطی (دونوں ہی انتہا پسندانہ نظریہ ہائے زندگی کو رد کرکے خودی کے متوازن نظریے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں ملاحظہ مختلف اشخاص کی زبان سے کس طرح اسے بیان کرتے ہیں

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانش مند (سپنوزا) حیات کیا ہے، حضور و سرور و نور و وجود
نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانش مند (افلاطون) حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود
حیات و موت نہیں التفات کے لائق فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

(ضربِ کلیم)

پھر آدمی کی مقصودیت کا اظہار کرتے ہیں:

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

(ضربِ کلیم)

اس کے بعد مردِ مومن کے آفاق بداماں ہونے کا اعلان کرتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(کافر و مومن — ضربِ کلیم)

یہی اصولی و نظریاتی مردِ مومن مستقبل کا انسان، نئی دنیا کا حقیقی معمار اور حیات و کائنات کی مسلسل ترقی کا علم بردار ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمار جہاں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

('طلوع اسلام' ـــ بانگ درا)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

('مرد مسلمان' ـــ ضرب کلیم)

اقبال کو توقع تھی کہ یہ مرد مومن اور اس کا نظریۂ اسلامی ہی ہے۔ جو انسانی ترقی کے کسی اگلے مرحلے پر قوم و وطن کی تفریق ختم کر کے ایک ملت آدم کی تشکیل و تعمیر کرے گا:۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

مکے نے دیا خاک جینوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم!

(مکہ اور جینوا ـــ ضرب کلیم)

یہ آفاقی انسان ترقی کے جن مرحلوں سے گذرنے والا ہے اور ارتقا کی جن منزلوں پر پہنچنے والا ہے۔ ان کا جو بلند سے بلند اور وسیع سے وسیع تصور اب تک دور حاضر کے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے کیا ہے۔ اقبال کا تصور ان سب سے زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نئی دنیا اور نئے آدمی کے ارتقا کا جو تخیل اقبال نے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی رفعت و وسعت اور عمق کے لحاظ سے انسانی ذہن کو چکرا دینے والا ہے۔ پورا جاوید نامہ، اس تخیل ارتقا کی تصویر ہے۔ اس کے مضمرات کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:۔

فروغ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر او گردوں شود روزے

خیال او کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

یکے در معنی آدم نگر از ما چه می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

بلاشبہ ارتقا کا یہ تخیل بے حد غیر معمولی ہے، یہ فلسفیانہ سے بھی بڑھ کر صوفیانہ و شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انسان کے سفرِ ارتقا میں واقعہ معراج کو منزلِ آخریں تسلیم کر لینے کے بعد اقبال کا تخیلِ ارتقا بالکل قابلِ فہم اور قابلِ عمل نظر آتا ہے۔ خاص کر اقبال نے ختمِ رسالت کی جو تشریح کی ہے اس کے پیشِ نظر وہ بات بالکل معقول اور ممکن معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

لہٰذا نئی دنیا اور نئے آدم کی جو بھی ترقی یافتہ شکل مستقبل میں رونما ہو سکتی ہے اس کا پیغام اقبال نے ہمیں پہلے ہی دے دیا ہے۔

اس سلسلے میں مغربی مفکرین کے مقابلے میں اقبال کا ایک امتیاز تو یہ ہے کہ ان کا تصورِ مستقبل محدود نہیں، اقبال کی منزلِ ارتقا دیگرہ کسلے اور اوردیل سے آگے، بلند تر، وسیع تر اور عمیق تر ہے، دوسرا امتیاز یہ ہے کہ یہ محض مبہم سی پیش قیاسی نہیں ہے، بلکہ ایک واضح اور متعین عقیدہ ہے۔ جب کہ مثال کے طور پر برنارڈ شا نے (میتھو سلاح کی طرف واپسی میں) لامحدود ترقی کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ محض ایک خیال آفرینی بلکہ پریشاں خیالی ہے، شا کی الیٹ [illegible] بس ایک نقطۂ خیال ہے۔ جب کہ اقبال کا مردِ مومن ایک حقیقی وجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ ارتقا کا [illegible] واضح، جامع، اکمل اور متعین تصور اقبال کو کس سرچشمے سے حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے سارے نظریات ایسا تصور پیش کرنے سے عاجز ہیں اور [illegible] ہے کہ اقبال سے پہلے یا ان کے بعد اب تک کسی مفکر نے ایسا تصور پیش نہیں کیا۔ حاصل

اس تصورِ ارتقا کا سرچشمہ وہی ہے جس کی نشاندہی خود اقبال نے کی ہے یعنی اسلام کا نظریۂ حیات و کائنات
واقعہ یہ ہے کہ بغیر وحی اور دین کے ایسا کامل تصور میسر آ ہی نہیں سکتا اور خوش قسمتی سے اقبال کی
رسائی اسلام کی صورت میں وحی اور دین کے اصل اور خالص سرچشمے تک ہو گئی تھی جب کہ مغرب کے
مفکرین اپنے فلسفہ و سائنس کے ظلمات میں اس چشمۂ حیوان کا سراغ نہ لگا سکے یہاں تک کہ ان کے
سماج میں پائی جانے والی مسیحیت بھی ان کی مدد نہ کر سکی اس لیے کہ اس کا سرچشمۂ وحی غیر خالص ہو کر
غیر معقول اور از کار رفتہ ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تمدن کی گمرہی کے خلاف علم بغاوت
اٹھانے والوں کو بھی صراطِ مستقیم کا راستہ نہ ملا اور وہ بے چارے اپنے خیالات کی اندھی وادیوں
ہی میں سرگشتہ رہے۔ ڈی ایچ لارنس سے جارج برنارڈ شا تک کا المیہ یہی ہے۔ بلاشبہ شا نے
'میتھوسلاح کی طرف واپسی' میں اس بات کا اعتراف اور تذکرہ کیا ہے کہ نئی دنیا کے ارتقا کے
اگلے مرحلے پر مغربی تمدن کا غلبہ ختم ہو جائے گا اور مشرق کی قیادت میں ایک عالمی انقلاب ہو گا
اور یہ کہ مستقبل کا نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات اسلام ہو گا۔ مگر شا کے سفرِ ارتقا میں اسلامی
شریعت منزل نہیں بس ایک مرحلہ ہے جسے چھوڑ کر اس کا تخیل آگے ہی آگے دھندلی دھندلی راہوں
پر بڑھتا جاتا ہے۔ ایسا صرف اس لیے ہے کہ بدقسمتی سے مسیحی ماحول میں اسلام کے متعلق شا کی
واقفیت معمولی، رسمی اور سطحی قسم کی تھی۔ اسلام اسے بس ایک بہتر مذہب نظر آتا تھا اسے خبر نہ تھی کہ
اسلام ایک نظریۂ کائنات اور نظامِ زندگی ہے جو معیشت، معاشرت و سیاست سے سائنس
اور فلسفے تک کے رہنما اصول مرتب کرتا ہے، پھر شا کو معراجِ نبوی کی بھی خبر نہیں تھی یا اس پر
یقین نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسلام کے نظریۂ تخلیق اور تصورِ خلافت کے مضمرات
کیا ہیں۔

بہر حال، خوش قسمتی سے اسلام اقبال کا عقیدہ تھا اور مشرق ان کا ماحول، اس لیے انہیں

لارنس اور شا وغیرہ کی طرح مغربی تمدن کے مقابلے میں ایک بہتر تصور تہذیب کے لئے اجنبی اور تاریک راہوں میں بھٹکنا نہیں پڑا، اور فلسفہ و سائنس وغیرہ علوم و فنون کی جو ذہنی ثروت انہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس سے انھوں نے ایک ایسی نئی دنیا کا نقشہ بنانے میں مدد لی جو کبھی پرانی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ تر و تازہ رہے گی:۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک   دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اقبال کو یقین تھا کہ ایسی ایک آفاقی دنیا، مغرب کی پیدا کی ہوئی محدود دنیا کے خاتمہ پر ضرور پیدا ہوگی، اور وہی مستقبل کے آفاقی انسان کی پسندیدہ دنیا ہوگی۔ چنانچہ پورے اعتماد اور ولولے کے ساتھ وہ اس دنیا کی پیشین گوئی کرتے ہیں:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش   اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار   نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک   بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز   اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل   موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود   پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور   خون گلچیں سے کلی رنگ قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے   یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(شمع اور شاعر ۔ بانگ درا)

یہ مستقبل کے صالح انقلاب کا ایک اعلان ہے، جس میں استعارے اور کنایے کی زبان میں انقلاب کے بنیادی اصول بھی درج کر دیئے گئے ہیں:۔

مثنوی مجنوں لیلیٰ اور نل دمن

پر

ایک طائرانہ نظر

از

ڈاکٹر محمد طیب صدیقی، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار)

مثنوی شعرائے عجم کی ایجاد ہے، ابو شکور بلخی کو اس کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ فردوسی نے اس صنف کو درجۂ کمال تک پہونچایا نظامی نے اسے حقائق و معارف سے آشنا کیا، اور بزمیہ و عاشقانہ مضامین سے روشناس کرایا، شیخ سعدی نے اس میں پند و موعظت اور حکمت کے دریا بہائے۔ مولانا رومی، حکیم سنائی اور صوفی عطار کے رشحاتِ قلم سے صوفیانہ اور عارفانہ مثنویاں عالم وجود میں آئیں۔ امیر خسرو دہلوی نے اسے تاریخی وقائع اور اخلاقی سماجی اور عرفانی مسائل سے مالا مال کیا۔

فارسی داستان سرائی میں نظامی گنجوی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فردوسی کے بعد کوئی مثنوی نگار اس کی عظمت اور شہرت کو نہیں پہونچا، خصوصاً بزمیہ اور عاشقانہ مثنوی نگاری میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ اور اس میں وہ ایک نئے طرز کا موجد بھی ہے نظامی کے بعد زمانہ تک کسی شاعر نے اس صنف پر طبع آزمائی کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یہ امیر خسروؔ کے کمال اور زور بیان کا احسان ہے کہ لگ بھگ ایک صدی کی طویل مدت کے بعد پھر نظم کی دنیا میں داستان سرائی کا زرین دور آیا

اور ان کے ملک بحر نگار نے اس صنف کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ تاریخی، اخلاقی، سماجی، معاشرتی، عرفانی اور تحقیقی مضامین سے آراستہ کرکے اسے ابدی و سرمدی زندگی عطا کی۔ امیر خسرو کی مثنویوں میں سادگی اور صفائی کے باوجود ایک خاص قسم کا جوش اور ایک لطیف قسم کی دلکشی اور دل ربائی پائی جاتی ہے۔ بیان کی سلاست، خیال کی ندرت، الفاظ کی موزونیت عبارت کی روانی۔ بندش کی چستی، اور تمثیلوں کی برجستگی ان کی مثنویوں کی امتیازی خصوصیات ہیں انھوں نے جس قدر مثنویاں لکھی ہیں ان کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ پہلی قسم میں خمسہ کی مثنویاں ہیں جن میں نظامی کے خمسہ کی تقلید کی گئی ہے۔ دوسری قسم کی مثنویاں طبع زاد ہیں۔ جو تقریباً تمام تاریخی ہیں۔

نظامی گنجوی کے بعد جس قدر خمسے لکھے گئے ہیں ان میں خسرو کا خمسہ سب سے بہتر ہے اس خمسہ کی تیسری مثنوی مجنوں لیلیٰ ہے جو ۶۹۸ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں دو ہزار چھ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ اور میرے خیال میں یہی ایک ایسی مثنوی ہے جہاں خسرو اور نظامی کی فنکاری میں بہت کم فرق نظر آئے گا۔

مجنوں لیلیٰ کی حزنیہ داستان کا تعلق عرب کی سرزمین سے ہے۔ اس لیے اس میں نہ تو بزم آرائی اور عیش و طرب کی سرمستی ہے اور نہ قصر و محل کی آرائش و زیبائش کے نقش و نگار پائے جاتے ہیں۔ یہ صرف عشق کے سوز و گداز اور ہجر کے مصائب و شکایات کا ایک اندوہناک واقعہ اور صحرا نوردی و بادیہ پیمائی کی ایک ناقابل فراموش کہانی ہے۔ جس میں شروع سے آخر تک عشق و محبت، نالہ و فریاد اور آہ و بکا کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ گویا اس مثنوی کا ہر شعر بجائے خود ایک پُر درد غزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں وہ ایک نغمہ سنج سے زیادہ داستان سرا کی حیثیت سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ عشق و محبت کے جذبات دکھانے کا اس سے زیادہ مناسب موقع اور نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس مثنوی میں جگہ جگہ جذبات نگاری پورے آب و تاب اور بڑی خوبی کے ساتھ کی گئی ہے۔ خسرو کی جذبات نگاری کا کمال وہاں پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جب لیلیٰ مجنوں کے رشتہ کے طے پا جانے کی خبر سنتی ہے۔ تو

نا مایوسی اور شکستہ دلی کے جذبات کا اظہار درد بھرے انداز میں اس طرح کرتی ہے۔

او خود غم عشق داشت برکار | شد باغم عشق غیر تش یار
کبکی کہ شکستہ بال باشد | شاہین زندش چہ حال باشد

لیلیٰ مجنوں کو بذریعہ خط اپنی بیقراری اور بیتابی سے آگاہ کرتی ہے:۔

چون عشق دلم زدست بر بود | دل دادن کس کجا کند سود
چون ز آتش تیز پر نیاں سوخت | از سوزن و رشتہ کی توان دوخت
بگداخت ز سوز دل وجودم | وزاوج فلک گزشت دودم

لیلیٰ ایک موقع پر مجنوں سے یوں مخاطب ہے۔

گر یار تو آمدت در آغوش | از یار کہن مکن فراموش
گیرم کہ تراست لعل در چنگ | مشکن بدکان شیشہ گر سنگ

مجنوں کے فراق میں لیلیٰ کی آہ و بکا کا حال سنیئے:۔

ای دوست کہ بی منی و با من | آتش زدہ یا توئی و یا من
دارم زغمت عظیم زارم | دستی کہ زدست رفت کارم
گر گرد زمانہ بی وفائی | باری تو مکن کہ آشنائی

یہ پھر مجنوں کا نالۂ مستانہ ملاحظہ کیجئے:۔

جانم ز فراق بر لب آمد | ی آئی یا برون خرامد
گیرم خوش و شادمان توان زیست | ہیہات کہ بی تو چون توان زیست
مہر تو در استخوان من باد | درد تو دوای جان من باد

واقعہ نگاری مثنوی کی ایک اہم صفت ہے۔ جس میں نقص پیدا ہونے سے مثنوی کا حسن دانغدار

ہو جاتا ہے مثنوی نگار کے لیے واقعہ نگاری کے جملہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس فرض کو نبھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس کے لیے شاعر کو فطرت انسانی اور واقعات کا کامل نبض شناس ہونا چاہیے۔ امیر خسرو کو اس میدان میں ملکہ حاصل تھا۔ مثنوی مجنون لیلیٰ میں واقعہ نگاری کا کمال وہاں پورے آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جب لیلیٰ اور مجنوں کی مائیں اپنے اپنے جگرپاروں کی بدنامی اور رسوائی کا حال سنتی ہیں۔ ایک لڑکے کی رسوائی کا اور دوسری لڑکی کی بدنامی کا۔ دونوں کے رنج و غم میں ایک لطیف تفاوت ہے۔ خسرو اس نازک فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں کے جذبات کی ترجمانی بڑے پُر اثر اور درد انگیز انداز میں کرتا ہے:۔

لیلیٰ کی ماں اپنی بیٹی کو نصیحت کرتی ہے:۔

دانی کہ جہاں فریب ناک است ... آسودگیش غم و ہلاک است
ہر کاسہ کہ خوان دہر دارد ... پنہاں بہ نوالہ زہر دارد
ہر سرخ گلی کہ در بہاری است ... در دامن او نہفتہ خاری ست
چوں اہل زمانہ را وفا نیست ... زیشان طلب وفا روا نیست
ترسم کہ چو گردد این خبر فاش ... بدنام شوی میان اوباش
صوفی کہ شود بہ مجلس می ... البتہ چکد پیالہ بر وی
عشق ارچہ بود بہ صدق و پاکی ... خالی نہ بود ز شرمناکی

مجنوں کی ماں اپنے بیٹے سے مخاطب ہے:۔

بالای چو تیر شد کمانم ... وآمد بہ تنزل استخوانم
مپسند کہ در چنین زمانی ... سوزد بہ غمت گسستہ جانی

مجنوں کے والدین اسکو صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہیں اور حصول مراد کے لیے حتی المقدور کوشش کا یقین دلاتے ہیں، لیکن دونوں کی یقین دہانی میں واضح فرق نمایاں ہے۔ ماں کی یقین دہانی میں زنانہ عجز، اور باپ کی یقین دہانی سے مردانہ قوت کا اظہار ہوتا ہے:۔

ماں کی یقین دہانی:۔

ما ہم ز پیت چنانکہ دانیم جہدی بکنیم تا توانیم

باپ کا وعدۂ سعی:۔

زین غم ہمہ گر مراد یار ست غم ہیچ مخور کہ در کنار ست
گر بر مہ آسمان نہی ہوش کوشم کہ رسانمت در آغوش

فارسی شاعری کے اندر حقائق و معارف اور اخلاقی مضامین کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ خسرو کی مثنوی مجنوں لیلیٰ اگرچہ ایک عشقیہ داستان ہے۔ لیکن اس میں جگہ جگہ ایسے حقائق و معارف ملتے ہیں۔ جو ایک کامیاب زندگی اور رفعت مرتبہ کے لئے دستور العمل بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عنوان "دوست و دوستی" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تا پانہ نہی بد ستیاری از دوست مخواہ دوست داری
یاری کہ بجاں نیاز مائی در کار خودش مدہ روائی
صد یار بود بہ نان شکی نیست چون کار بہ جان فتد یکی نیست

خمسۂ خسروی میں مثنوی مجنوں لیلیٰ کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس میں محبت کا سوز و گداز اور عشق کے واردات بڑے پر اثر اور درد انگیز انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے طرز بیان میں سادگی، صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ایک خاص جوش و اثر اور دل آویزی و دلکشی پائی جاتی ہے۔ اب اس کے ساتھ فیضی کی شہرۂ آفاق مثنوی نل دمن پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

ہندوستان کے داستان نگاروں میں امیر خسروؔ کے بعد ابوالفیض فیضیؔ سب سے بڑا مثنوی نگار اور اپنے دور کا نامور سخن گو ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں خسروؔ کے بعد اس درجہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا۔ وہ فطری طور پر شاعر تھا۔ اور اس کی شاعری اور زبان دانی کے اہل ایران بھی معترف ہیں

فیضیؔ نے بھی نظامیؔ کے خمسہ کی زمین میں مثنوی لکھنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، ہفت پیکر، سکندر نامہ اور مخزن اسرار کے مقابلے میں بالترتیب سلیمان و بلقیس، نل دمن، ہفت کشور، اکبر نامہ اور مرکز ادوار کی بنیاد ڈالی اور ان میں سے ہر ایک طبع آزمائی کی اور اشعار کہے۔ لیکن نل دمن اور مرکز ادوار کے علاوہ باقی مثنویاں زیورِ تکمیل سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔

فیضیؔ کی مثنوی نل دمنؔ فارسی کی عشقیہ مثنویوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور زبان و بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی انفرادیت کی حامل ہے۔ فیضی کی عالمانہ بصیرت، بالغ نظری، اور زبان و بیان پر اہل زبان کی سی قدرت و مہارت نے اسے انداز بیان کی وہ ندرت اور حسین الفاظ کا وہ خلعت بخشا ہے۔ جسے ہم عشقیہ داستانوں میں اس کا امتیازی وصف کہہ سکتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات کی شوخی، تخیل و محاکات کی فنکارانہ کارفرمائیاں الفاظ اور جملوں کی حسین تراش و خراش، فقروں کی در و بست، بندش کی چستی و طراوت، یہ تمام اوصاف قارئین کو "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است" کی مصداق نظر آئیں گی۔

مثنوی نل و دمن کی اصل کہانی ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت پر مبنی ہے جو ہندوستان کی کہانیوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی دل کشی، اثر آفرینی اور رقت انگیزی کی مثال ہندوستان کی قدیم و جدید کہانیوں میں مفقود نظر آتی ہے۔ فیضی نے نلؔ اور دمنؔ کے عشق اور ان دونوں کی محبت کے اس جگر گداز قصہ کو نظامیؔ کی لیلیٰ مجنوں کے طرز پر سنہ ۱۰۰۳ھ میں نظم کیا ہے۔ اس میں چار ہزار دو سو دو اشعار ہیں۔ فیضی کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت اسی کو حاصل ہوئی ہے۔ اس

کتاب کی نادر تشبیہیں، نازک استعارے، زبان کی شوخی، پرگوئی، اور بیان کی دلکشی وغیرہ نے نل کی اس مثنوی کے لیے ایک ایسی جگہ پیدا کر دی ہے۔ جس کا مقابلہ خسرو کے کلام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

یہ عام خیال ہے کہ فلسفی اچھا شاعر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ فلسفہ اور جذبات میں تضاد و تناقض ہے، مگر فیضی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اور اس کی ذات بیک وقت دو متضاد اور متناقض صلاحیتوں کی حامل ہے۔ وہ انسانی جذبات کی جب تصویر کشی کرتا ہے۔ تو اس کی دلفریبی اور دلکشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب نل اپنے ندیموں اور مصاحبوں سے دمن کے حسن کا حال سنتا ہے تو اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتا ہے:۔

ای ہم نفس این چہ داستان بود — وین گر دکدام آستان بود
گر یک گرہ دلم کشودی — چندین گرہ دگر فزودی
بردی غم دل بلاکش من — آتش چہ زدی در آتش من
یاقوت ز دیدہ ام فشاندی — الماس بہ سینہ ام نشاندی
بر دیدہ در بلا کشادی — ہم دیدہ ستارہ ریز کردی

دمن کے نام نل کے خط کے اخیر حصہ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

کز دل بہ کرشمہ اش سلامی — وز دیدہ بہ غمزہ اش پیامی
صد شوق جگر بہ تیز مژگان — وز دیدہ بہ رخ نگاہ پنہان
وز اشک بپای او سجودی — وز آہ بگوش او درودی
از غم بہ نشاط او گدازی — وز گریہ بہ خندہ اش نیازی
کوتاہ کنم سخن کزین بس — وصل است جواب نامہ و بس

دمن اپنے عاشق نل کے خط کے جواب میں لکھتی ہے:۔

من پردہ نشین و غم نشینی زندان بلاست خانۂ من
شاہی دولت بہ این و آن بند برتخت، حدیث عشق تا چند
تو بادہ بنوش آشکارا خونابہ بہ عاشقان گوارا

مثنوی نل دمن میں اہم کردار دو ہیں ایک نل کا، دوسرا دمن کا، نل ایک عاشق مست ہے۔ جو بعید الفہم طریقہ سے دمن پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کا سوز عشق دمن کے دل میں بھی چبھن پیدا کرتا ہے۔ جب دمن کے والدین کو اس کے عشق کا حال معلوم ہو جاتا ہے تو سوئمبر کی رسم ادا کی جاتی ہے، اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد قمار بازی میں نل اپنی سلطنت ہار جاتا ہے۔ اور جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔ ایک شب نل اپنی بیوی کو تنہا سویا ہوا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ دمن جب بیدار ہوتی ہے تو اپنے شوہر کی جدائی کے غم میں اس طرح نالہ کرتی ہے:۔

رفتی و مرا خبر نہ کردی بر بی کسی ام نظر نہ کردی
افتادہ بر بستر ہلاکم در خواب گذاشتی بہ خاکم
چون نالہ شدم بگریہ ہمدوش چون دیدہ بہ خون دل ہم آغوش
عشق است انیس روزگارم باما در و پدر چہ کارم

دمن کی محبت میں نل کی بیقراری اور بیتابی کا حال سنئے:۔

وانگہ قدری بہ ہوش آمد جوشی زدو در خروش آمد
کای وای بہ بخت چون کنم وای نی دل بجو دو نہ صبر بر جائی
عشقم بہ نمک نہفتہ ناسور دردم بہ جگر شکستہ ساطور
بس بود بہ سینہ شعلۂ آہ صد برق زدی تو ہم بناگاہ

از عشق بنود این گمانم کاتش فگند به مغز جانم

مثنوی نل دمن میں واقعہ نگاری کا کمال وہاں نظر آتا ہے۔ جب دمن کی ماں کو اس کی وارفتگی اور بیتابی کا علم ہوتا ہے۔ تو وہ مادرانہ محبت کی وجہ سے بیقرار ہو جاتی ہے اس کے حالات جاننے کی کوشش کرتی ہے۔ اور مختلف پیرایے میں اسے دلاسا دیتی ہے: بیت

کای تازہ نہال نو بہاری در سر تو چیست بیقراری

پژمردہ بہار از چہ دردی در سرخ گلت زچیست زردی

دیدی بہ رہی اگر پری را در کار کنم فسون گری را

ور دید صنمی رد تو در خواب دانا نہ نہد مدار بر خواب

تو نکتہ شناس و ہوشمندی برخواب و خیال دل چہ بندی

دمن کے والدین کو جب اس کے عشق کا حال معلوم ہو جاتا ہے تو وہ دونوں اپنی عزت و ناموس اور دمن کی رسوائی اور بدنامی کا خیال کر کے بے چین ہو جاتے ہیں

عشق ارچہ شگفتہ ماجرائیست رسوائی عشق بد بلائیست

لیکن چہ کنم بنام و ناموس کین عشق پیام برد ناموس

کی داشتم این گمان کہ در گشت از بام مر ننگ بیفتد م طشت

اکنون کہ فتاد شد شہرہ از طاق زد طبل ملامت من آفاق

خواہی کہ بعصمتش دہی پاس در رشتہ کش این گہر بہ الماس

مادر روید رش بہ خلوت راز کردند در یہ نصیحتش باز

امیر خسرو کی مثنوی مجنوں لیلیٰ کی طرح فیضی کی مثنوی نل دمن میں بھی جا بجا پند و نصائح اور اخلاقی مضامین ملتے ہیں جو سماجی افادیت اور اخلاقی قدر و منزلت کے لحاظ سے بڑی اہمیت

کے حامل ہیں۔ مثلاً ایک درویش بادشاہ کو نصیحت کرتا ہے:۔

یک تو جیب کشیدہ خوانیست ‏ ‏ ‏ ‏ بر خوان تو خلق میہا نیست

از داده ایزدی برون ده ‏ ‏ ‏ ‏ وز داده فزون تو ہم فزون ده

ایک عام اخلاقی درس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چون حرف زوی سخن شنو باش ‏ ‏ ‏ ‏ چون راه روی میانه رو باش

اندیشۂ ملک و مال جہل است ‏ ‏ ‏ ‏ گر ماند و گر نماند سہل است

شاعر کی زبانی دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا حال سنئے:۔

بس تخم کہ رہ بہ خاک بردش ‏ ‏ ‏ ‏ نارستہ ز خاک، خاک خوردش

اینجا ہمہ رخت خانۂ نیل است ‏ ‏ ‏ ‏ دستان ہمہ نوحۂ رحیل است

تاراج بقاست در سرایش ‏ ‏ ‏ ‏ نیرنگ فناست در خفایش

فیضی کی مثنوی نل دمن کا ماخذ اگرچہ مہابھارت کی عشقیہ داستان ہے۔ جو خالص ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہے لیکن اس پر فیضی کے ماحول اور مغل تہذیب کی گہری چھاپ ہے۔ اس طرح اس میں ہند و ایران دونوں ملکوں کی تہذیبوں کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں یہ مثنوی نہ صرف ہند و ایران کلچر کی نمائندہ ہے۔ بلکہ نزاکت مضامین اور فصاحت کلام کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہے اور ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے فخر و امتیاز کا سرمایہ ہے۔

شعر العجم (۴)

یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی چوتھی جلد میں جو اس سلسلہ کا شاہکار ہے، تمام اصناف شاعری میں سے صنف مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بہت ہی بسیط تبصرہ ہے مولفہ علامہ شبلی نعمانی۔

قیمت:۔ ۴/۰-۹

باب التقریظ والانتقاد

السیرة النبویة

اور اسکا ترجمہ

نبی رحمت

مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

آج سے چودہ سو برس پہلے جب عرب میں اسلام کا آغاز ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام حق لوگوں کو سنانا شروع کیا تو کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ گنتی کے چند برسوں میں بحر وبر اس صدائے سے گونج اٹھیں گے، وہ دیکھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نہ حکومت وسلطنت کی طاقت ہے نہ ان کے پاس دولت وثروت کے ذخائر ہیں، نہ زر وجواہر کے انبار۔ وہ سمجھتے تھے کہ مادی ساز وسامان کے بغیر دین اسلام کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے، لیکن وحی الٰہی نے اعلان کیا کہ بظاہر ہر قسم کی بے سروسامانی کے باوجود دین حق غالب ہو کر رہے گا۔ خدا کی تائید ونصرت کے بعد کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ پیغمبر اسلام کی شان بھی بلند ہوگی اور وہ رفعت وعظمت کے اس درجہ تک پہونچیں گے جس کا خیال بھی کسی کے دل میں نہیں آسکتا ہے، لسان نبوت نے پیشین گوئی کی کہ پیغام حق دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائے گا۔

مخالفین ان بیانات پر ہنستے تھے لیکن چند ہی برس میں انھیں نظر آگیا کہ ایک عالم اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے اور جس آواز کو انھوں نے دبانے کی کوشش کی تھی وہ دور دور سنی جارہی ہے۔ قرآن مجید نے "رفعنا لک ذکرک" کہہ کر جس سربلندی کا ذکر کیا تھا اس کا مشاہدہ آج ہر شخص کر رہا ہے،

اور اللہ کی عظمت و یکتائی کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت اونچے میناروں سے پکار پکار کر دی جارہی ہے

اس اعلان رفعت کا نتیجہ ہے کہ سیرت نبوی پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور دنیا کی کوئی قابل ذکر زبان ذکر پاک سے خالی نہیں ہے، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور نئے نئے عنوانوں کے ساتھ سیرت پر کتابوں کے انبار لگتے جا رہے ہیں، ہر صاحب قلم چاہتا ہے کہ یہ سعادت اس کے نصیب میں آئے کہ اللہ کے رسول کے سوانح نگاروں کی فہرست میں اس کا بھی شمار ہو، لیکن عجیب بات ہے کہ کتابوں کی کثرت کے باوجود موضوع کی تازگی ہنوز باقی ہے اور ہر لکھنے والے کو کچھ عنوانات مل جاتے ہیں اور بحث و نظر کے نئے گوشے اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی سیرت نبوی کے وسیع ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، اس کے مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو حضور رسالت مآب سے والہانہ محبت اور ان کی سیرت سے غیر معمولی شغف ہے، وہ بچپن سے ایسے ماحول میں رہے ہیں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر، آپ کے احوال و سوانح کا بیان اور آثار و سنن کا چرچا برابر ہوتا رہتا تھا، ماں کی گود سے انہیں یہ دولت نصیب ہوئی، بزرگوں کی توجہ سے اس میں اضافہ ہوا۔ پھر ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی کی تربیت نے اسے محور فکر و نظر بنایا اور ذاتی مطالعہ نے اس تعلق خاطر کو مزید فروغ بخشا۔

راقم الحروف کو طالب علمی کے دور سے اب تک ان کی رفاقت حاصل رہی ہے، میں نے شروع سے آج تک سیرت نبوی کے ساتھ ان کے شغف میں کوئی کمی نہیں پائی، وہ ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ سیرت کی کتابیں پڑھتے رہے، وہ سرسری نظر ڈالنے کے بجائے توجہ کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، سیاق و سباق کی روشنی میں واقعات کا جائزہ لیتے ہیں، ان کے علل و اسباب پر غور کرتے ہیں، اور علم و تحقیق کی روشنی میں پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں اور الجھے ہوئے مباحث کو سلجھاتے

لی کوشش کرتے ہیں اس بارہ میں وہ قدیم و جدید تمام ذرائع سے کام لیتے ہیں۔

پیش نظر کتاب اسی طرز پر لکھی گئی ہے شروع میں اس عالمگیر فساد اور ظلمت عام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں بعثت نبوی کے زمانہ میں دنیا مبتلا تھی مستند مورخین کے حوالوں سے مصنف نے ناظرین کو دنیا کی تباہ حالی کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح سے عقلاے روزگار عاجز تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور آپ کی تبلیغ و دعوت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح گنتی کے چند برسوں میں آپ کے حیات بخش پیغام نے اس جاں بلب دنیا کو حیات نو عطا کی۔ شروع میں نادانوں کی سمجھ میں یہ حقائق نہیں آئے اور انھوں نے قدم قدم پر مخالفت کی۔ باطل پرستوں نے نور حق کو بجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن رحمت عالم اس کار خیر سے باز نہیں آئے اور ظالموں کے ظلم و ستم، حرب و ضرب اور جدال و قتال کے باوجود لوگوں کو راہ حق دکھاتے رہے، بالآخر وہ عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے نوع انسانی کی تقدیر بدل دی۔ اور اس ظلمت خانہ عالم کو مطلع انوار بنا دیا۔

کتاب شروع سے آخر تک ایسے دلپذیر اور پر اثر انداز میں لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی میں کہیں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن اس دلچسپی میں پیغام حق نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ اسلام کی تعلیمات برابر پیش نظر رہتی ہیں اور ان کی خاطر جان و مال کی بازی لگا دینے کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و دلسوزی اور صحابہ کرام کی عقیدت و جاں نثاری کے مرقعات دلوں میں محبت کی تخم ریزی کرتے ہیں اور عمل میں اخلاص و استقامت کی دعوت دیتے ہیں۔

یوں تو سیرت کے بھی مباحث اس کتاب میں آپ کو نظر آئیں گے لیکن بعض امور پر خاص توجہ کی گئی ہے بعثت نبوی سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا، اس بارہ میں غالباً سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرۃ النبی کی چوتھی جلد میں شب ظلمت کے عنوان سے ایک باب لکھا تھا، مصنف نے مآخذ سیرۃ النبی صلعم

بانطاط المسلمین" میں بعثت نبوی کے دور کی دنیا پر نظر ڈالی ہے، راقم الحروف نے "دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" میں بعض نئے ماخذ کی مدد سے مذاہب و اقوام عالم کے بارہ میں مزید حالات درج کیے ہیں، پیش نظر کتاب میں ان معلومات میں اضافہ مزید کیا گیا ہے اور تفصیل سے مذاہب و ملل کی سرگزشت بیان کی گئی جس سے نوع انسانی کی بیچارگی و زبون حالی کی بڑی دلدوز تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان حالات کو بدل کر دنیا کو فلاح و بہبود کی راہ پر لانا کس قدر دشوار تھا۔

ان واقعات سے واقفیت کے بغیر اس جد و جہد کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے، جو رحمت عالم نے اس شب تاریک کو سحر کرنے کے لیے کی تھی۔ اس بارہ میں آپ کی مشقت و جانفشانی کا یہ حال تھا کہ پروردگار عالم کو کہنا پڑا کہ

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین، — ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ایسا لگتا ہو کہ تم اپنی جان ہلاک کر دوگے

لیکن اس سلسلہ میں بہتر ہوتا کہ اہل مذاہب کے تذکرہ کے ساتھ آسمانی کتابوں کی تحریف کی سرگزشت بھی بیان کر دی جاتی تاکہ یہ واضح ہو جاتا کہ ربانی ہدایات کی گمشدگی کے بعد گم راہوں کی راہ یابی کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی، اب وحی الٰہی کی نئی روشنی کے بغیر کسی کے لیے منزل رسی ممکن نہیں تھی،

اقوام و ممالک کے بیان میں جس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا حالانکہ وہ دنیا کا بہت وسیع اور اہم ملک ہے اور ایک شاندار تہذیب و تمدن کا مالک رہا ہے، اس کے حالات اور وہاں کے مذاہب کا تذکرہ ضروری تھا، بعثت نبوی کے وقت عرب کے حالات کا اچھا جائزہ لیا گیا ہے، ہم جہد اسے خاتم النبیین کی تبلیغ و دعوت کا مرکز بنانے کے مصالح بھی واضح کیے گئے ہیں، اس موضوع پر سیرۃ النبی کی چوتھی جلد میں بھی کافی بحث کی گئی ہے لیکن زیر نظر کتاب میں کتب تاریخ

آثار قدیمہ کی روشنی میں بہت سے نئے پہلو نمایاں کئے گئے ہیں، اس موقع پر جزیرۃ العرب کے نقشوں کی شمولیت بہت مناسب اور مفید ہے۔ ان سے مقامات کا محل وقوع اور قبائل کی جائے وطن واضح ہو جاتی ہے۔ اور تاریخی واقعات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مصنف نے مہبط وحی مکۂ معظمہ کے جغرافیائی وتاریخی حالات اور تہذیب وتمدن، تجارت، صنعت، معیشت، معاشرت اور سیاست ونظام زندگی پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے یہ سیرت کی کتابوں پر مصنف کا خاص اضافہ ہے اس سے پہلے تاریخ وجغرافیہ کی مستند کتابوں اور آثار قدیمہ کے معتبر حوالوں سے مکۂ معظمہ کے بارہ میں اس تفصیل کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا تھا، ان حالات کو پڑھ کر پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ دعوت اسلام کا یہاں سے کیوں آغاز کیا گیا، ان معلومات کی روشنی میں تاریخ وسیرت کے بیانات کو صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مکۂ معظمہ ہی کی طرح مدینۂ منورہ کے محل وقوع، طبعی حالات، تہذیب وتمدن، معیشت، معاشرت، قبائل وادیان، رسم ورواج اور ثقافت وسیاست پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ان حالات کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اس شہر کو کیوں ہجرت کے لیے منتخب کیا گیا، کیوں یہاں سے اسلام کی اجتماعی زندگی کا آغاز کیا گیا اور اسے اسلامی ریاست کا مرکز بنایا گیا، اس کی جائے وقوع، زمین کی نوعیت اور باشندوں کی کیفیت سے واقفیت کے بغیر نہ غزوات کے اسباب بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں، نہ مصاف جنگ کی صورت حال واضح ہو سکتی ہے، اس موقع پر مدینۂ منورہ کا ایک نقشہ بھی منسلک ہے جس میں تاریخ وجغرافیہ کی قدیم کتابوں اور احادیث وآثار کے عمیق مطالعہ کے بعد مدینۂ منورہ کے قرب وجوار کے مقامات متعین کیے گئے ہیں، یہ بڑی محنت کا کام تھا اس کی وجہ سے نہ صرف اس کتاب کے مطالعہ میں بلکہ احادیث وسیر کے درس میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اور راویوں کے بیان کردہ مقامات

ان کی درمیانی مسافت، بازاروں، اور مسجدوں کے محل وقوع قبائل کے مسکن تجارتی شاہراہیں اور میدان جنگ اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔

غزوات اور ان کے علل و اسباب بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مصنف نے جس طرح واقعات پیش کیے ہیں اس سے یہ حقیقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے کہ مخالفین کی چھیڑ چھاڑ، مسلسل ریشہ دوانی اور آئے دن کی غارت گری کی بنا پر جنگ کا آغاز ہوا۔ اور مسلمانوں کو مجبوراً اپنی حفاظت اور دعوت اسلامی کی حفاظت کی خاطر تلوار ہاتھ میں لینی پڑی۔ اس سلسلہ میں کچھ آیتیں بھی نقل کی ہیں لیکن تعجب ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ فیصلہ کن آیت اس موقع پر درج ہونے سے رہ گئی

ھم الذین بدؤکم اول مرۃ   وہی لوگ ہیں جنھوں نے تمہارے مقابلہ کا آغاز کیا،

غزوۂ بدر کے سلسلہ میں واضح طور پر مولانا شبلی کا نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا گیا ہے لیکن واقعات جس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے صاف طور پر ذہن میں آتا ہے کہ قریش کی طرف سے فوج کشی میں پہل ہوئی اور مسلمانوں کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔

یہودیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو برتاؤ کیا اس کو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے، ان کی مخالفانہ کارروائیوں اور سازشی باتوں کے بعد ان کے خلاف جو اقدام کیا گیا وہ حق بجانب تھا بنی قریظہ کا معاملہ بڑا سنگین نظر آتا ہے۔ لیکن جو کچھ کیا گیا وہ یہودی روایات اور توراۃ کی تصریحات کے مطابق ہوا یہی ان کے لیے مذہبی حکم تھا اور یہی حالات اور سیاست کا تقاضا تھا، مشہور یہودی مصنف ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون کی رائے اور توراۃ کی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے اور (R.V.C. BODLEY) کا بیان بھی درج کر دیا گیا ہے، جن سے یہ فیصلہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے جن سلاطین عالم کے نام دعوت اسلام کے خطوط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھجوائے تھے ان کے بارہ میں اچھی معلومات دی گئی ہیں۔ اور بازنطینی اور

انسانی سلطنت کے نقشے بھی لگادیے گئے ہیں تاکہ ان حکومتوں کے دائرۂ اقتدار اور اثر و نفوذ کا اندازہ ہوسکے۔ ہرقل کے نام کے خط میں اریسین کا لفظ آتا ہے، اس کی تشریح لغت، کتب حدیث اور متعین حال کے بیانات کی روشنی میں بڑی وضاحت سے کردی گئی ہے۔

وفات اور اخلاق وشمائل کے ابواب یوں ہی پر اثر تھے لیکن ان کے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خطبات مدراس کے ایک اقتباس نے اس اثر کو اور بھی بڑھا دیا۔ کتاب کے آخر میں و ما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کے عنوان سے ۲۲ صفحات کا جو اضافہ ہے۔ وہ اس کتاب کا سب سے قوی اور موثر حصہ ہے، اس کو پڑھ کر اسلام کا انقلاب آفریں پیغام پوری دل آویزی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کو قعر ذلت سے نکال کر عزت و سرفراز کے جس بلند درجہ تک پہونچانے کی کوشش کی ہے اس کی نظیر سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب بڑی تلاش وتحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے لیکن شہرت عام کی بنا پر شاید دو تین روایات کی چھان بین کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ان میں ایک تو حضرت عمر کے اسلام کا واقعہ ہے یہ سبھی کتابوں میں موجود ہے اور اپنی تاثیر و دل آویزی کی بنا پر کوئی سیرت نگار اس کو نظر انداز کرنا گوارا نہیں کرتا ہے۔ لیکن سند کے اعتبار سے اس سلسلہ کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی شیخ محمد علی الشوکانی اور علامہ سہیلی وغیرہ نے سبھی نے اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔

اسی طرح غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں حضرت نعیم ابن مسعود کے متعلق بنی قریظہ اور قریش کے درمیان اختلاف پیدا کرانے کی جو روایت نقل کی گئی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں موسیٰ بن عقبہ کی جو روایت درج کی ہے۔ اس میں صراحت ہے کہ بنی قریظہ نے قریش سے پہلے طے کرلیا تھا کہ یرغمال کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کردیے گئے قریش نے اس کی تعمیل نہیں کی اس کی وجہ سے آپس میں بے اعتمادی اور پھر اس کے نتیجہ میں اختلاف پیدا ہوا غرض

خیبر میں مجاہدین کی تعداد چودہ سو[14] محل نظر ہے صحیح بخاری میں ۱۵۰۰ کی تصریح ہے۔

حجۃ الوداع سے واپسی میں خم غدیر کے مقام پر آپ کے ایک خطبہ کا ذکر ہے جس میں آپ نے حضرت علیؓ کے بارہ میں فرمایا کہ

من کنت مولاہ فعلی مولاہ — جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں،

مصنف نے مولا کا ترجمہ محبوب کیا ہے شاید اس طرح اس تاثر کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو ناظرین کے ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے لیکن اس پیش بندی کے بجائے روایت کے ضعف کو ظاہر کر دینا چاہیئے تھا۔

وفات کی تاریخ بھی محل نظر ہے ۱۲ ربیع اول مشہور بہت ہے اور عام طور سے کتابوں میں یہی تاریخ درج کر دی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے روایتی ضعف کے علاوہ یہ بھی پیش نظر ہے کہ وفات دوشنبہ کو ہوئی اس پر سیرۃ نگاروں کا اتفاق ہے، یہ بھی سب کو تسلیم ہے کہ حجۃ الوداع جمعہ کے دن ہوا تھا ذی الحجہ سے ربیع الاول تک حساب لگا کر دیکھا جائے تو خواہ سب مہینے ۳۰ کے قرار دیئے جائیں خواہ ۲۹ کے یا دو مہینے ۳۰ کے، ایک ۲۹ یا دو ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کا قرار دیا جائے کسی صورت میں دوشنبہ کو ۱۲ ربیع الاول نہیں پڑتی ہے۔ البتہ پہلی اور دوسری ربیع الاول کو دوشنبہ ہوتا ہے، صحیح روایات میں بھی یہی دو تاریخیں بیان کی گئی ہیں، اس کی روشنی میں خیال ہوتا ہے کہ وفات پہلی ربیع الاول کو ہوئی ہوگی چونکہ تدفین دوسرے دن عمل میں آئی اس حساب سے بعض راویوں نے ۲ ربیع الاول بیان کر دی۔

امید ہے کہ آیندہ اشاعت کے موقع پر ان امور پر غور کر لیا جائے گا۔ اردو داں اصحاب کے لیے مصنف کے برادر زادہ مولوی سید محمد حسنی نے نبی رحمت کے نام سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ مترجم کو عربی اور اردو دونوں زبانوں پر بڑی قدرت حاصل ہے

انھوں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں مصنف کا طرزِ تحریر اور زورِ بیان باقی رہے وہ اس کوشش پر پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں اگر سرورق پر مترجم کی حیثیت سے ان کا نام درج نہ ہوتا تو کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ علی میاں کا قلم نہیں ہے۔

اصل کتاب عربی کے صفحات ۲۰۰ ہیں قیمت درج نہیں اردو ترجمہ کے صفحات ۵۰۸ اور قیمت بیس روپئے ہے۔ دونوں کتابیں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے مل سکتی ہیں۔ "ع۔ ق"

دیوانِ حضور

مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مذکورہ بالا دیوان شیخ غلام یحییٰ حضور عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ان کی وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی، ان کے نام اور شاعری سے اب تک ادبی حلقہ واقف نہیں تھا، لیکن پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو ان کے دیوان کا ایک نسخہ مل گیا جن کو قلمی نسخوں کی تلاش کی بڑی فکر رہتی ہے، اور جب ان میں سے کسی پر مضمون لکھتے ہیں، تو اس سے متعلق بہت مفید معلومات فراہم کرکے اس کی اہمیت دوبالا کر دیتے ہیں، حضور سے متعلق تذکرہ شورش، تذکرہ گلشن سخن، تذکرہ گلزار ابراہیم تذکرہ عشقی، تذکرہ طبقات شعرا، تذکرہ سخن، نغز، اور تذکرۃ الصالحین میں جو کچھ تھا، اس کو انھوں نے ایک جگہ جمع کرکے حضور کی اہمیت اس لحاظ سے بڑھا دی ہے کہ ان اقتباسات کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور تمام تذکرہ نگاروں کی نظروں میں بڑی اہم حیثیت رکھتے تھے، حالانکہ ان کا کلام موجودہ دور کے ناظرین کو کچھ روکھا سوکھا اور پھیکا ہی معلوم ہوگا، مگر پروفیسر مختار الدین احمد نے ان پر ۳۴ صفحے کا ایک ناقدانہ مقدمہ لکھ کر ان کی طرف قارئین کو مائل ہونے پر مجبور کر دیا ہے، حضور کے کلام میں زبان، املا، واحد، جمع، جمع الجمع، تذکیر، تانیث، اور واو عطف کے استعمال میں غلطیاں نظر آتی ہیں جن کی نشاندہی خود جناب مختار الدین صاحب نے بھی بڑی محنت سے کی ہے ان کے

یہاں علامات اور اطبا ؤں جیسی جمع ملتی ہیں، پھر ہر ایک کیلئے فعل جمع لاتے ہیں، مثلاً ہر ایک فردیہ عربی جمع کو واحد قرار دے کر فعل واحد لاتے ہیں، مثلاً ایام آخر ہو چکا، مراد حوال "بھی لکھتے ہیں، واو عطف کا استعمال جس طرح چاہتے ہیں کرتے ہیں، مثلاً یہ زمین کیا و موالید ثلاثہ کیا تیری جفا ہمیشہ و میری وفا سدا، وغیرہ،

جناب مختار الدین صاحب نے ان غلطیوں کی مدافعت یہ لکھ کر کی ہے، کہ قدماء میں مصحفی، قائم اور حاتم کے یہاں بھی اس قسم کے قبیح استعمال کی مثالیں ملیں گی لیکن غلطیاں پھر بھی غلطیاں ہیں خواہ اساتذہ کے کلام ہی میں کیوں نہ ملیں، اس کے علاوہ ان اساتذہ کا کلام اتنا باوزن ہے کہ اُن کی غلطیاں ان کے ماہرانہ انداز بیان میں جذب کردہ گئی ہیں، لیکن حضور کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا، خصوصاً جب اُن کے یہاں سلاست و روانی کی کمی کا احساس ہو، (ص ۲۰) اُن کے یہاں عامیانہ الفاظ بھی ملتے ہوں، (ص ۲۰) حروف علت کے گرنے یا دبنے کی بھی مثالیں ہوں، (ص ۳۳) بعض مصرع ساقط الوزن بھی ہو گیا ہو (ص ۳۴) اُن کے کلام کلام میں شتر گربہ کا عیب بھی موجود ہو (ص ۳۵) اور قوافی کے عیوب کے بھی مرتکب ہوئے ہوں (ص ۳۵) گو مختار الدین صاحب نے حضور کی ایسی غزلوں کی بھی نشاندہی کی ہے جو انھوں نے جوشش، فدوی دل اور رفعت کی زمین میں کہی ہیں، حضور نے اپنا حمدیہ قصیدہ کہنے میں انشاء اللہ خاں انشاؔ کے حمدیہ قصیدہ کو سامنے رکھا تھا، مگر اُن کی اس کوشش کے باوجود اُن کے یہاں استادانہ رنگ نہیں،
اُن کے مجموعہ میں کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس کو شوق سے بار بار پڑھا جائے،

حضورؔ نے اپنے کلام میں دہق (بمعنی ڈوری)، جوسق (محل)، الیق (زیادہ لائق)، تعریق (پسینہ لانا)، خزیق (ایک قسم کی گھاس)، سرمق (بتھوا کا ساگ)، سحق (گھسنا)، غسق (شب کی تاریکی) تصدی (پیش پیش ہونا) تباین (فرق)، زیبق (سیماب)، زُہام (بڑی تعداد) اور وغیرہ ہر

(تحویلِ امانت) وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں، مختار الدین صاحب نے ان کے صحیح معانی بتانے میں اپنی لسانی مہارت دکھائی ہے، پھر حضور کے قصیدہ، مثنوی، اور غزلوں کے خاص خاص الفاظ پر جس محنت اور کاوش سے حواشی لکھے ہیں، اس سے مختار الدین صاحب کے اڈیٹ کرنے کے آرٹ کے نیچے حضور کی شاعری کا آرٹ دب کر رہ گیا ہے، اب حضور کی شاعری کا مطالعہ محض ان کے دلچسپ مقدمہ اور پر از مشقت حواشی ہی کے سبب کیا جائے گا،

پروفیسر مختار الدین صاحب نے اس کتاب کو اردو ادب کے مشہور اور ممتاز نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کے نذر کیا ہے معلوم نہیں انھوں نے یہ نذرانہ بطیب خاطر قبول کیا، یا جب اُن سے اس کو نذر کرنے کی اجازت مانگی گئی، تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق طوفان سے بھری ہوئی خاموشی اختیار کر لی جس کو جناب مختار الدین صاحب نے اُن کی رضامندی پر محمول کر لیا، اور اگر انھوں نے نذر کرنے کی باضابطہ اجازت دیدی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے حضور پر پروفیسر مختار الدین احمد کے مقدمہ کی تنقید کو اقلیدس کا موہوم نقطہ اور معشوق کی معدوم کمر، اور پھر حضور کی غزلوں کو نیم وحشیانہ صنفِ سخن قرار نہیں دیا ہے،

یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کی اعانت سے شائع ہوئی، کتابت اور طباعت دونوں بہت اچھی ہیں، قیمت دس روپیے ہے. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر دہلی سے مل سکتی ہے، "ص، ع"

اعلان

معارف کے نئے اور پرانے پرچے محمد نعمت اللہ صاحب قادری ۱/۱۴۱ وحید آباد کراچی نمبر ۱۸ سے پاکستان میں منگائے جا سکتے ہیں، وہاں سے دار المصنفین کی نئی مطبوعات بھی طلب کی جا سکتی ہیں،

"منیجر"

فکر اسلامی کی تشکیل جدید: مرتبین جناب ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق صاحبان، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰۸، مجلد قیمت تیس روپے، پتہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

سائنس کی ترقی نے اس زمانہ میں جو نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کے شرعی حل کے لیے گہرے مذہبی علم اور عصری تقاضوں سے واقفیت ضروری ہے مگر اب ایسے جامع العلوم اشخاص معدوم ہیں، جو دینی علوم کی طرح عہد حاضر کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہوں۔ علماء وقت کے علوم اور زمانہ کے تقاضوں سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلامی علوم سے واقف نہیں ہے، ایسی صورت میں دونوں طبقوں کے فضلاء و ماہرین مل کر ہی نئے پیش آمدہ مسائل کا ایسا حل تلاش کر سکتے ہیں جو تحریف و انحراف اور افراط و تفریط کے بجائے اسلام کے اصول کے موافق اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اسی کے پیش نظر دسمبر ۱۹۷۳ء کی آخری تاریخوں میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ایک سیمینار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوا تھا، اس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے مسئلہ پر غور و خوض اور بحث و مذاکرہ کے علاوہ مضامین بھی پڑھے تھے، اب ان مضامین کا مجموعہ اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں سیمینار کے اغراض و مقاصد، فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مطلب، مسلمانوں کے گذشتہ فکری و اجتہادی

د کے اسباب، اور موجودہ دور میں فکر و اجتہاد کی اہمیت ثابت کی گئی ہے، ابتدا میں مولانا محمد
ب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا پرمغز افتتاحی خطبہ ہے، جس میں مولانا نے تشکیل جدید کے حدود اور
کے مختلف گوشوں کی نشاندہی فرمائی ہے، اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت مضامین درج ہیں،
ن میں علمی، دینی، سیاسی اور سماجی مختلف حیثیتوں سے تشکیل جدید کی ضرورت و اہمیت کا ذکر ہے،
ر قدیم اسلامی علوم حدیث، فقہ، کلام اور تصوف اور شرعی اصول و مآخذ قیاس، اجتہاد اور اجماع
غیرہ کی نئی تعبیر پر زور دے کر جدید اسلامی فکر کی تشکیل میں ان کا حصہ دکھایا گیا ہے، چند مضامین
ں گذشتہ صدیوں کے بعض مجددین و مصلحین جیسے ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ وغیرہ کے فقہی اجتہادی اور کلامی تصوف
ور ان کے اصلاحی و فکری کارناموں کا ذکر ہے، اکثر مضامین مفید اور قابل مطالعہ ہیں، سید صباح الدین عبدالرحمن مولانا
عبدالسلام قدوائی، پروفیسر سید مقبول احمد، مولانا محمد تقی امینی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مولانا مجیب اللہ
ندوی کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں، لیکن چونتیس مضامین میں نہ سب یکساں ہموار اور
معتدل ہیں، اور نہ ان میں ظاہر کیے گئے تمام خیالات سے ہر شخص کا اتفاق ممکن ہے، جناب حسن الدین احمد نے
کتب حدیث کے متعلق جو تجویزیں پیش کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو احادیث کی اہمیت اور
محدثین کے کارناموں سے زیادہ واقفیت نہیں، مولانا برہان الدین سنبھلی کے مضمون میں تقلید کے
منفی پہلوؤں کا ذکر رہ گیا ہے، انھوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کیا عوام ہی کی طرح اہل علم کے لیے
بھی تقلید ضروری ہے؟ ڈاکٹر بشیر الحق کا یہ خیال گو صحیح ہے کہ وحی الٰہی کا جو مفہوم انسانی ذہن نے
متعین کیا ہے، وہ خود وحی الٰہی کی طرح قطعی اور دائمی نہیں ہے، لیکن اس کی جو مثالیں انھوں نے
دی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے ابدی حقائق و مسلمات اور بدیہی تعلیمات
بھی حالات سے اثر پذیر ہو سکتی ہیں، آخر جن نصوص کا مفہوم خود زبان رسالت نے واضح کر دیا ہے،
ان کو قطعی ماننے میں کیوں پس و پیش سے کام لیا جائے، اگر ان کو زمان و مکان سے متاثر سمجھ لیا جائے

تو دین کی کوئی مستحکم بنیاد باقی نہیں رہے گی، ایک طرف تو جدت پسند طبقہ ماضی کی تمام تعبیروں کو غلط قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سر سید احمد خان، جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کی تعبیر و تشریح کو اس طرح پیش کرتا ہے، جیسے وہ عین وحی الٰہی ہیں، ڈاکٹر طاہر محمود نے مسلم ممالک میں ہونے والی قانونی اصلاحات کا ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے مسلم پرسنل لا میں اصلاح و تبدیلی کی جانب دبی زبان سے اشارہ کیا ہے، دراصل فکر اسلامی کی تشکیل جدید، علم کلام کی نئی تعبیر اور اجتہادی مسائل میں اسلام کی روح اور کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت مسلّم ہے، اور اس کا عام احساس بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن اس نازک اور اہم کام کو انجام دینے کے لیے اشخاص کے انتخاب، تشکیل جدید کی تعیین، جدید دور کے تقاضوں اور تبدیلی کی نوعیت و حدود میں بڑی حد تک اختلاف رائے ہے، جس کو ایک اجتماع میں طے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے جدید و قدیم علوم کے ماہرین کو بار بار اکٹھا ہونا ہوگا، اس سیمینار نے اس کی بنیاد ڈالی ہے، اگر کام اخلاص، احتیاط اور غور و فکر کے ساتھ ہوتا رہا تو اس بنیاد پر آئندہ اسلامی نظام کا خاکہ بن سکے گا،

شجرۂ طیبہ، مرتبہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی، تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۰۳ مع گرد پوشش جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، بنارس،

حضرت شاہ طیب بنارسیؒ گیارہویں صدی ہجری کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کا خاندان مدتوں علم و عرفان اور رشد و ہدایت کا گہوارہ رہا جس سے اس نواح کے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا، اس کتاب میں حضرت شاہ طیبؒ کے علاوہ ان کے علمی و روحانی خانوادہ کے دوسرے بزرگوں نیز خلفاء، مریدین اور متوسلین کے حالات و کمالات بھی مستند طور پر بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے کہیں کہیں اس میں بعض معاصر اہل قلم کی غلطیوں کی تردید بھی کی ہے۔ "ض"

27.4.79

مارچ سنہ ۱۹۷۹ء

نمبر ۳ جلد ۱۲۳

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

بکثرت اضافوں کے ساتھ دو کتابوں کے نئے اڈیشن

بزم تیموریہ جلد اوّل

اس جلد میں شروع کے تین مغل

بادشاہ بابر، ہمایوں، اور اکبر کے علمی ذوق اور
اُن میں سے ہر ایک کے دربار سے متوسل علماء
فضلاء شعراء کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کی
تفصیل بیان کی گئی ہے، بعد کی جلدوں میں جو
زیر ترتیب ہیں، بعد کے مغل سلاطین اور اُن کے
عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ
ہوگا۔

قیمت :- ۲۵-۱۴

بزم صوفیہ

تیموری عہد سے پہلے کے تمام ممتاز

صاحب تصانیف صوفیۂ کرام مشائخ عظام
مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ اجمیری، بختیار کاکی
قاضی ناگوری، نظام الدین اولیاء وغیرہ
مستند حالات تعلیمات و ملفوظات جس میں
آٹھویں صدی کے مشہور شیخ طریقت عبد
نوشہ رودولوی کے حالات کا
اضافہ ہے۔

قیمت :- ۱۹-۵

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۲۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۹ء عدد ۳

مضامین

انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کا دوسرا سالانہ اجلاس گذشتہ فروری میں دہلی میں ہوا جس کی صدارت مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ تاریخ کے مشہور اور جید پروفیسر جناب خلیق احمد نظامی نے کی، اس میں انھوں نے جو اپنا پُرمغز صدارتی خطبہ پڑھا، وہ اُن کی زندگی کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جائے گا، اس سے اس اجلاس کے وزن اور وقار میں بھی اضافہ ہوا ہوگا،

انھوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ کہا کہ اب جبکہ ہمارے ملک کی زندگی کی ایک نئی تاریخ بن رہی ہو تو ہماری تاریخ نویسی میں فرقہ واریت، علاقائیت، نسلی عداوت، اور مذہبی حقارت کا اظہار نہ ہو، باہر سے درآمد کئے ہوئے نظریات پر بھی مبنی نہ ہو بلکہ اس میں صرف حق و صداقت ہو، انھوں نے متوازن تجزیہ کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلائی کہ ہمارے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پہلے تو انگریزوں کے سامراجی مصالح کی نذر ہوئی، اور اب یہی تاریخ کارل مارکس کی عینک چڑھا کر لکھی جارہی ہے، ماضی کی تاریخ ماضی کے ماحول میں لکھی جانے کے بجائے حال کے نظری اور فکری رجحانات کے مطابق قلمبند ہو رہی ہے، جس سے اس دور کی ساری مذہبی، روحانی، اخلاقی، اور تاریخی قدر و قیمت پامال ہو رہی ہے، اس خطبہ میں موثر دلائل اور انداز بیان کے ساتھ جو بالغ نظری، رواداری، اور سلامت روی ہے وہ اگر ہمارے ملک کے تمام مورخین میں پیدا ہو جائے تو غلط قسم کی تاریخ نویسی سے جو ذہنی امراض پیدا ہو گئے ہیں ان کا خاطر خواہ مداوا ہو جائے،

"تاریخ نویسی کا مقصد حال کو ماضی کی ناگواری بڑھا کر برباد کرنا نہیں ہوتا، اس میں حکومتوں کی کہانی اور قوموں کی سوانح عمری اس لئے لکھی جاتی ہے کہ متقدمین کے حالات کا علم متاخرین کو ہو، اور جہانداری اور جہانبانی کی اچھائیوں اور برائیوں کے نتائج بعد کی نسلوں کے لئے سرمایۂ بصیرت و عبرت بن کر قومی زندگی کی سیرت بنانے میں معاون ہوں، استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کا قول ہے کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے اس کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر آپ جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں، اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہیں رنگ کر دکھا سکتے ہیں، اس کے ذریعہ ہندوستان کے متفرق اجزا جوڑے بھی جاسکتے ہیں اور توڑے بھی جاسکتے ہیں،

بدقسمتی سے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ لکھنے میں دلوں میں وصل پیدا کرنے کے بجائے ان میں فصل پیدا کرنے کا کام زیادہ لیا گیا ہے، مسلمان حکمرانوں کے دور میں تاریخیں حاکمانہ اور فاتحانہ پندار میں قلمبند ہوئیں، جن کی بعض تحریروں سے ہندوؤں کے دلوں کو دکھ پہنچنا لازمی ہے، مگر اس کے لئے یہ معذرت پیش کی جا سکتی ہے کہ اس دور کی تاریخ نویسی میں مڈیولزم کا رنگ غالب رہا، انگریزوں نے اپنے عہدِ حکومت میں جو تاریخیں لکھوائیں، اس کے لئے بھی یہ عذر ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی امپیریلزم کی مقصد برآری اس طرح کرنی تھی کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں کے شیشے ٹوٹ کر جٹنے نہ پائیں، کارل مارکس کے نظریوں سے مرعوب ہو کر جو مورخین تاریخیں لکھ رہے ہیں وہ زیادہ لائقِ اعتنا اس لئے نہیں ہیں کہ ان پر کمیونزم کا بھوت کیا سوار ہے کہ وہ دنیا کی ساری مذہبی، روحانی اور تاریخی روایات کو دریا برد کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، مگر اس ماڈرنزم کے دور میں ان مورخوں کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے، جن کی تاریخیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو بدلہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں سے میدانِ جنگ میں نہیں لیا گیا تھا وہ ان کی تاریخوں کے صفحات میں لیا جا رہا ہے،

سرجدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر پانچ جلدیں لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی، اورنگ زیب کو برا ثابت کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے مذہب پر بھی یہ لکھ کر اوچھا وار کیا کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے لگے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیرووں کو ڈاکہ زنی، اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا، (اورنگ زیب جلد سوم ص ۲۸۴-۲۸۳)

یہ نفرت اور اشتعال سے بھری ہوئی بلکہ دکھ پہونچانے والی تحریر انگریزوں کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی جس کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے لکھی گئی لیکن آر سی مجمدار آج کل بڑے مقبول اور مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی ایک تحریر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ملیچھ بتا کر ان کی یہاں کی آمد کو ایک المیہ قرار دیا، اور اس دکھ کا اظہار کیا کہ شیخی بگھارنے والے ہندو راجاؤں نے مل کر اس کی کوشش نہیں کی، کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے نکال کر اپنے گوشت کا کانٹا نکال پھینکتے، اور اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف توجہ نہیں کی، کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کرا لیتے، (ہسٹری

اینڈ کلچر آف انڈین پیپل جلد پنجم تمہید ص ۷ ء x)

اگر یہ تحریر مذہبی تعصب نسلی غیظ و غضب یا حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے نشہ میں لکھی گئی تو پھر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے مورخوں کی ایسی تحریریں قابل مواخذہ نہیں ہو سکتی ہیں جن سے ہندوؤں کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگتی ہے، انھوں نے بھی جو کچھ لکھا مذہبی تعصب اور حکمرانی کے غرور ہی میں لکھا، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ ازمنۂ وسطیٰ کے عہد سپہگری میں لکھی گئیں مگر مذکورۂ بالا تحریر قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی، ثقافتی موانست اور وطنی محبت کے دور میں قلم بند ہوئی، ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے ہندوستان میں ہم وطن ہوکر رہے ہیں، مسلمانوں نے بھی یہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا رکھا ہے، دونوں کو یہیں جینا اور مرنا ہے تو کیا ایک دوسرے کی مذہبی، روحانی، اور تاریخی قدروں میں رخنہ گری ملک کے ساتھ بے وفائی نہیں ایسے محل پر دوستو رخنہ گری ہے خودکشی　　　ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

ہندوؤں نے تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں ہی سے سیکھا انھوں نے اس کو سیکھ کر اپنے وطن کے عہد قدیم کی تاریخ کو ایک متمدن ترین قوم کی تاریخ بنا دی، مگر وہ جب اپنے اسی وطن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھتے ہیں، تو اس میں ہمدردی کے بجائے بے دردی کی رخنہ گری زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس ضرورت کے انسدادی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا ہم خاموش رہیں کہ ہمارا ماضی نفرت انگیز طریقہ پر پیش ہوتا رہے؟ یا ہم خود اپنے ماضی کی تاریخ کی مذہبی، روحانی، معاشرتی، نفسیاتی، اور سیاسی عظمت کو اس طرح پیش کریں کہ اس میں صداقت، واقعیت اور معروضیت کے آبدار موتی جھلملاتے بھی نظر آئیں، اور کسی کے شیشۂ دل میں بال بھی نہ آئے آج کل تاریخ لکھی نہیں جاتی ہے بنائی جاتی ہے، ہم اپنی تاریخ بنائیں نہیں. بلکہ لکھیں، تاکہ ہم بھی بنیں، اور ہمارا ملک بھی بنے،

معارف کا زیادہ تر حصہ لکھا جا چکا تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے بہت پرانے رکن تھے، اُن کی وفات سے یہ ملک ایک شریف ترین انسان، ایک خلیق بزرگ، ایک اچھے دوست اور ایک بہت ہی نامور مصنف سے محروم ہو گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، معارف کی آیندہ اشاعت میں ان شاء اللہ اُن پر ایک مفصل مضمون

مقالات

امیر خسروؒ اور افضل الفوائد

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

امیر خسروؒ نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے کچھ ملفوظات افضل الفوائد کے نام سے جمع کیے، مگر کچھ محققین ایسے بھی حال ہی میں پیدا ہو گئے ہیں جو اس خیال کے ہیں کہ اس کو امیر خسروؒ نے خود مرتب نہیں کیا بلکہ ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، اگر یہ پرزور طریقہ پر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کو امیر خسروؒ نے جمع نہیں کیا تو اس سے زیادہ طاقتور طریقہ پر یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ امیر خسروؒ ہی نے اس کو ترتیب دیا۔

خواجگان چشت میں سے حضرت عثمان ہرونیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات کے مجموعوں کے ساتھ افضل الفوائد کو بھی سب سے پہلے پروفیسر محمد حبیب (سابق استاد تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انگریزی رسالہ مڈیول انڈیا کوارٹرلی (علی گڑھ) میں جعلی، نقلی اور فرضی قرار دیا، اس کا جواب راقم نے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۶۳ء کے معارف میں دیا، جو میری کتاب بزم صوفیہ کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں بھی شامل ہے، اس جواب سے یہ اثر ہوا کہ ایک علمی حلقہ ان ملفوظات کے مجموعوں کو قطعی طور پر جعلی، نقلی اور فرضی سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

اینڈ کلچر آف انڈین پیپل جلد پنجم تمہید ص ۷ x ۷)

اگر یہ تحریر مذہبی تعصب نسلی غیظ و غضب یا حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے نشہ میں لکھی گئی تو پھر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے مورخوں کی ایسی تحریریں قابلِ مواخذہ نہیں ہو سکتی ہیں جن سے ہندوؤں کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگتی ہے، انھوں نے بھی جو کچھ لکھا مذہبی تعصب اور حکمرانی کے غرور ہی میں لکھا، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ ازمنۂ وسطیٰ کے عہد سپہگری میں لکھی گئیں مگر مذکورۂ بالا تحریر قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی، ثقافتی موانست اور وطنی محبت کے دور میں قلم بند ہوئی، ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے ہندوستان میں ہم وطن ہو کر رہ رہے ہیں، مسلمانوں نے بھی یہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا رکھا ہے، دونوں کو یہیں جینا اور مرنا ہے تو کیا ایک دوسرے کی مذہبی، روحانی، اور تاریخی قدروں میں رخنہ گری ملک کے ساتھ بے وفائی نہیں ایسے محل پر دوستو رخنہ گری ہے خودکشی ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

ہندوؤں نے تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں ہی سے سیکھا انھوں نے اس کو سیکھ کر اپنے وطن کے عہد قدیم کی تاریخ کو ایک متمدن ترین قوم کی تاریخ بنا دی، مگر وہ جب اپنے اسی وطن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھتے ہیں، تو اس میں ہمدردی کے بجائے بے دردی کی رخنہ گری زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس غیر روحانی کے انسدادی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا ہم خاموش رہیں کہ ہمارا ماضی نفرت انگیز طریقہ پر پیش ہوتا رہے؟ یا ہم خود اپنے ماضی کی تاریخ کی مذہبی، روحانی، معاشرتی، نفسیاتی، اور سیاسی عظمت کو اس طرح پیش کریں کہ اس میں صداقت، واقعیت اور معروضیت کے آبدار موتی جھلملاتے بھی نظر آئیں، اور کسی کے شیشۂ دل میں بال بھی نہ آئے آج کل تاریخ لکھی نہیں جاتی ہے بنائی جاتی ہے، ہم اپنی تاریخ بنائیں نہیں، بلکہ لکھیں، تاکہ ہم بھی بنیں، اور ہمارا ملک بھی بنے،

معارف کا زیادہ تر حصہ لکھا جا چکا تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے بہت پرانے رکن تھے، ان کی وفات سے یہ ملک ایک شریف ترین انسان، ایک خلیق بزرگ، ایک اچھے دوست، اور ایک بہت ہی نامور مصنف سے محروم ہو گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، معارف کی آیندہ اشاعت میں ان شاء اللہ ان پر ایک مفصل مضمون ہوگا

مقالات

امیر خسروؒ اور افضل الفوائد

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

امیر خسروؒ نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے کچھ ملفوظات افضل الفوائد کے نام سے جمع کیے، مگر کچھ محققین ایسے بھی حال ہی میں پیدا ہوگئے ہیں جو اس خیال کے ہیں کہ اس کو امیر خسروؒ نے خود مرتب نہیں کیا بلکہ ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، اگر یہ پر زور طریقہ پر ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کو امیر خسروؒ نے جمع نہیں کیا تو اس سے زیادہ طاقتور طریقہ پر یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ امیر خسروؒ ہی نے اس کو ترتیب دیا۔

خواجگان چشت میں سے حضرت عثمان ہرونی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات کے مجموعوں کے ساتھ افضل الفوائد کو بھی سب سے پہلے پروفیسر محمد حبیب (سابق استاد تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انگریزی رسالہ مڈیول انڈیا کوارٹرلی (علی گڈھ) میں جعلی، نقلی اور فرضی قرار دیا، اس کا جواب راقم نے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۶۱ء کے معارف میں دیا، جو میری کتاب بزم صوفیہ کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں بھی شامل ہے، اس جواب سے یہ اثر ہوا کہ ایک علمی حلقہ ان ملفوظات کے مجموعوں کو قطعی طور پر جعلی، نقلی اور فرضی سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

۱۹۷۱ء میں دہلی کے رسالہ منادی کا حضرت بابا فرید نمبر شائع ہوا جس میں پروفیسر محمد حبیب کی آواز بازگشت پھر سنائی دی، جناب نثار احمد فاروقی، شعبۂ عربی دہلی کالج دہلی یونیورسٹی نے بھی راحت القلوب، اسرار الاولیا اور فوائد السالکین کو جعلی اور فرضی ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر جب انھوں نے خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی کی کتاب شمائل الاتقیا و دلائل الاشقیا میں راحت القلوب کا حوالہ دیکھا تو انھوں نے دسویں یا گیارہویں صدی میں راحت القلوب کے گڑھے جانے کے خیال سے رجوع کیا، مگر یہ بھی اسی کے ساتھ لکھا ہے کہ اگرچہ ابھی تک اس کتاب کے مستند ہونے کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ مطمئن نہیں ہوں (منادی حضرت امیر خسروؒ نمبر ص ۹۷) منادی کے امیر خسروؒ نمبر میں جناب نثار احمد نے امیر خسرو کی افضل الفوائد پر بھی بحث کی ہے، جس کے مطالعہ سے کوئی اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا ہے کہ انھوں نے اسکو اصلی قرار دیا ہے یا نقلی، اس کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو جعلی قرار دینا چاہتے ہیں، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں (یعنی افضل الفوائد اور راحت المحبین) کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا ہوں کہ بعض شواہد ان کے حق میں مل جاتے ہیں (ص ۷۷) پھر اسی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ یہاں میں نے دونوں کتابوں کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کر دیا ہے، جن دلائل کی بنیاد پر ان کتابوں کو جعلی سمجھا گیا ان کے ساتھ ہی وہ پہلو بھی پیش کر دیئے ہیں جن سے ان کا پایۂ استناد معتبر ہوتا رہا ہے لیکن جب تک ان دونوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے سامنے نہ ہوں، یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں قطعاً جعلی سمجھا جائے یا امیر خسروؒ کی مستند تصانیف میں ان کا شمار کیا جائے۔ ایک دشواری یہ ہے کہ ان کا متن تحقیق کے ساتھ مرتب ہو کر ابھی تک نہیں چھپا

اور جو تراجم شائع ہوئے ہیں، ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا (ص ۸۸)

جناب نثار احمد فاروقی کو اگر یقین تھا کہ افضل الفوائد جعلی ہے تو اس کو پروفیسر محمد حبیب کی طرح وثوق کے ساتھ ایسا ہی ثابت کرنا چاہئے تھا، اور اگر اس کے جعلی ہونے میں شک تھا تو اپنے اس مضمون کے شائع کرنے میں عجلت نہ کرتے، خواہ مخواہ اپنے ناظرین کو اس ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا کہ یہ جعلی بھی ہو سکتا ہے اور مستند بھی۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام ملفوظات کو جعلی ثابت کرنے کی مہم کیوں چلائی گئی ہے اگر ایسی ساری باتیں محض حقیقت پسندانہ تحقیق کی خاطر لکھی گئی ہیں تو ایسے محقق کے متعلق ہم کیا رائے دیں جنھوں نے ایسی ہی تحقیق کی آڑ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کربلا کا واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ امام حسین کربلا میں مدفون ہی نہیں، آج کل ایک حلقہ میں معروضیت سے بھری تحقیقی مہم جاری ہے کہ آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کو شاہجہاں نے نہیں بنوایا، بعض حلقوں میں تو یہ بھی ثابت کیا جا رہا ہے کہ امیر خسروؒ نہ صوفی تھے اور نہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، ایک صاحب نے تو یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جہاں مدفون ہیں وہ ان کا اصلی مرقد نہیں، کچھ ایسے بھی محققین ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت علاء الدین صابرؒ جیسے بزرگ کی کوئی شخصیت ہی نہیں، کلیر شریف میں ان کا مزار فرضی ہے، ایسی تحقیقات کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ بعض تلوار کے دھنی خواہ مخواہ فساد فی الارض برپا کر دیتے ہیں، اسی طرح قلم کے بعض پرجوش دھنی اپنی تحقیقی سرگرمیوں سے فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایت اور فساد فی الرسوخ فی العقیدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خواجگان چشت کے جن ملفوظات کو جعلی اور فرضی قرار دیا جاتا ہے، اس کا محض

قیاس ایک بہم اور غیر واضح بیان سے کیا جاتا ہے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مجموعۂ ملفوظات خیر المجالس کی مجلس یا زدہم میں ہے، کہ اس کے مرتب حمید قلندر نے عرض کیا کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس سرہٗ العزیز سے عرض کیا کہ

"من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ"

تو حضرت شیخ نے فرمایا

"او غلط گفتہ است من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند"

لیکن حمید قلندر نے فوائد الفواد کے جس ملفوظ کا ذکر کیا ہے وہ اس کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے۔ خواجگان ما نیز نہ کردہ اند (ص ۵۴)

اس راقم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ مجموعۂ ملفوظات کو کوئی مستقل تصنیف قرار نہیں دیتے تھے کیونکہ فوائد الفواد ہی میں ہے کہ انھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات جمع کیے جو شدہ تک ان کے پاس تھے (فوائد الفواد ص ۳۱، ۳۶) اور اگر انھوں نے جمع کیے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مرشد کے ملفوظات جمع کرنے کی روایت تھی، اور اگر جمع کرنے کی روایت نہیں تھی، اور ان سے پہلے کے خواجگان چشت اپنے ملفوظات کو جمع کرانا پسند نہ کرتے تھے، تو پھر خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے حسن سجزی کو اپنے ملفوظات جمع کرنے کی کیوں اجازت دی؟ اس سے تو ان کے مرشد، اور مرشد کے مرشد کی روایت کی خلاف ورزی ہوئی اور جب ان کے ملفوظات جمع ہوئے تو پھر ان کے پیشرو خواجگان چشت کے ملفوظات کے جمع ہونے سے انکار کیوں کیا جائے۔

ان ملفوظات کے منکرین بیسویں صدی عیسوی ہی میں پیدا ہوئے اس سے پہلے

ن مجموعوں کو کسی نے جعلی قرار دے کر رد نہیں کیا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؑ کے زمانہ
بلکہ اس سے پہلے بھی ان سے استفادہ کیا جاتا رہا، راقم نے ا . ب . سے بہت پہلے اس بات کی طرف
توجہ دلائی ہے کہ سیر الاولیا چشتیہ سلسلہ پر قدیم ترین تذکرہ ہے، اس کے مولف امیر خورد
امیر خسرو کے معاصر ہیں، ان کا جا بجا بیان ہے کہ

"در ملفوظات شیخ الاسلام شیخ معین الدین سجزی نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۶)

"کاتب حروف در ملفوظات حضرت شیخ الاسلام معین الدین قدس اللہ سرہ العزیز نبشتہ
دیدہ است (ص ۴۹)

"در بیان بعضے ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق قدس اللہ سرہ العزیز سلطان المشائخ
قدس اللہ سرہ العزیز بخط مبارک خود در قلم آوردہ . . . (ص ۴۷)

"بزرگے از ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز با نعمہ
کل جمع کردہ است، ازاں چند کلمہ آوردہ شد (ص ۷۶)

کیا یہ تحریریں جعلی ہیں اگر جعلی نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی
اور حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات مرتب ہوئے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات کا ایک مجموعہ مفتاح العاشقین
مرتبہ مولانا محب اللہ ہے، یہ مطبع مجتبائی دہلی میں چھپ گیا ہے، اس میں حضرت نصیر الدین
چراغ دہلی کی زبانی انیس الارواح (ص ۱۰) دلیل العارفین (ص ۳۰) و اسرار الاولیا
(ص ۱۵) کے حوالے موجود ہیں۔ مگر مفتاح العاشقین کو بھی خواہ مخواہ جعلی مجموعہ قرار دیا گیا ہے،
پھر ظاہر ہے کہ اس کی روایت کیسے قابل قبول ہوگی، جناب نثار احمد فاروقی نے خود اس
کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضرت امیر خسرو کے انتقال کے چودہ سال کے بعد حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے حکم سے شمائل الاتقیاء ودلائل الاشقیاء لکھی گئی ہے اس میں بھی انیس الارواح دلیل العارفینؒ فوائد السالکین راحت القلوب اسرار المبتدیین کے علاوہ راحت المحبین ملفوظ شیخ نظام الدین جمع تالیف امیر خسرو کا بھی ذکر ہے (ص ۸۷) شمائل الاتقیاء حیدرآباد میں [illegible] میں چھپ گئی تھی اسکے مطبوعہ نسخہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا ابتدائی زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ ہی کا تھا ان کی وفات ۷۸۲ھ میں یعنی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وصال کے ۵۷ سال بعد ہوئی ان کے مجموعۂ ملفوظات خوان پر نعمت میں صاف طور پر ذکر ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جمع کیا ہے۔ (ص ۸۸) اسی طرح ان کے مجموعہ ملفوظات مخ المعانی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کے حوالے ہیں (ص ۲۹-۵۱) ان سے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے استفادہ بھی کیا۔ پھر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی یہ ملفوظات رہے انھوں نے واضح طور پر اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے ملفوظات جمع کیے (ص ۲۵۱) اور حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ نے مکتوب کیے (ص ۵۲)

جب ان ملفوظات سے صدیوں تک استفادہ کیا جاتا رہا تو اب ان کو جعلی اور فرضی قرار دینا کہاں تک صحیح ہے اس راقم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی یہ اعادہ کرتا ہے کہ جن دلائل کے ساتھ خواجگان چشت کے ملفوظات جعلی قرار دیئے جارہے ہیں ان ہی کی روشنی میں فوائد الفواد خیر المجالس اور جوامع الکلم کا مطالعہ کیا جائے تو ان پر بھی ایک ناقد اپنی عیب جوئی اور خردہ گیری سے اسی قسم کے اعتراضات کرسکتا ہے جس طرح کہ خواجگان چشت کے ملفوظات پر کیے جارہے ہیں ایک حلقہ تصوف ہی کا منکر ہے اور تصوف کے سارے لٹریچر

ہر اسلامی کچھتا ہے تو پھر جو روحانی سرمایہ ہم کو ورثہ میں ملا ہے اس کو اپنی ذہنی عیاشی میں تحقیقات
کے نام پر دریا برد کرنے میں کون سی مفید خدمت ہوگی یہ سوچنے کی بات ہے۔

ملفوظات کے مذکورۂ بالا مجموعے کسی ریسرچ رو م میں قلمبند نہیں کئے گئے۔ ان کا انداز
بیان مورخانہ، محققانہ، اور ناقدانہ نہیں۔ ان میں جو باتیں قلمبند ہوئیں وہ مریدوں کی مجلسوں
میں کہی گئیں، جن کا انداز واعظانہ، ناصحانہ، اور معلمانہ ہوتا، مریدوں کے جذبات کو ابھارنے
اور ان کے احساسات کو متاثر کرنے کے لئے بعض اوقات ایسی تفسیر، ایسی حدیث، ایسی روایت،
ایسی کرامت، ایسے تاریخی واقعات، اور ایسے مشہور قصوں کا سہارا لیا جاتا جن کا سو فیصدی صحیح
ہونا ضروری نہیں ہوتا، اسی لئے مستند سے مستند مجموعۂ ملفوظات کو تاریخی تحقیق اور عقل کی خراد
پر چڑھا دیا جائے، تو اس میں بہت سی باتیں قابل قبول نہ ہونگی بعض تو ایسی ہیں جو موجودہ دور
کی کسی مجلس میں بیان نہیں کی جاسکتی ہیں، مثال کے لیے دیکھو فوائد الفواد مجلس سی دکیم ص
۱۳۰ لاہور ایڈیشن) مولانا اشرف علی تھانوی کے عہد میں روایت و درایت اور تحقیق و تنقیق
کا معیار بہت اونچا ہو چکا تھا، وہ اپنی ایک مجلس میں فرماتے ہیں۔

حضرت سلطان الاولیا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ کے ساتھ کسی مرید نے غلبۂ محبت
میں بار بار یہ شعر پڑھا۔

سرو سیمینا بہ صحرا می روی سخت بے مہری کہ بے ما می روی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

اس کا یہ اشعار پڑھنا تھا کہ سلطان جی کی نعش کو وجد ہوا اور ہاتھ کفن سے باہر اونچا ہوگیا،
اس پر لوگوں نے اس مرید کو خاموش کیا کہ یہ کیا غضب کرتے ہو قیامت برپا ہو جائے گی جنازہ
کے ساتھ خاموشی سے چلو، دیر میں سکون ہوا اور ہاتھ بدستور کفن کے اندر ہو گیا، دیکھئے اہل محبت

کو موت کے بعد بھی کیسی بے فکری حاصل ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی وجد و حال باقی رہا۔

(خیر الحیات و خیر الممات ص ۵۰)

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا

قاضی ضیاء الدین سنامی حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدین کے ہم عصر ہیں سلطان جی صاحب سماع تھے قاضی سنامی ان کو سماع سے منع کرتے تھے ایک بار قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ سلطان جی کے یہاں سماع ہو رہا ہے تو وہ اپنی فوج کو ساتھ لے کر روکنے آئے یہاں پہنچ کر دیکھا تو ایک شامیانہ قائم تھا اور اس کے اندر سلطان جی کی جماعت کا اس قدر ہجوم تھا کہ قاضی صاحب کو اندر جانے کی جگہ نہ ملی انھوں نے حکم دیا کہ خیمہ کی طنابیں کاٹ دو تاکہ مجمع منتشر ہو جائے فوج نے خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں مگر خیمہ اسی طرح ہوا پر معلق رہا مگر انہیں قاضی صاحب نے اپنی جماعت سے فرمایا کہ اس سے دھوکہ نہ کھانا بدعتی سے خوارق کا صدور ہو سکتا ہے اور یہ موجب قبول نہیں اس وقت تو وہ واپس ہو گئے دوسرے وقت حضرت سلطان جی کے مکان پر گئے اور فرمایا کہ تم سماع سے توبہ نہ کرو گے، سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوا دیں جب تو تم منع نہ کرو گے کہا اچھا پچھوا دو، قاضی صاحب کو سلطان جی کی بزرگی کا علم تھا جانتے تھے کہ یہ حضور کی زیارت کرا سکتے ہیں اس لیے سوچا کہ اس دولت کو کیوں چھوڑا جائے، سلطان جی نے ان کی طرف توجہ کی تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت مکشوف ہوئی کہ حضور ان سے فرما رہے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو (الحدود والقیود ص ۱۳)

کیا یہ روایتیں صحیح ہیں اگر صحیح نہیں تو پھر کیا ایسی کتابیں جن میں یہ درج ہیں جعلی قرار دی جائیں گی اگر افضل الفوائد جعلی ہے تو اس سوال کا کیا جواب ہے کہ کسی نے اس کو اتنی محنت سے مرتب

کرنے کے بعد امیر خسرو سے کیوں منسوب کر دیا؟ ان سے منسوب کرنے میں کیا غرض تھی؟ کیا ان کا رتبہ بڑھانا مقصود تھا؟ ان میں کس چیز کی کمی تھی جو اس کے انتساب سے ان کا رتبہ بڑھ جاتا؟ اور پھر وہ کون سے ایسے صوفیائے کرام کی جماعت تھی جو ملفوظات کے مجموعوں کے گڑھنے کی مہم میں مشغول رہی اور کسی کو کانوں کان ان کی خبر نہیں ہوئی اور اب تک بڑے بڑے پروفیسر اور محققین کو یہ سراغ نہ مل سکا کہ ان مجموعوں میں جو روایتیں ہیں وہ آخر کہاں سے سرقہ کی گئیں اکا دکا روایتوں کی مماثلت سرقہ کی کوئی دلیل نہیں، کسی روایت کو کسی دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں دہرایا جانا بھی سرقہ کا ثبوت نہیں بزرگانِ دین ایک ہی روایت کو بار بار دہرایا کرتے تھے۔

ایک عرصہ تک عام خیال تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا، جس کو نولکشور پریس نے چھاپ بھی دیا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس دیوان کی اکثر غزلیں مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد فراہی کی تصانیف معارج النبوت اور تفسیر فاتحہ میں بھی پائی جاتی ہیں، تو پھر یقین ہو گیا کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے نام سے جو مجموعۂ کلام چھاپا گیا ہے وہ در اصل ان کا نہیں، اسی طرح سلاطین دہلی کے عہد کا ایک شاعر تاج الدین ریزہ کے مجموعۂ کلام میں انوری کے بہت سے اشعار شامل کر دیئے گئے تھے، لیکن اہل نظر نے اس کی طرف توجہ دلائی تو پھر تاج الدین ریزہ کے بجائے یہ اشعار انوری کے سمجھے گئے۔ اسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ افضل الفوائد کی اکثر و بیشتر باتیں دوسرے ملفوظات میں ہو بہو اور لفظاً بہ لفظ ملتی ہیں تو یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ اس کو امیر خسرو نے ترتیب نہیں دیا، مگر محض قیاسات، ظنیات، ماہرانہ تاویلات اور "قوی تر شبہات" کی بنا پر ان کو جعلی قرار دینا بے انصافی ہے یہ دلیل نا قابل قبول ہے کہ اس کا حوالہ فوائد الفواد، درر نظامی، خیر المجالس وغیرہ جیسی قدیم تالیفات میں نہیں پایا جاتا، حضرت

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فیوض و برکات سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہو گیا وہ وارث النبی فی الہند ہو کر یہاں جلوہ افروز رہے مگر طبقات ناصری تاج المآثر اور فخر مدبر کی تاریخ مبارک شاہی جیسی معاصر تاریخوں میں انکے کارناموں کا مطلق ذکر نہیں ان کا اسم گرامی بھی ان تاریخوں کے صفحات میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا اب کوئی عیب جو اہل قلم یہ دعوی کرے کہ ان کے کارناموں کو بعد کے تذکرہ نگاروں نے محض گڑھ لیا ہے تو یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی روحانی تاریخ پر شدید ضرب کاری لگائی ہو گی۔

منادی کے امیر خسرو نمبر میں بڑے وثوق کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات میں فوائد الفواد کے علاوہ ایک مجموعہ انوار المجالس سید محمد امام بن خواجہ بدر الدین اسحاق دہلوی نے مرتب کیا تھا تیسرا عزیز الدین صوفی نے تحفۃ الابرار وکرامۃ الاخیار ترتیب دیا اسے بھی حضرت نظام الدینؒ نے ملاحظہ فرما کر تصحیح کی تھی چوتھا مجموعہ حضرت کے بھانجے ابو بکر مصلی بردار کے فرزند عبد العزیز نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا نام مجموع الفوائد رکھا تھا پانچویں کتاب ملفوظات المشائخ تھی جسے خواجہ شمس الدین دھاری نے ترتیب دیا تھا۔ زبان عربی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات پر ایک تالیف خلاصۃ اللطائف مولانا علی بن محمود جاندار نے لکھی تھی جس کا ایک اقتباس سیر الاولیا میں موجود ہے اور وہیں سے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے ساتواں مجموعہ درر نظامی ہے اس کے مولف یہی علی بن محمود جاندار ہیں اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا (ص ۷۰)

اگر یہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کے اصلی ملفوظات ہیں تو کیا ان کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ اطمینان کر لیا گیا ہے کہ ان سب کے حوالے فوائد الفواد درر نظامی خیر المجالس

برالاولیاء اور جوامع الکلم جیسی قدیم تالیفات میں پائے جاتے ہیں کیا یہ اسرائیلیات، قصص الانبیاء، اقتباسات، مافوق الفطرۃ عناصر، غیر معمولی معجزات و کرامات اور مبالغہ آمیز فضائل سلسل داستانوں سے خالی ہیں؟ کیا ان میں تاریخیں قلم بند کرنے کا وہی اہتمام ہے جو فوائد الفؤاد میں پایا جاتا ہے؟ کیا ان سے فوائد الفواد ہی کی طرح زندگی کی مہک، دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل ہوتا ہے؟ کیا ان میں جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر غلط ہونے کے بجائے بالکل صحیح ہیں۔

اگر کوئی عیب جو اور خردہ گیر ناقد ان ملفوظات میں کچھ تھوڑی بہت باتیں وہی نکالدے جو مذکورۂ بالا ملفوظات خواجگان چشت میں نکالی جارہی ہیں تو کیا یہ سب ملفوظات جعلی قرار دیدیے جائینگے اور اگر یہ جعلی نہیں ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے ملفوظات جمع کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی پھر امیر خسرو اس اجازت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے خصوصاً جب ان کو اپنے مرشد سے سرشارانہ اور والہانہ محبت تھی ان کو امیر حسن سجزی کی فوائد الفواد پر اس حد تک رشک تھا کہ وہ کہہ اٹھے تھے کہ کاش امیر حسن سجزی ان کی تمام تصانیف ان سے لیتے اور فوائد الفواد ان کی طرف منسوب کردیتے (سیر الاولیا ص ۳۰۸) اگر اسی رشک میں انھوں نے بھی اپنے مرشد کے ملفوظات کو جمع کرنا شروع کیا تو اس میں شک کیوں پیدا کیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا مجموعہ فوائد الفواد کی طرح مقبول نہ ہوا وہ قصیدوں اور مثنویوں کے لکھنے میں اساتذۂ فن کا مقابلہ کرتے رہے اگر اسی جذبہ سے وہ اپنے پیر بھائیوں کے مقابلہ میں اپنے مرشد کے مجموعۂ ملفوظات لکھنے لگے تو تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں، وہ اپنے مرشد کے ساتھ برابر رہتے ان کے ملفوظات کو جمع کرنے کا شوق نہ پیدا ہوتا تو یہ تعجب کی بات ہوتی، یہ کہہ کر کہ فوائد الفواد میں امیر خسرو کا

نام صرف ایک جگہ ضمناً آیا ہے، ورنہ وہ حاضرینِ مجلس کے درمیان بھی نظر نہیں آتے۔ اگر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امیر خسرو اپنے مرشد کی مجلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوتے تھے، تو دونوں کے روحانی تعلقات پر خاک ڈالنا ہے، جب وہ اپنے مرشد کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے تو ان کے ملفوظات کو اگر قلمبند کیا تو یہ کون سی بعید از قیاس بات ہے، یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ امیر خسرو

> خزائن الفتوح میں تو بہت ہی مرصع نگار ہیں، لیکن اعجازِ خسروی کے رسائل میں انھوں نے فارسی نثر کے جو نمونے پیش کیے ہیں، ان میں کسی کا اسٹائل بھی افضل الفوائد سے نہیں ملتا، اگر یہ کہا جائے کہ امیر خسرو نے جیسا سنا ویسا ہی قلمبند کیا ہے جو عموماً جامعین ملفوظات کرتے بھی ہیں تو افضل الفوائد کے اسلوب کو فوائد الفواد کے طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیے۔" (ص ۸۴)

اس کے کہنے میں جو اعتراض وارد ہوتا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اوپر کی عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر جیسا سنا گیا ویسا ہی قلمبند کیا گیا تو پھر اس کا اسلوب فوائد الفواد سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

اگر خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کے مجموعوں کے اصلی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کا اسلوبِ بیان فوائد الفواد سے مشابہ ہو تو پھر خواجہ صاحب کے ان ملفوظات کے مجموعوں کا اسلوب بیان بھی فوائد الفواد ہی کی طرح ہونا ضروری ہے، جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اگر ان کا ایسا ہی اسلوب بیان ہے تو پھر یہ فوائد الفواد کی طرح مقبول کیوں نہیں ہوئے اور اب تک لوگوں کی نظروں سے کیوں ایسے اوجھل رہے کہ صدیوں کے بعد ان کی نشاندہی کرنی پڑی، افضل الفوائد کے ناقدوں کے لیے شاید یہ بات قابلِ قبول نہ ہو، اگر یہ کہا

جائے کہ حسن سجزی کی علمی و ادبی سرگرمیاں امیر خسرو کے مقابلہ میں کم رہیں، ان کو کافی فرصت میسر تھی، اس لیے فوائد الفواد کو محنت سے مرتب کیا، اس کی نوک پلک کو درست کرنے میں برابر لگے رہے، امیر خسرو کا علمی و ادبی ذہن تو ایک مشین سے کم نہ تھا۔ اس سے جو سانچہ ڈھل کر نکل گیا اسی پر انھوں نے اکتفا کیا، ان کے اہم ترین قصائد ہوں یا نظمیں اور مثنویاں ہوں، ان پر کبھی ان کو نظر ثانی کر کے ترمیم، تنسیق یا اضافہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، جو جیسا ایک بار لکھ گیا وہی لوگوں کے سامنے آ گیا، یہی بات افضل الفوائد کے متعلق کہی جا سکتی ہے، امیر خسرو نے اس کو مرتب کر دیا، پھر ان کو اسکی فکر نہیں رہی کہ اس کا اسلوب فوائد الفواد کے برابر ہے کہ نہیں۔

افضل الفوائد پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کی مجلسوں کی بیشتر تاریخوں کا مقابلہ تقویم سے کیا گیا تو مطابقت نہیں پائی گئی، مگر یہ اعتراض اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب جس تقویم سے مقابلہ کیا جائے اس کو بالکل صحیح اور مستند تسلیم کر لیا جائے۔

اعتراض ہے کہ ۱۲ محرم ۷۱۱ھ تو تقویم کے لحاظ سے شنبہ ہونا چاہیئے، مگر وہاں یعنی افضل الفوائد میں اس تاریخ کو دن چہارشنبہ بتایا ہے (ص ۸۳) دار المصنفین میں جو قلمی نسخہ ہے اس میں بتاریخ دوازدہم روز شنبہ ماہ محرم الحرام ۷۱۱ھ ہی مرقوم ہے، اور بعد کی تاریخ بستم ماہ محرم ۷۱۱ھ روز یکشنبہ لکھی ہوئی ہے، اس طرح جس نسخہ میں چہارشنبہ دیکھا گیا ہے وہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان ملفوظات کی کتابت میں لاپروائی برتی گئی، جس سے غلط فہمی پیدا ہوئی، اگر مختلف نسخوں کو ملا کر ایسی غلطیاں دور کر دی جائیں تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو، اور اگر تقویم کے لحاظ سے روز کا کہیں فرق ہو تو اس کو قمری مہینوں میں چاند کے ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کے دیکھنے کا فرق سمجھا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی سوچنے

کی بات ہے کہ جو جعل ساز ایسے ملفوظات مرتب کر سکتا ہے جن سے صدیوں تک لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتے ہیں وہ تاریخ اور سنین قلمبند کرنے میں کیوں غیر محتاط اور لاپرواہ ہو سکتا ہے؟

افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی ایک قوی ترین شہادت یہ پیش کی گئی ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین کی ایک محفل سماع میں مولانا جمال الدین ہانسوی کی بھی موجودگی دکھائی گئی ہے جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے، پھر ان کے ساتھ ہی محفل سماع میں رقص کرنے والے شیخ عثمان سیاح ہیں جو شیخ جمال ہانسوی سے عمر اور مرتبہ میں بہت کم تھے ان کے ساتھ محفل سماع میں وجد کرنا ادب کے خلاف تھا۔ (ص ۲۸۲) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مولانا جمال الدین ہانسوی حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ اول نہ تھے، بلکہ اسی نام کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، تو پھر یہ اعتراض جاتا رہتا ہے، اسی لیے یہ لکھنا صحیح تھا کہ وہ آئے، اور آداب بجا لا کر بیٹھ گئے، اور ایسے کہ جملہ حاضرین مجلس کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئے،

یہ جواب اس خیال سے رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض حسن ظن پر مبنی ہے مگر خواجگان چشت کے ملفوظات کو جعلی قرار دینے والوں کو اس خیال سے متفق ہونے میں تامل اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ ان کے سارے اعتراضات ظنیات ہی پر مبنی ہیں مگر اوپر کا بیان ظنیات سے خالی بھی ہے کیونکہ فوائد الفواد میں کئی جمال الدین مثلاً مولانا جمال الدین (ص ۱۸) جمال الدین نیشاپوری (ص ۱۰۹) اور خواجہ جمال ملتانی (ص ۱۵۳) کا ذکر ہے، ۷۰۷ھ کی مجلس دہم میں ہے۔

"جمعے از عزیزان چوں مولانا وجیہ الدین پائلی و مولانا حسام الدین حاجی و مولانا تاج الدین یارانہ و مولانا جمال الدین و یاران دیگر حاضر بودند (ص ۱۸)

ممکن ہے کہ یہی مولانا جمال الدین مراد ہوں، ہانسوی کا اضافہ غلطی سے ہو گیا ہو۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ افضل الفوائد اور فوائد الفواد کی قریبی مجلسوں میں نہ وہ شخصیات نظر آتی ہیں، نہ وہ موضوعات ہیں جو امیر خسرو کے مرتب کردہ ملفوظات میں ملتے ہیں (ص ۴۸) اسی قسم کے ملفوظات کے نہ ہونے پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں، عام طور سے نئے موضوعات ہی زیادہ قلمبند کرنے کی کوشش کی جاتی مگر افضل الفوائد اور فوائد الفواد میں ملے جلے موضوعات کی کمی بھی نہیں، نماز عید الفطر، اصحاب سلوک، تصوف، توبہ، محبت، صبر، نفس درویشی، سماع اور مختلف قسم کی نفل نمازوں پر دونوں مجموعوں میں ملفوظات ملیں گے مگر مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بالکل ملے جلے ہیں تو یہ کہا جائے گا کہ یہ سرقہ ہے اگر یہ ملے جلے نہیں ہیں تو کہا جائے گا کہ ویسے کیوں نہیں، اور اگر کچھ مختلف ہیں تو کہا جائے گا کہ یہ الحاقی ہیں، اس لیے کہ یہ فوائد الفواد میں نہیں ہیں، ان دلائل کے تشفی بخش جوابات کسی گوشہ سے نہیں مل سکتے،

یہ اعتراض بالکل بے جا ہے کہ افضل الفوائد میں وہ شخصیات نہیں ہیں جو فوائد الفواد میں ہیں افضل الفوائد میں جن حاضرین کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا جمال الدین، شیخ عثمان سیاح، مولانا برہان الدین غریب، شیخ حسین نبیرۂ شیخ بختیار اوشی، حسن سجزی، خواجہ عزیز ایبک، مولانا نصیر الدین کتابی، مولانا محمد، شیخ یوسف اور مولانا علاء الدین چندیری وغیرہ

فوائد الفواد کی شخصیات یہ ہیں: او

مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا حسام الدین حاجی، مولانا تاج الدین، مولانا جمال الدین، مولانا سراج الدین حافظ بدایونی، مولانا برہان الدین غریب، مولانا محمود اودھی، وغیرہ

افضل الفوائد میں شخصیات زیادہ ہیں، مگر کچھ مشترک بھی ہیں، افضل الفوائد میں زیادہ شخصیات ہونے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں اسماء کے لکھنے میں فوائد الفواد سے نسبتاً زیادہ توجہ کی گئی ہے فوائد الفو

میں بعض اوقات بہت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے، بعض مجلسوں کا ذکر چند سطروں میں ختم کر دیا گیا ہے، ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں دوسرے مجموعہ میں ذرا تفصیل سے ملتی ہیں جس سے تشنگی فرو ہو جاتی ہے، مگر کچھ ناقدین ایسے ہیں جو یہ کہنے میں تامل نہیں کریں گے کہ جعلی ملفوظات میں اس ایجاز کا اطناب کر دیا گیا ہے، مگر یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ فوائد الفواد سے پہلے کے ملفوظات میں تفصیل موجود تھی، اس لیے فوائد الفواد میں اختصار سے کام لیا گیا، اختصار سے کام لینے کی وجہ یہ بھی ہے کہ حسن سجزی خود اختصار پسند تھے، اسیلئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی باتیں بھی اختصار سے لکھیں، یہ ان کی نثر نگاری کا اپنا انداز تھا، امیر خسرو کے یہاں نہ ان کی شعر و شاعری اور نہ ان کی نثر نگاری میں ایجاز ہوتا اطناب ہی اطناب ہوتا اسی لیے فوائد الفواد اور افضل الفوائد کے طرز نگارش میں یہ فرق ہونا تعجب انگیز نہیں، یہ حضرت خواجہ کے تخاطب کا اختلاف نہیں بلکہ ملفوظات کے قلبند کرنے کے طرز کا اختلاف ہے

ایک اعتراض یہ ہے کہ جب امیر خسرو نے افضل الفوائد کا مسودہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملاحظے کے لیے پیش کیا، تو اس وقت حضرت خواجہ نے جو کچھ فرمایا وہ فوائد الفواد ہی کی عبارت ہے، اعتراض کے الفاظ یہ ہیں "ان دونوں بیانوں کا لفظاً ومعناً ایک ہونا خاصا قوی شبہہ پیدا کرتا ہے" (ص ۸۳)

اب ہم ناظرین کے لیے دونوں کی عبارتیں پیش کرتے ہیں

افضل الفوائد: ان روز بندہ چند چیز دکاغذ کہ الفاظ در ربار گوہر نثار خواجہ راستین را قلم آوردہ بود پیش نظر مخدوم عالمیان بداشت وعرضداشت کرد کہ امروز مدتست کہ این بیچارہ ہرچہ از زبان مخدوم می شنود تا آنجا کہ در اوراک فہم یاری می دہد آن را می نویسد و افضل الفوائد نام کردہ است، چون بندہ این عرضداشت

کرد بر دست مبارک گرفت و بشرف مطالعہ شرف داد، در محلیکہ می رسید می فرمود کہ نیکو بنشتہ و نام هم نیکو نهاده و آنجا کہ سخن از بنده ترک شده بود بر دست شریف بہ قلم مبارک آن جا را صحیح می کرد و بعد ازان رو بہ سوے حاضراں کرد و گفت کہ از خسرو بسیار است کہ این قدر فوائد بہ قلم آورده است، آنکہ ہمہ وقت آن در بحر معانی از سر تا پا غرق است، اما حق سبحانہ تعالے ہمہ اعضائی خسرو در معانی بکف می آرد و از آنجا می نویسد بعد ازان خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بنده نواز شکستہ پروری و بنده نواری کرده، بنده را بہ نواخت، بنده بر خاست و سر بر زمین نہاد و گفت کہ در فہم این بے چاره بخاطر جائے می دہد بہ برکت قوت اکرام مخدوم عالمیانست، بہ نظر مبارک این بے چاره را پرورش می دہد الحمد اللہ علی ذالک، بعد ازان خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کلاه خاص و پیراہن خاص بر بنده عطا کرده بعد ازان سخن و بزرگی شیخ معین الدین سجزی افتاد حکایت فرمود کہ آن روز شیخ معین الدین بخدمت شیخ عثمان ہارونی نور اللہ مرقدہ پیوست و بیعت آورد و نیز بر فوائد کہ از زبان گوہر بیان شیخ می شنید آن را بہ قلم می آورد (ص ۱۶۳-۱۶۲، قلمی نسخہ دار المصنفین)

فوائد الفواد: چہارم شنبہ بست و چہارم ماه مبارک محرم سنہ اربع عشرہ و سبعمائیہ سعادت پائبوس آمد آن روز جلد اول کہ ہم ازین فوائد الفواد جمع کرده شده است بہ حکم فرمان پیش برد چون مطالعہ فرمود شرف استحسان ارزانی داشت و فرمود کہ نیکو نبشتہ ای و درویشانہ بنشتہ ای، و نام ہم نیکو کرده ای (ص ۱۹۸-۱۹۹، لاہور اڈیشن)

اب ہمارے ناظرین دونوں عبارتوں کو خود پڑھیں، اور فیصلہ کریں کہ دونوں بیانات لفظاً و معناً ایک ہیں یا بالکل مختلف ہیں، ایک میں بات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہے، دوسرے میں بہت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے، صرف دونوں میں نیکو بنشتہ ای و نام ہم نیکو کرده ای"

کے لکھ جانے سے سرقہ کا الزام رکھ دینا کیا صحیح ہوگا؟ نام ہم نیکو کردہ ای اورنام ہم نیکو نہادۂ میں بھی فرق ہے

اگر یہ کہا جائے کہ بعض مصنفوں نے خود افضل الفوائد سے ملفوظات لفظاً و معناً نقل کیے ہیں، تو تعجب کرنے کی بات نہ ہونی چاہیئے مثلاً سیر الاولیا کے مولف امیر خسرو کے معاصر ہیں انھوں نے جو عبارتیں افضل الفوائد سے نقل کی ہیں ان کے کچھ نمونے یہاں پر درج کیے جاتے ہیں

افضل الفوائد	سیر الاولیاء
دست بہ کف دست نمز نند کہ آن بلہوی ماند بلکہ پشت دست بر کف دست بزنند یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است پس در منع مزامیر بطریق اولی بعد ازان فرمود کہ اگر یکے از مقامے بیفتد باری باید کہ در شرع افتد مبادا اگر از شرع بیرون افتد پس او را چہ ماند بعد ازاں فرمود کہ سماع مشایخ کبار شنیدہ اند آنکہ اہل ایں کار اند و کسیکہ صاحب ذوق است و درد	پشت دست بر کف دست زنند و کف دست بر کف دست نزند کہ آن بلہوی ماند تا این غایت ا ملاہے و امثال پرہیز آمدہ است در سماع طریق اولے کہ ازیں با ب نباشد یعنی در منع دستک چندیں آمدہ است پس در سماع مزا بطریق اولے منع است بعد ازا فرمود کہ سماع مشائخ شنیدہ اند اہل ایں کار اند و آں کس درد و ذوق است کہ بہ یک کہ از گویندہ شنود او را وقتے پیدا آید اگ درمیان باشد یا نباشد اما انکہ از عالم خبر ندارد اگر پیش ا

در دست بہ یک بیت کہ از گویندہ بشنود او را وقتی پیدا شود اگرچہ در میان مزامیر باشد یا نباشد اما آنکہ در عالم ذوق خبر ندارد اگر پیش او گویندگان باشند و از ہر جنس مزامیر باشد چہ شود چون او از اہل درد نیست پس معلوم شد کہ کار تعلق بہ درد دارد نہ مزامیر (قلمی نسخہ دارالمصنفین ص ۸۵ ا)

گویندگان باشند از ہر جنس، مزامیر باشد چہ سود دارد چون از اہل درد نیست پس معلوم شد کہ کار تعلق بہ درد دارد نہ بہ مزامیر (سیرالاولیا ص ۵۲۲-۵۲۳)

دریں محل فرمود کہ وقتی خواجہ ابراہیم ادہم را سوال کردند کہ اسم اعظم یاد داری بگو کدام است جواب داد کہ معدہ را از لقمہ حرام پاک دار و دل را از محبت دنیا خالی کن بعد ازان کہ ہر اسمی کہ خواہی اسم اعظم ...

می فرمود از خواجہ ابراہیم سوال کردند کہ اسم اعظم یاد داری بگو جواب گفت معدہ را از لقمہ حرام پاک دار و دل از محبت دنیا دور کن بعدہ بہر اسمے کہ خدا اسے را بخواہی ہمان اسم اعظم است (ص ۲۶۷)

اسی قسم کے اور نمونے ملیں گے اگر یہ خیال ہو کہ افضل الفوائد میں سیر الاولیا
سے ایسی روائیتیں لی گئی ہیں تو یہ صحیح نہیں کیونکہ سیر الاولیا میں فوائد الفواد اور
تاریخ فیروز شاہی سے بلا تکلف عبارتیں لفظاً و معناً نقل کر لی گئی ہیں مثلاً

فوائد الفواد

فرمود کہ چوں من این سخن از اں
درویش شنیدم با خود مقرر کردم کہ
دریں شہر نباشم، چند جائے
دل من می شد کہ بردم، لختے،
دل کردم کہ در قصبۂ پٹیالی
بردم در آں ایام ترک
آنجا بودہ است مقصود
ازیں ترک امیر خسرو بود
رحمہ اللہ باز فرمود کہ
یک دل کردم کہ در پنالہ
بردم کہ موضع منزہ است
الغرض در پنالہ رفتم سہ روز
آنجا بودم دریں سہ روز
ہیچ خانہ نیافتم نہ کرایہ و
نہ گروی نہ بہای دریں سہ

سیر الاولیاء

می فرمود چوں من این سخن از اں
کہ درویش شنیدم با خود مقرر کردم کہ
کہ دریں شہر نباشم، چند جائے دل
من شد کہ بردم لختے دل کردم کہ
در قصبۂ پٹیالی بردم در آں ایام
ترک آنجا بودہ است مقصود ازیں
ترک امیر خسرو بود. یک
دل کردم در پنالہ بروم کہ موضع
نزدیک است الغرض در پنالہ رفتم
سہ روز آنجا بودم ہیچ خانہ
نیافتم نہ گروی نہ کرای دریں سہ روز
مہمان کی بودم چوں از انجا باز گشتم
ایں اندیشہ در خاطر می بود تا وقتے
جانب حوض رانی بودم در باغے کہ
آن را باغ جسرت گویند با خدائے

روز مہر روز مہمان یکی بودم
چون اندر آنجا باز گشتم این
اندیشہ در خاطر می بود تا وقتی
جانب حوض رانی بودم در
باغی کہ آن را باغ جسرت
گویند با خدائے عز و جل مناجات
کردم وقتے خوش بود گفتم کہ
خداوندا مرا می باید کہ ازین شہر
بروم و جاے باختیار خود
نمی خواہم آنجا کہ خواست تو
باشد آنجا باشم! درین
میان آواز غیاث پور آمد
من ہیچ وقت غیاث پور را
ندیدہ بودم و نمی دانستم کہ
غیاث پور کجاست چون این
آواز شنیدم بر دوستی رفتم ان
دوست را نقیبی بود نیشاپوری
چون در خانۂ او رفتم مرا گفتند او
در غیاث پور رفتہ است من

مناجات کردم وقتے خوش بود
گفتم کہ خداوندا! مرا می باید کہ
کہ ازین شہر بروم و جائے باختیار
خود نمی خواہم آنجا کہ خواست تو
باشد آنجا باشم، درین میان آواز
آمد کہ غیاث پور رو من ہیچ وقتے
غیاث پور را ندیدہ بودم و نمی
دانستم کہ غیاث پور کجاست چون
این آواز شنیدم بر دوستے رفتم
ان دوست را نقیبے بود نیشاپوری
چون در خانہ او رفتم مرا گفتند
کہ در غیاث پور رفتہ است من
با دل خود گفتم کہ این آن غیاث پور
است الغرض با او شدہ در غیاث پور
آمدم آن روز آن مقام
ہم چنین آبادان نبود موضعے
مجہول بود ساکن شدم سکونت
کردم تا آن نگاہ کہ کیقباد
کہ در کیلو کہری ساکن شد دران

با دل خود گفتم این ہماں غیاث پور
است الغرض در غیاث پور
آمدم آں روز این مقام
میان آبادان بنوده است
موضعی مجہول بود و خلق
اندک بیا مدم و سکونت
کردم تا آنگاہ کہ کیقباد در
کیلوکری ساکن شد در آن
عہد خلق این جا انبوه شد از
ملوک و امراد و غیر آں آمده شد
خلق بسیار شد من با خود گفتم کہ
ازیں جا ہم بباید رفت دریں
اندیشہ بودم تا بزرگی کہ استاد
من بود در شہر وفات کرد من
با دل خود راست گرفتم کہ فردا کہ
از وفات او سوم خواہد بود من
بر زیارت او بروم و ہم شہر در نباشم
ایں عزیمت بر خود مقرر کردم ہماں روز
نماز دیگر جوانی در آمد صاحب حسنی اما

ایں جا خلق انبوه شد از ملوک و امرا
و غیر آں آمد و شد خلق و مزاحمت
ایشاں بسیار شد با خود گفتم ازیں جا
باید رفت دریں اندیشہ بودم ہماں
روز نماز دیگر جوانے در آمد صاحب
حسنے اما نزار گشتہ واللہ اعلم از
مردان غیب بود یا کہ بود الغرض چوں
بیامد اول سخن با من ایں گفت
آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمای عالمی خواہی شد
امروز کہ زلفت دل خلقی بربود
در گوشہ نشستنت نمی دارد سود

(ص ۱۱۱ - ۱۱۰)

رارگشتہ واللہ اعلم از مردان غیب بود باکہ
بود الغرض چو بیامد اول سخن کہ بامن گفت ابن
آن روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائی عالمی خواہی شد
امروز کہ زلفت دل خلقی بربود
درگوشہ نشستنت نمی دارد سود (ص ۲۴۳-۲۴۲)

تاریخ فیروزشاہی

الفضل والکمال والفنون والبلاغ صوفی مستقیم الحال
بود و بیشتری عمر او در صیام و قیام و تعبد و قرآن
خوانی گذشتہ است و بہ طاعت متعدیہ مولانا معہ بگانہ شدہ
بود و دایم روزہ داشتی و از مریدان خاصہ شیخ بود
و آنچنان مریدی معتقد من دیگری راندیدہ ام
و از عشق و محبت نصیبے تمام داشت و صاحب سماع

سیرالاولیاء

الفضل والکمال والفنون والبلاغ صوفی
مستقیم الحال بود و بیشتر عمر او در
صیام و قیام و تعبد و تلاوت گذشتہ
است از مریدان خاصۂ حضرت
المشائخ شیخ الشیوخ العالم سید نظام الحق
والدین محمد احمد بداونی البخاری
الچشتی قدس اللہ سرہ العزیز بود
و آنچنان مرید و معتقد من دیگرے
راندیدم و از عشق و محبت ا
نصیبے تمام داشت و صاحب سماع
و وجد و صاحب حال بود
و در علم موسیقی کمال داشت و ہرچہ

وصاحب وجد و صاحب حال بودہ در علم موسیقی گفتن و ساختن کمالی داشت و ہر چہ نسبت بہ طبع لطیف و موزون گفتند باری تعالیٰ اورا درآں ہنر سر آمدہ گردانیدہ بود و وجودے عدیم المثال آفریدہ و در قردن متاخر از نوادر اعصار پیدا آوردہ (ص ۳۵۹)

نسبت طبع لطیف و موزوا تعالیٰ اورا دران ہنر گردانیدہ بود و وجودے آفریدہ و در قردن م نوادر اعصار پیدا آوردہ

مذکورۂ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ سیرالاولیا کے مولف نے جبر فوائد الفواد اور تاریخ فیروز شاہی سے عبارتیں لے لی ہیں اسی طرح سے بھی لی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پیش نظر یہ مجموعۂ ملفوظ اور وہ اس کو مستند سمجھے۔ (با

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

(حصہ دوم)

جس میں مرزا غالب کی شاعری کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے سلسلۂ غالبیات میں ایک مفید اضا

مرتبہ سید صباح الدین عبد

جمالی
لودی اور مغل دور کا شاعر

(۲)

از ڈاکٹر ظفر الشدی مرحوم، مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

مثنوی مہر و ماہ | اس مثنوی کا صرف ایک مخطوطہ دستیاب ہے، جو پنجاب یونیورسٹی میں ہے،[1] یہ ۱۱۰ اوراق پر مشتمل ہے، اس کے پہلے تین ورق غائب ہیں، علاوہ ازیں، شعر:-

چون مہر مہر در زد ذرہ در خاک | بجان سرگشتہ گرد سوے افلاک

سے شعر:-

چو مہرش دید یکسو گشت از ماہ | کہ آن سیارہ را بر مہ دیدہ راہ[2]

تک (از ورق ۷، الف تا ۸ ب) مکرر لکھے ہوئے ہیں، اس طرح اصل کتاب کی ضخامت ۱۱۳ ورق رہ جاتی ہے، یہ شاہ بدخشاں کے لڑکے ماہ اور مینا کے حکمراں کی لڑکی مہر کی داستان ہے، ماہ خواب میں مہر کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے،[3] عشق میں خورد و نوش ترک اور نیند غائب ہو جاتی ہے،[4] جب یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عشق کا کرشمہ ہے تو اُسے ملک مینا جانے کی اجازت ملتی ہے، اور وزیر کا لڑکا عطارد[5] اور ایک بڑا لشکر اس کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، راستے میں کشتیاں طوفان کی نذر ہو جاتی ہیں، لشکر تتر بتر ہو جاتا ہے،[6] ماہ و عطارد بھی بچھڑ جاتے ہیں، بالآخر ماہ کوہ قاف پہونچ جاتا ہے، جہاں طرابلس کے قلعہ میں اس کی

---

[1] مجموعہ شیرانی مخطوطہ نمبر پی آئی چار/۶۳ اور کیٹلاگ نمبر ۵۲۴ [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۷ الف [3] ایضاً ورق ۱۹ الف تا ۲۲ ب [4] مثنوی مہر و ماہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ورق ۲۳ الف [5] ایضاً ورق ۲۹ الف تا ۳۱ الف [6] ایضاً ورق ۵۱ الف تا ۵۳ ب

ملاقات عطارد سے ہوتی ہے، ماہ قلعہ کے حاکم اہرمن کو قتل کر دیتا ہے اور قلعہ پر قبضہ کر لیتا ہے، جہاں اسے ایک بڑا خزانہ ہاتھ لگتا ہے، وہاں اس کی ملاقات بہرام کے وہاسوس سعداکبر سے ہوتی ہے جو اسی کی تلاش میں نکلا تھا، طرابلس کے قلعہ کی فتح ماہ کی بہادری کا سکہ جما دیتی ہے، وہ سعداکبر کے سامنے اپنے عشق کا حال بیان کرتا ہے، سعد اکبر سفیا واپس پہنچ کر مہر کو پورا حال سناتا ہے، ادھر مہر بھی اسی طرح خواب میں ماہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے، اپنی سہیلی ناہید کے مشورے سے مہر، سعد اکبر کو اپنا رازدار بنا لیتی ہے، سعد اکبر، شہاب کو پیغام دے کر ماہ کے پاس بھیجتا ہے، وہ عاشق و معشوق کی ملاقات کا انتظام ایک باغ میں کرتا ہے، اسی دوران روم کا بادشاہ اسد بہرام کے پاس مہر سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے اور انکار کی صورت میں حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے، بہرام رشتہ نامنظور کر دیتا ہے، اور اسد فوج لے کر حملہ آور ہوتا ہے، ماہ، بہرام کی مدد کو پہنچ جاتا ہے، اور اسد کو شکست دے کر اسے قید کر لیتا ہے[1] بعد میں اسد اپنی وفاداری کا یقین دلا کر رہائی پاتا ہے، بہرام بطور انعام مہر کی شادی ماہ سے کر دیتا ہے، ماہ کے اعزاز میں دعوت دی جاتی ہے، پھر نوبیاہتا جوڑا طرابلس کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے، وہاں موسم بہار کا جشن منایا جاتا ہے، جشن کے دوران ہی خضر ماہ کے باپ کی موت کی خبر لے کر آتا ہے[2] ماہ کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہوتا ہے اور وہ مر جاتا ہے[3] بیوہ مہر، ماہ کی قبر پر ماتم کرتی ہے، اور فرط غم سے مر جاتی ہے، قبر پھٹ کر مہر کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، اس طرح عاشق و معشوق پھر یکجا ہو جاتے ہیں[4] عطارد، ناہید، سعد اکبر، شہاب اور بہت سے دوسرے ساتھی بھی اسی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں[5] اس جگہ کا نام روضۃ الاحباب پڑ جاتا ہے[6] اس طرح یہ داستان اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۰۸ ب تا ۱۱۱ ب [2] ایضاً ورق ۱۱۲ الف [3]
گزشت از منزل این دہر فانی قدم زد در سرائے جاودانی

تصنیف کا سبب اور زمانہ: یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ جمالی نے حرمین شریفین اور اسلامی ممالک کا طویل اور صبر آزما سفر کیا تھا۔ غریب الوطنی میں انہیں وطن اور ہم وطنوں کی یاد ستایا کرتی تھی، اس سے وہ مغموم رہا کرتے تھے۔ اہل تبریز نے جمالی کا غم محسوس کیا اور مشورہ دیا کہ عصّار تبریزی کی مثنوی "مہر و مشتری" کے طرز پر وہ ایک مثنوی نظم کر ڈالیں، اس سے ان کا دھیان بٹا رہے گا، وطن اور ہم وطنوں کا غم غلط ہو سکے گا۔ جمالی خود کہتے ہیں[1]

خداونداں کہ در تبریز بودند ‌ ‌ مرا روے خداوندی نمودند

براہ دوستی در راہ یاری ‌ ‌ بشرط ہمدمی و غمگساری

شدند این خستہ دل را در شب و روز ‌ ‌ بہ تنہائی چراغ خاطر افروز

ز روے نخل بندی اہل تبریز ‌ ‌ ز نخل دوستی گشتہ رطب ریز

بگفتندا اے چراغ عشق بازی ‌ ‌ ز تو پروانہ جان در گدازی

ترا راہ حجاز از اشتیاق است ‌ ‌ سزاوارے تو این راہ عراق است

نشیں در پردہ ہاے دیدۂ ما ‌ ‌ کہ جائے مردم بینا است این جا

نواے خوش براہ عشق بنواز ‌ ‌ کہ گردد پردۂ عشاق را ساز

کتابے ہست مہر و مشتری نام[2] ‌ ‌ بہ شہرت ہمچو مہر و مشتری عام

ز تصنیف سپہر فضل عصّار ‌ ‌ کہ او استاد استادان دیکار

تو ہم در فکر مہر و مشتری باش ‌ ‌ بمہر دل مرا و را مشتری باش

بقیہ حاشیہ ص ۱۹۰ پر) [3] مثنوی مہر و ماہ، ورق ۱۱۱ الف سے یہاں دم تربت دلدار شد شوق ولا فتاد آں نازنین در تربت الحق بلا [4] ایضاً ورق ۱۱۵ ب سے کنوں آں روضہ را آناں کہ دانند بنام روضۃ الاحباب خوانند

[1] ایضاً ورق ۱۱۳ ب تا ۱۱۴ الف [2] دیکھیے مدرسہ عالیہ ڈھاکہ مخطوطہ نمبر ۱

زخاموشی دهن بکشاد برخیز　　درمعنی بگوش عاشقاں ریز

جالی کو ان کا مشورہ پسند آیا اور انھوں نے مثنوی کی ابتدا کر دی۔

درگنج معانی باز کردم　　حدیث مہر و ماہ آغاز کردم[1]

جالی دعویٰ کرتے ہیں کہ اس فن میں وہ عصار سے آگے نکل گئے ہیں[2]۔

دل غواصم از بحر معانی　　بدست آورد در کامرانی

مایک گنجینہ بر طبعم کشادہ　　فلک بر پائے فکرم بوسہ دادہ

باسرار نہانی یا محرم بار　　سعادت ہم نشین و دولتم یار

دلم اسرار نقش لوح محفوظ　　بہم رازان عالم کردہ ملفوظ

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۴ب [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۴ الف

لیکن عصار کی مثنوی انداز بیان، شاعرانہ لطافت اور پلاٹ کے اعتبار سے جالی کی مثنوی سے کہیں بہتر ہے عصار کا انداز بیان زیادہ فنکارانہ ہے، اہل زبان ہونے کی وجہ سے اسے زبان پر زیادہ قدرت حاصل تھی، علاوہ ازیں عصار کی زبان پر ایرانی رنگ غالب ہے جو جالی کو میسر نہیں، جالی کا یہ دعویٰ کہ ان کی مثنوی کسی دوسری کہانی کا چربہ نہیں، غلط ہے، مثنوی مہر و مشتری ان کے سامنے تھی، اور اسی کو مشعل راہ بنا کر انھوں نے اپنی مثنوی کو نظم کیا ہے، جالی ایک جگہ خود کہتے ہیں کہ انھوں نے "مہر و مشتری" کو نئی زندگی عطا کی ہے، جالی کی مثنوی کی ابتدا خوابوں کی سرزمین سے ہوتی ہے اس کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہو جاتے ہیں، ہیرو اپنے باپ کی موت کی المناک خبر سن کر مر جاتا ہے، ساتھ ہی ہیروئن اور دوسرے کردار بھی مر جاتے ہیں، عصار "مقابلتہً" اس کمزوری سے پاک ہے اس کے کردار انسانوں کی دنیا کے کردار ہیں، مہر و مشتری کا عشق ہر چند کہ غیر فطری نظر آتا ہے، مگر اس کے زمانہ میں ایسی محبت عام تھی۔ "مہر و مشتری" کی کہانی کا خلاصہ درج ذیل ہے،

چو عیسیٰ از دم جاں بخش اشعار   حیات تازہ بخشیدم بہ عصار
بجان مہر و مہ را مشتری گشت   ز مہر و مشتری جانش بری گشت

---

(۱۹۴) مہر ایران کے بادشاہ شاہ پور کا لڑکا ہے اور مشتری اس کے وزیر کا لڑکا ہے، دونوں ایک ساتھ تعلیم
حاصل کرتے ہیں، بہرام اور بدر ان کے نوکر ہیں، مہر و مشتری میں گہری محبت ہے، حاسد بہرام اس محبت کو
غیر فطری سمجھتا ہے اور استاد کے ذریعہ بادشاہ تک شکایت پہونچاتا ہے، بادشاہ کے حکم سے دونوں جدا
کر دیئے جاتے ہیں، مہر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حجرہ میں پڑھا کرے، مشتری عالم فراق میں بیمار
ہو جاتا ہے، وہ بدر کے ذریعہ مہر کے پاس خط بھیجتا ہے لیکن خط پکڑا جاتا ہے اور مشتری اور بدر جلا وطن
کر دیئے جاتے ہیں، مہر کو قید کر لیا جاتا ہے، قید سے آزاد ہو کر مہر اپنے ساتھیوں اسد، جوہر اور صبا
کو ساتھ لے کر مشتری کی تلاش میں ہندوستان کی طرف چل پڑتا ہے، راستہ میں طوفان آگھیرتا ہے،
جہاز تباہ ہو جاتا ہے اور مہر ایک جزیرہ میں پہونچ جاتا ہے، وہاں سے وہ خوارزم کی طرف روانہ
ہو جاتا ہے، راستہ میں وہ شیر کا شکار کرتا ہے اور ڈاکوؤں کو لوٹ لیتا ہے، خوارزم پہنچ کر وہ شاہ
کیوان کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کرتا ہے، دوسرے دن اس کی شرافت و نجابت کا امتحان
لینے کے لیے اسے محل میں بلایا جاتا ہے، وہ دربار کے آداب بجا لاتا ہے اور ہر امتحان میں کامیاب
ہوتا ہے، اسے محل میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے، شہزادی ناہید اس
پر فریفتہ ہو جاتی ہے، اور عشق کا پیغام بھیجتی ہے، مہر اسے قبول کر لیتا ہے، شہزادی
اپنی محبت کا حال اپنی ماں سے کہتی ہے اور ماں کے ذریعہ یہ خبر بادشاہ تک پہونچتی ہے، بادشاہ دونوں کا
رشتہ منظور کر لیتا ہے، سمرقند کا حکمراں قراخاں بھی شہزادی سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے جو رد کر دیا جاتا ہے،
غصہ میں قراخان فارس پر حملہ کر دیتا ہے، مہر بادشاہ کی مدد کو پہونچتا ہے اور قراخاں کو شکست دے
کر اسے گرفتار کر لیتا ہے، بعد میں مہر کی سفارش پر وہ رہا کر دیا جاتا ہے، بادشاہ مہر کے اس کارنامے کو سراہتا

اس مثنوی کے ایک باب کا عنوان "سبب نظم مثنوی" ہے اسمیں جالی نے وجہ تصنیف بیان کی ہے اسمیں دہلی سکندر
پوری شیخ سماء الدین اور سوزیروں کا ذکر کرتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسوقت لکھی گئی ہے جب وہ اسلامی ممالک
کے سفر پر تھا، کتاب کے اختتام پر مندرجۂ ذیل تاریخی شعر سے کتاب کی تصنیف کی صحیح تاریخ کا پتہ چلتا ہے،

اور اسے ناہید کی شادی کا پیغام دیتا ہے، جشن منایا جاتا ہے، مہر جشن سے کھسک کر تنہائی میں چلا جاتا ہے
جہاں ناہید اس کا استقبال کرتی ہے، صبح تک دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، یہاں ناہید کی محبت اور مشتری
کی دوستی میں کشاکش ہوتی ہے، ادھر مہر کا باپ بہرام کو شہزادے کی تلاش میں بھیجتا ہے، عالم جلا وطنی
میں مشتری اور بدر اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں، بہرام دونوں کو سنگ دلانہ سزا دیتا ہے، بدر
کسی طرح بھاگ نکلتا ہے اور خوارزم پہونچ جاتا ہے، جہاں اس کی ملاقات مہر سے ہوتی ہے، بہرام اور
مشتری محل میں بلائے جاتے ہیں، اس طرح دونوں دوست پھر مل جاتے ہیں، مہر اور ناہید کی شادی ہوجاتی
ہے اور جشن منایا جاتا ہے، ایک ماہ بعد مہر، ناہید کے توسط سے بادشاہ سے اپنے ملک جانے کی اجازت لیتا
اور وہ سب استخر واپس لوٹ آتے ہیں، وہاں بدحواس بادشاہ اور ملکہ ان کا استقبال کرتے ہیں، شاہ پور
مہر کو ایران کی بادشاہت عطا کرتا ہے اور مشتری اپنے مرحوم باپ کی جگہ اسکا وزیر بن جاتا ہے، پانچ چھ سال کے
بعد مہر ایک خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتا ہے، مشتری کو بھی وہی مرض لاحق ہوتا ہے اور دونوں ایک
ہی وقت موت کے آغوش میں پہنچ جاتے ہیں، عالم نزع میں بھی مشتری کے لبوں پر مہر ہی کا نام ہوتا ہے
دونوں کا تابوت قبرستان کی طرف لے جایا جاتا ہے، راستے میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ مشتری کا تابوت
انہیں مہر کے تابوت کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے، مشتری کے تابوت سے ایک پرندہ اڑ کر مہر کے تابوت میں
داخل ہو جاتا ہے، اس طرح دونوں دوست یکجا ہوتے ہیں (ورق ۱۹۹ ب تا ۲۰۷ الف) مہر کے
تابوت کی روانگی کے بعد ناہید مر جاتی ہے اور ایک چار سالہ بچہ بطور ولی عہد چھوڑ جاتی ہے، مہر
اور مشتری کے دوست بھی مر جاتے ہیں، ورق ۲۰۷ الف ۔ [1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۲ ب تا ۱۵ الف

جو تاریخش بجوئی اے خدا بیں | نگر در "مہرو ماہ بہرسند دین"
۹۰۵ھ

اغلباً یہ مثنوی سکندر لودی کے نام معنون ہے۔[1]

پلاٹ کی اصلیت ORIGINALITY جمالی کا دعوی ہے کہ کہانی کا پلاٹ اوریجنل (Original) ہے۔ وہ کہتا ہے، ہرچند کہ فردوسی نظامی، خسرو اور جامی کی تصنیفیں، کے نمونے موجود ہیں، لیکن اس نے ان میں سے کسی کی بھی پیروی نہیں کی، وہ فخر کرتا ہے کہ اس کی مثنوی کی کہانی اسکا اپنا اختراع ہے سروقہ نہیں،

چو بہ خوانش رسیدم من از آں پس	نشد میل دلم بخوردۂ کس
بحمد اللہ مرا ہم توشۂ بود	اگر خرمن نہ بودہ خوشۂ بود
ز صد خرمن نکو یک شاخ ارزن	کہ دزدی را بنا شد اندر و ظن

پھر بھی وہ توارد کے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیتا، توارد[2] کو محض اتفاقیہ قرار دیتا ہے اور اس کی ذمہ داری سے خود کو بری سمجھتا ہے؛

توارد گر فتد عیبے نہ باشد	کہ چون واقف عیبے نہ باشد
بسا فرزندگان زاید بیک شکل	بسا یک لذت آید مختلف اکل

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۴) [1] مثنوی مہرو ماہ ورق ۱۲ب تا ۱۵ الف [2] ایضاً ورق ۱۱۷ ب سہ

اگرچہ بودم از دہلی بسے دور	دلم می یافت از حب الوطن نور

[3] ایضاً ورق ۱۱۷ ب سو

سکندر را حیات جاوداں باد	کہ یاد او مرا آب خضر داد
بیاد بادشاہ خویش ہر دم	دل محزون من می گشت خرم

اس زمانہ کی روش کے مطابق مثنوی کی ابتدا، حمد[۵۱]، مناجات[۵۲]، نعت[۵۳]، معراج[۵۴]، مدحِ شیخ سماء الدین[۵۵] اور "شانِ نفسِ امارۂ نابکار و نصیحت بہ ابنائے روزگار" "سبب نظم" اور حکایت[۵۶] در تکلفِ شعر و سلاستِ سخن" سے ہوتی ہے، پھر اصل کہانی ہے اور آخر میں "تاریخی شعر" ہے جس سے تصنیف کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے[۵۹]

جالی مثنوی میں رومانی فضا پیدا کرتا ہے، ہیرو اور ہیروین کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے، اور ناقابلِ عبور رکاوٹوں کو طے کرا کے دونوں کو یکجا کر دیتا ہے، محض اس سے وہ مطمئن نہیں ہوتا اور ٹھیک اس وقت جب خوشیاں اپنے شباب پر ہوتی ہیں کہانی کو المیہ بنا دیتا ہے، پہلے ہیرو مرتا ہے پھر ہیروین اور اس کے بعد دوسرے کردار بھی مرجاتے ہیں، اور اس طرح وہ دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہو کر عالمِ جاودانی میں یکجا ہو جاتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵)　　۵۳ ایضاً ورق ۱۰ الف

اگر چہ روئے ظاہر دور رم از وے　　بباطن ہر نفس پر نور رم از وے

۵۴ ایضاً ورق ۱۰ ب سے

ز خویشان و عزیزاں دل کشیدم　　غریبی را صلاحِ خویش دیدم

ورق ۱۳ ب سے

فراقِ ہمنشینانِ قدیمم　　جگر می سوخت چوں نارِ جحیم

۵۵ ایضاً ورق ۱۸ اب سے ایضاً ورق ۱۷ اب تا ۱۸ الف سے

سکندر را حیاتِ جاودان داد　　کہ یادِ او مرا آبِ خضر داد

بیا ہر بادشاہِ خویش ہر دم　　دل محزونِ من می گشت خرم

خداوندا چنیں شاہِ جواں بخت　　بماند تا ابد پائندہ بر تخت

۵۶ ایضاً ورق ۱۴ اب　۵۷ ایضاً ورق ۱۴ اب

مثنوی میں روحانیت اور مابعد الطبیعیت کا رنگ بھرنے کے لیے جامی نے کرداروں کے نام ستاروں اور سیاروں کے نام پر رکھا ہے جیسے مہر، ماہ، عطارد، ناہید، سعد اکبر، شہاب وغیرہ "صبا" کو پیغامبر اور ظلمت ناامیدی میں "خضر" کو رہبر بنایا ہے۔ ایک کردار (ویلین) کا نام اہرمن رکھا ہے جو برائیوں کا پیکر سمجھا جاتا ہے، کہانی کا مقام افسانوی سرزمین کوہ قاف ہے جو کہانی کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے کہانی سسپنس سے پر ہے،

اس مثنوی کے لیے جامی نے شش رکنی بحر ہزج محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) کا انتخاب کیا ہے جو رومانی مثنویوں کے لیے بہت موزوں ہے، نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں" جامی کی "شیریں و خسرو" اور "یوسف و زلیخا" اسی بحر میں ہے،

انداز بیان شستہ اور سلیس ہے، محاوروں کا استعمال بھی خوب کیا گیا ہے، الفاظ کی بندش قابل داد ہے، لیکن نظامی کے یہاں جو جوش ملتا ہے وہ اس مثنوی میں نہیں، شہزادی مہر کا سراپا (جو ماہ خواب میں دیکھتا ہے) سحر کن ہے، اس سراپا میں جامی نے نئی نئی تشبیہیں اور استعارے نہایت خوبصورت انداز میں استعمال کیے ہیں[1]

بقیہ حاشیہ ۱۹۶ [1] مثنوی مہر وماہ ورق ۱۱ الف تا ۵ الف [2] ایضاً ورق ۵ ب تا ۶ ب [3] ایضاً ورق ۶ ب تا ۷ ب [4] ایضاً ورق ۷ ب تا ۹ الف [5] ایضاً ۹ ... تا ۱۰ الف [6] ایضاً ۱۰ الف تا ۱۲ ب [7] ایضاً ۱۲ ب تا ۱۵ الف [8] ایضاً ۱۵ الف تا ۱۶ الف [9] ایضاً ۱۸ ب (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایضاً ۲۰ ب تا ۲۱ الف ۔ عصار کی مثنوی مہر و مشتری (مدرسہ عالیہ مخطوطہ نمبر ۱/۱۱ کے باب رفتن مہر بجام (ورق ۱۱۳ ب تا ۱۱۴ ...) اور نشستن مہر با ناہید (ورق ۱۰۸ الف تا ۱۰۹ ب) سے مقابلہ کرکے دیکھئے،

ہزاراں ماہ و مہر گرد آں تخت | بدو بنشستہ یک حور جوان بخت
نہ حورے بلکہ خورشیدے پری رنگ | کہ از عکس رخش گوہر شود سنگ
فلک برگشتۂ ماہِ جمالش | فلک آشفتۂ زلفِ جو دالش
دہانِ تنگ از روے تبسم | بدل جوئی گہے پیدا گہے گم
گہر در درجِ لعلش وقت خندہ | ہوا در برگ گل شبنم فگندہ
زبانش در دہن با در دنداں | تگرگ و سوسن اندر غنچہ پنہاں
لبش از شہد و از شکر سرشتہ | ز بابِ شکر و شہدش فرشتہ
بت خورشید عالمتاب دلخواہ | چو خورشیدے کہ آمد در قرانِ ماہ
دہانش پستۂ خنداں شکستہ | صدف را گوہرِ دنداں شکستہ
لبش جانِ خضر را آب دادہ | رخش خورشید و مہ را تاب دادہ
بگیسو کافر و از رخ مسلماں | بہ نرگس خوں خورد و زلب دہد جاں
یکے خالش بزیر چشم جادو | فتادہ نافۂ از ناف آہو
بخوبی چوں خم ابروے خود طاق | غمش پیوستہ جفتِ جان عشاق
دو زلفش تا میانش پیچ در پیچ | دہانش چوں میانش ہیچ در ہیچ
بہ شوخی غمزہ را خونخوار کردہ | جہاں از غمزہ در خونخوار کردہ
گلش را جعد سنبل بر کرانہ | مہش را چاہ بابل در میانہ
بزیر پردۂ او چشم پُر خواب | دو ہندو سر نہادہ زیر محراب

جمالی عشق کے اسرار و رموز سے خوب واقف معلوم ہوتا ہے، باغ میں
ماہ و مہر کی ملاقات ہوتی ہے تو ماہ عشق کا اظہار کرتا ہے اور ہجر کی کلفتیں بیاں

کرتا ہے، اسے جمالی نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے[1]

نمی دانی که من ماهم تو ای مهر　　مرا روشن نه گردد بی رخت چهر
چو ذره مهر از خورشید یابد　　شود سرگشته سوی او شتابد
منم ذره تو ای مهر جهان تاب　　ز مهر خود دل این ذره دریاب
دلم از محنت غمهای ماضی　　به پیشت عرض دادن نیست راضی
در ایام وفا ذکر جفا را　　نمودن روی می پوشد وفا را

ماہ کی اچانک موت سے مہر کو سخت صدمہ پہونچتا ہے، وہ زندگی کی راحتیں بھول جاتی ہے، ماہ کی یاد میں روتی ہے بلبلاتی ہے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتی ہے، ماہ کی قبر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے،

پرستی چون تربت دلدار خود دید　　بصد زاری زبان بکشاد و نالید
که در خاک ای قمر رخسار چونی　　تو ماهی در میان غار چونی
پری از بار گل آزرده گشتی　　تنت کز پیرهن افسرده گشتی
کنون در زیر چندین بار چونست　　نمی دانم درین آزار چونست
عذار نازکت کان بود چون روح　　شده از سایهٔ زلفت مجروح
چنانست این زمان افتاده در گل　　ز جور آسمان مجروح چون دل

قبر پھٹ کر مہر کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس طرح عاشق و معشوق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جاتے ہیں[3]

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۸۴ الف تا ۸۴ ب [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۴ الف تا ۵

[3] ایضاً ۱۱۵ الف

همان دم تربت دلدار شد شق — فتاد آن نازنین در تربت الحق

بیک معدن دو گوهر گشت پنهان — یکے بود آں دو تن را چو ہر جان

چو بود آں ہر دو تن را جان زیک نور — دل ایشاں شد از دوں دوئی دور[1]

ماہ و مہر کے احباب بھی ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، شاعر دنیا کی ناپائیداری کا ذکر کرتا ہے اور پند و نصائح کا دفتر کھل جاتا ہے، یہ دنیا عارضی ہے اور موت یقینی ہے یہاں آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا ہے[2]

گذشتند از جہاں یاران یکدل — بفردوس بریں کردند منزل

ہمیں رسم است گوئی اندریں دہر — یکے ساکن یکے در سرعت سر

یکے زیں خانہ بیرون می نہد پائے — بیاید دیگرے در وے کند جائے

دریں خانہ قرارے نیست کس را — کہ ایں شکر ہمی راند مگس را

جالی نے انسانی جذبات کی تصویر کشی میں بڑی ہنرمندی دکھائی ہے، ماہ کی گرتی ہوئی صحت اور بدلی ہوئی حالت پر باپ کے بے غرضانہ جذبات کی تصویر کشی قابل داد ہے، بطور مثال دو شعر دیکھئے[3]

چکیدش خون دل از چشم پر غم — ہمی نالید و می پرسید ہر دم

کہ اے جان پدر حال تو چون است — کہ از بہر تو چشم غرق خون است

جالی کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے، انھوں نے مختلف واقعات، مقامات اور حسن قدرت کی منظر نگاری بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے، طرابلس کے باغ کا ایک منظر قابل دید ہے، چند شعر بطور نمونہ حاضر ہیں[4]

---

[1] عصار کی مثنوی مہر و مشتری (ورق ۱۹۹ ب تا ۲۰۰ الف) کا باب "در وفات مہر و مشتری" وغیرہ بھی دیکھئے [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۵ ب [3] ایضاً ۱۲۲ الف [4] ایضاً ۱۴۰ ب

یده بر لب جو سبزهٔ خوش — چو خط بر عارض خوبان مهوش
شکفته لاله و گل اندر آن باغ — نهاده بر دل باغ جنان داغ
ارانش رسیده کاخ در کاخ — گلستانش کشیده شاخ در شاخ
ستاده در چمن هر سرو آزاد — که صد طوبیش خط بندگی داد
صنوبر در قیام احترامش — بنفشه در سجود احترامش
زلالش داده آب خضر را نم — نسیمش روح بخش ابن مریم

اسد شاہ اور بہرام شاہ کی جنگ میں سپاہیوں کی بہادری کے کارناموں اور میدانِ جنگ کا بیان بہت واضح ہے، قاری جنگ کی پوری کیفیت محسوس کرتا ہے[1]

دو لشکر گشته چو طوفان خروشان — دو بحر افتاده با هم سینه جوشان
زجا جنبید گوئی مرکز خاک — غبارش شد حباب روی افلاک
سمندان را عنان اندر عنان شد — جوانان را سنان اندر سنان شد
ترنم ساز شد آواز ناوک — به بستان وغا مثل چکاوک
ز شمشیر و خدنگ شهسواران — پدید آمد بهجا برق و باران
ز آواز دهل و ز گرد لشکر — زمین و آسمان هم کور و هم کر
شرار نعل اسپان زمین تاب — درخشان در هوا چون کرم شبتاب
ز گرمی سینهٔ مردان در آتش — از آن گرمی غریبان زر دیارش
ز پهلوی یلان شمشیر پر خون — از آن آتش ز گرمی گشت گلگون
عتاب اندر کمند پهلوانان — کشاکش کرده چون زلف جوانان

---

[1] مثنوی مهر و ماه ورق ۲۵ ب تا ۲۹ الف

نہال نیزہ از خون یلانے چو شاخ ارغواں در گل فشانے[1]

مثنوی کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کرنے والے دل کے احساسات وجذبات سے جامی خوب واقف ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار واضح کرتے ہیں کہ سکندر لودی، اور شیخ سماالدین کے علاوہ بھی اس کے دو سرے دوست تھے جنھیں وہ بہت محبوب رکھتا تھا[2]

فراق ہم نشینان قدیمم جگر می سوخت چوں نار جحیم

بیاد روے ہر مشکیں کلالہ مدام از نرگسم می ریخت لالہ

شبا روز بیاد روے ایشاں چو زلف لالہ رخساراں پریشاں

جامی کے لیے محبوب کی جدائی نا قابل برداشت ہوتی ہے اسی خیال سے اس نے سفر میں کسی کو دوست نہیں بنایا[3]

دل پر خونم از بیم جدائی نمی زد دم زروے آشنائی

مبادا یا کسے پیوند گیرد کہ بعد از وصل در ہجراں بمیرد

مثنوی کے اختتام پر جامی کہتا ہے کہ اسنے مثنوی میں اپنا "درد دل" بیان کیا ہے مہر و ماہ کی کہانی تو ایک بہانہ ہے[4]

نہادم مہر و مہ را قصہ در پیش در آنجا ریختم درد دل خویش

بروں دادم غم دل در فسانہ حدیث مہر و ماہم شد بہانہ

سواد نامہ خود افسانہ ماست کہ ایں درد از دل دیوانہ ماست

---

[1] دیکھیے عصار کی مثنوی ورق ۵۸ الف تا ۱۲۳ ب باب "حرب کردن کیوان با قزلغان" [2]

مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۳ ب [3] ایضاً ۱۳ ب [4] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۸ الف ب

جامی اس مثنوی کو بہت بلند تر سمجھتا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ مثنوی کسی کا چربہ نہیں،
مشہور آفاق مثنوی نگاروں فردوسی، نظامی، خسرو اور جامی یا کسی دوسرے کے
ہی نگارش[1] سے اس نے کچھ مستعار نہیں لیا ہے۔ اس نے اپنی راہ خود نکالی ہے۔ دوسرے
کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنا اسے پسند نہیں[2]۔ جامی سمجھتا ہے کہ یہ مثنوی اتنی اعلیٰ ہے
۔ دوسرے اس سے حسد کرنے لگیں گے[3]

درمن گرچہ رخشاں ہمچو بدر است	بہ چشم کور گو ہر مرا چہ قدر است
حدیث من زروئے مہر و ماہ است	رخ حاسد از آں چو شب سیاہ است
رخ انشائے من چوں ماہ و خورشید	منور باد در آفاق جاوید

جامی کہتا ہے کہ اس کی مثنوی نظامی کی مثنوی سے کسی طرح کم نہیں ہے[4]

چو نظم نو لوئے من با نظام است	نظامی دار مقبول تمام است
مرا از طعنۂ حساد غم نیست	کہ نظم از نظامی ہیچ کم نیست[5]

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جامی کے منتخب اشعار کا اگر مقابلہ نظامی یا کسی
دوسرے شہرآفاق شاعر کی تخلیق سے کیا جائے تو فیصلہ جامی کے حق میں ہوگا۔ لیکن
جامی کا یہ دعویٰ کہ "نظم از نظامی ہیچ کم نیست" شاعرانہ تعلی سے زیادہ نہیں۔ مثنوی
نگاری میں نظامی کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ جامی نے یہ مثنوی لکھ کر اس مقام
تک پہونچنے کی کوشش ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ جامی کی ملاقات نے اس کی اس خواہش
کے لئے تازیانہ کا کام کیا ہو خسرو کی طرح جامی نے بھی اس فن میں
نظامی کے مقام تک پہونچنے کی کوشش کی ہے؛

---

[1] ایضاً ورق ۱۴ اب [2] ایضاً ۱۴ اب [3] نشد میل دلم بر خوان ہر کس [4] ایضاً ورق ۵ اب
تا ۱۰ اب [5] ایضاً ورق ۱۵ اب [6] عصار کی مثنوی کا ورق ۱۴ اب بھی دیکھئے [7] لیکن شیخ عیسیٰ و مرنظامی
کہ بروئے تخت شیرین کلامی

لیکن نظامی سے جمالی کا کوئی تقابل ہی نہیں۔ جمالی میں نہ تو نظامی کا حسنِ ادا ہے نہ اس کی مثنوی کی ضخامت ہی نظامی کی مثنوی کے مقابلہ کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جمالی نے نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں" کی پیروی حسن و خوبی سے کی ہے۔ جمالی نے خود بھی نظامی کو استاد مانا ہے[1]

چہ لافم من کہ استادانِ این کار ازین نوعِ سخن راندند بسیار

تواریخ کہن افسانہ تو حدیث رستم و دستانِ خسرو

ز فردوسی و استادِ نظامی بہ نظم آمد معانی را تمامی

صاحب مخزن الغرائب نے اس مثنوی کی تعریف یوں کی ہے[2]

"اما مولانا جمالی مثنوی خوب دارد" (باقی)

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۴ ب۔ [2] مخزن الغرائب ورق ۲۷۲ الف

فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

نعتیہ شاعری کی معنوی اہمیت

اور

ادبی قدر و قیمت

از ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبہ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

فطرت انسانی پر حسن و احسان کا اثر اور شاعری میں اس کا ظہور

انسان فطرتاً بندۂ حسن و احسان ہے، ہر حساس دل حسن و احسان کے جلووں پر فدا ہوتا ہے اور ان کی بدولت ہر قلب سلیم میں تحسین و تشکر کے جذبات حرکت میں آتے ہیں ممنونِ نظر اور مرھونِ کرم اگر شاعر بھی ہو تو حسینوں اور محسنوں کی تعریف و تحسین کا دریا جب امنڈنے لگتا ہے تو یہ جذبات شعر و سخن کے دلربا رنگ روپ اختیار کر لیتے ہیں اور عرض و نیاز کے یہ نغمے ادب کا سرمایۂ ناز بن جاتے ہیں۔

شعر حافظ را کہ یکسر مدح احسان شماست ہر کجا بشنیدہ اند از لطف تحسین کردہ اند

حسن کی ایک نظر اور کرم کی ایک امید بھی شاعر کو قصیدہ گوئی اور غزل سرائی پر ابھارتی ہے، فارسی غزل اور قصیدہ کے ارتقا کی ایک ایک کڑی، اس حقیقت پر برہان قاطع ہے۔

مشاہیر اور اکابر کی تعریف اور اس کی چند قسمیں

انسانی فطرت اور شاعرانہ مزاج کو یہ موضوع اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ شاعر اور افسانہ گو اگر کسی نیم تاریخی یا تاریخی محسن و ممدوح کا انتخاب نہ کرسکا تو نظم، ڈرامہ، افسانہ یا ناول میں کچھ

خیالی کرداروں میں انسانی خوبیوں کا وہ رنگ بھرا کہ افسانہ پر اصل کا گمان ہونے لگا اور وہ ادبی کردار ضرب المثل نمونے بن گئے۔

شمۂ از داستان عشق شور انگیز ماست — ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

مذہبی پیشواؤں کی تعریف | یہی وجہ ہے کہ قوموں کی شاعری کے ابتدائی شاہکار اکثر مذہبی پیشواؤں، انسانیت کے محسنوں اور مشاہیر قوم کی تعریف و تعظیم کے مضامین اور افکار پر مشتمل ہیں۔ رامائن، مہابھارت، شاہنامہ اور ایلیڈ اس کی واضح مثالیں ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ عظیم الشان انبیاء کی تاریخی شخصیتوں تک پہونچتا ہے جن کی بدولت شاعری کو معنوی معراج نصیب ہوتی ہے۔

انسانیت کے محسنوں میں انبیاءؑ کا مقام | انسانیت کے محسنوں میں انبیاء علیہم السلام کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، ایک موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی کی مجلس میلاد میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے نامور سائنسداں سر سی وی رامن نے فرمایا تھا

"انسانی زندگی کی تاریخ سے مہاتما بدھ حضرت مسیحؑ اور حضرت محمدؐ جیسے محسنوں کے نمونے اور ان کے اثرات کو نکال دو پھر دیکھو کہ انسانیت کے لئے فخر و ناز کا کیا سرمایہ رہ جاتا ہے"۔

محققین تصوف کے لئے نعتیہ شاعری کی اہمیت | تاریخ ادب سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف اور صوفیانہ ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری بھی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی، تصوف کے محققوں اور طالب علموں کے لئے بھی نعتیہ شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے اس سے خاص طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے نزدیک نبوت کا

کیا تصور ہے اعیان سے لے کر مختلف مدارج ظہور و کمال عروج میں نبی کا کیا مقام ہے۔

بڑے صوفی شعراء کی نعتیہ شاعری ان کے صوفیانہ مسلک و مشرب اور عارفانہ فلسفہ و حکمت کی تعلیم و تلقین کا ایک بنیادی اور مرکزی حصہ ہے حکیمانہ تصوف کے چند مرکزی تصورات ہیں۔

تصوف کی انسان دوستی ایک مسلم حقیقت ہے، روح انسانی کی عظمت اور انسانیت کی قدر و قیمت کے	صوفیا کی نظر میں عظمت انسان اور نعتیہ شاعری کا ربط

روح افروز نغمے سب سے زیادہ صوفی شعراء ہی کے کلام میں سنائی دیتے ہیں۔

صوفیانہ شاعری میں عظمت آدم کا یہی احساس ترقی کرتے کرتے فطری طور پر عظمت انبیاء کے عرفان تک بلند ہوتا ہے اور تعظیم انبیاء کے ادراک و اظہار کا یہ ارتقا خاتم الانبیاء کی رفعت ذکر یا نعت شریف میں اپنی معراج کو پہونچتا ہے یعنی نعت سرور انبیاء صوفیانہ شاعری میں انسانی عظمت کی تحسین و تعریف کی معراج ہے۔

فارسی نعتیہ شاعری میں یہ نکتہ خاص طور پر توجہ کا محتاج ہے کہ اولین بڑے نعت گو شاعر حکیم سنائی ہی کے کلام میں عظمت آدم اور نعت کا فطری ربط نمایاں طور پر ملتا ہے۔

غرض عالم آدم از اول ✽ غرض آدم احمد مرسل[1]

اسی طرح آخری دور کے ایک نامور صوفی شاعر شاہ نیاز احمد بریلوی

[1] حدیقہ سنائی ص۱۹۱

فرماتے ہیں

زہے عز و علائے منتہائے اوجِ انسانی ؛ نبی یثربی، و مہبطِ تنزیلِ فرقانی[1]

عبدیت اور الوہیت کا ربط تصوف کا مرکزی مسئلہ ربطِ الوہیت و عبدیت ہے صوفیا کے نزدیک انبیائے کرام شانِ عبدیت کے بہترین نمائندے اور تجلیاتِ الٰہیہ کے بہترین مظہر ہیں، ان کے معارف علومِ الٰہی کے ترجمان اور ان کے اخلاق، اخلاقِ الٰہی کا پرتو ہیں۔

نعت احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیا کی نعت ہے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہی جاتی ہے تو صوفیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی ایک خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ اس تعریف و توصیف میں تمام انبیاؑ کی تحسین و نعت شامل ہے۔

نامِ احمدؐ نامِ جملہ انبیاست ؛ چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست[2]

اسی طرح دوسرے انبیا کے محاسن و مکارم کے بیان میں بھی لازماً خاتم الانبیاءؐ کی تحسین مضمر ہوتی ہے۔

عارفِ رومی تو تمام انبیا پر لازمی ایمان کی توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی کل کے مربوط اور لاینفک اجزا ہیں۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ[3] ہم رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے

چوں رسولاں از پے پیوستن اند ؛ پس چہ پیوندند شاں چوں یک تن اند[4]

اس زاویہ نگاہ سے ہم اس ادب اور شاعری پر ایک نئی نظر ڈالنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس میں مختلف انبیاء کی تعریف و توصیف کی گئی ہے چاہے

---

[1] دیوان شاہ نیاز احمد ص۲۲ [2] مثنوی دفتر اول ص۹۲ [3] آیت ۲۸۵ سورہ بقرہ
[4] مثنوی دفتر اول ص۲۵۳

کسی زبان میں ہو اور کسی قوم کے نبی کی ہو۔

عرفانِ رسول عرفانِ حق کا وسیلہ ہے | نعتیہ شاعری میں حقائقِ محمدیہ کے مربوط تصورات موجود ہیں۔ اکابر صوفیہ کے اندر عظمت، محبت اور اتباعِ نبوی کے جذبات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، ان کے نزدیک عرفانِ رسول ہی عرفانِ حق کا وسیلہ ہے،

از اندر دولت گر بہر عرفان خدا باشد　　　　فدائے شان و لطف محمد شو محمد شو[۱]

اصلاحِ انسانیت میں نعتیہ شاعری کا حصہ | انسان نے کائنات کی جس قدر تسخیر کی ہے اس تناسب سے اپنے آپ کی خواہشات اور اپنے عادات کو حق و صداقت کے آگے نہ جھکا سکا، باہم جنگ و جدل کا یہی سبب ہے، اس حالت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد و اقوام کی نگاہ کو نسلی، جغرافی یا ثقافتی حدود سے بالاتر کر کے ان کے اندر ایک صحیح، قوی اور وسیع انسانیت اور متوازن سیرت کا جذبہ پیدا کیا جائے، اس کام میں اس ادبی سرمایہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جس میں سیرتِ انسانی کی بلند مثالیں اور محاسن پیش کیے جاتے ہیں۔ ان ادبیات میں شاعری کا وہ شعبہ سب سے زیادہ قیمتی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کے محاسن بیان کیے گئے ہیں۔

متوازن سیرت اور نعتیہ شاعری | نعتیہ شاعری فنی خوبیوں کے پیرایہ میں سیرت کا وہ کامل نمونہ یا اسوۂ حسنہ پیش کرتی ہے جس میں جذبۂ تسخیرِ کائنات اور روحِ تسلیم بہ حق کمالِ حسن و تناسب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یعنی انسان ساری کائنات کو اپنے لیے جھکائے اور خود اپنے آپ کو حق کے آگے جھکا دے۔ اس کو پائدار اور ترقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایسی سیرتوں کا علم،

---

[۱] دیوان شاہ نیاز احمد ص۲۹

ان کی محبت اور اتباع اولین شرط ہے۔

خارجی انقلاب، باطنی تربیت اور نعتیہ شاعری

زندگی کے خارجی ماحول میں کوئی دیرپا انقلاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ نفسِ انسانی کے اندرونی احساسات و اقدار میں انقلاب نہ ہو۔ اس انقلابِ حال کو بروئے کار لانے کے لیے نعتیہ شاعری سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے مضامین کا اکثر حصہ ان اخلاقی اور روحانی حقائق اور اجتماعی اقدار پر مشتمل ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

مختلف تہذیبوں کا باہمی تعارف اور نعتیہ شاعری

اسی طرح مختلف قوموں اور تہذیبوں کے باہمی تعارف و تعاون کی ترقی کے لئے بھی ایسے ادب کے عمیق اور وسیع مطالعہ و اشاعت کی ضرورت ہے جس سے مختلف اقوام کے مقدس پیشواؤں کی انسانی خدمات اور تبلیغ و ہدایت کی عظمتوں سے آگاہی حاصل ہوسکے ح انبیاء یا نعتیہ شاعری کا مطالعہ بھی ان مقاصد عالیہ کی تکمیل کا ایک نہایت اہم اور لطیف وسیلہ ہے۔

ذاتی ذوق اور انتخابِ موضوع

میرے شخصی ذوق اور مزاج کو بڑے انسانوں اور مشاہیر کی تاریخ اور تعریف سے غیر معمولی شغف ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ خدا کی خدائی میں سب سے بڑی نعمت، بڑے انسان ہوتے ہیں اور سارے انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والتسلیم) انسانیت کی جان اور آدمیت کی شان ہیں۔ بلکہ میری نگاہ میں تو ایک لحاظ سے سب سے بڑے آدمی جزواً جزواً کمالاتِ انبیاء ہی کا عکس ہوتے ہیں جن کا مرکز حقیقتِ محمدیہ ہے۔

بہ چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ؎ ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نعتیہ شاعری کی ادبی قدر و قیمت

نعتیہ شاعری کا دامن بہار حدیقہ، نکات مخزن الاسرار، نور مطلع الانوار اور تحائف تحفۃ الاحرار سے ع داماں باغباں و کف گلفروش ہے۔ شاعری کے جس میدان میں سنائی نے حدیقہ آرائی کی، خاقانی نے قصیدہ خوانی کے جوہر دکھائے، نظامی نے نظم پروین کا رنگ جمایا، عطار نے عطر بیزی سے مشام جان کو معطر فرمایا، رومی نے حکایت نے سنائی، سعدی نے سادگی و پرکاری کا ہنر دکھایا، خسرو نے شیریں سخنی کا خراج ادا کیا، جامی نے جس جام میں عکس رخ یار دکھایا، قدسی نے جس چمن قدس میں نغمہ خوانی کی، عرفی نے جس راستہ میں سر کو قلم بنایا، اور اقبال نے جس موضوع کی بدولت شعر و سخن کو بلند اقبال کیا، کیا کسی سخن شناس کو شاعری کے اس شعبہ کی معنوی رفعت، ادبی قدر و قیمت، اور شاعرانہ اہمیت سے انکار یا اختلاف ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب دینا تحصیل حاصل ہے۔

نعتیہ شاعری مختلف اصناف سخن میں

نعتیہ شاعری کسی ایک صنف شاعری میں محدود نہیں ہے، یہ ایک وسیع موضوع ہے اور ہر صنف سخن پر حاوی ہے۔ نعت نبوی میں قصیدے بھی لکھے گئے ہیں، مثنویات و غزلیات بھی لکھی گئی ہیں اور رباعیات بھی تحریر ہوئی ہیں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صوفیانہ اور نعتیہ شاعری نے ہر صنف سخن کی معنویت اور ادبیت کو بلند کرنے میں خاص حصہ لیا ہے، اگر فارسی شاعری کو صوفیانہ میدان فکر اور نعتیہ شاعری جیسے موضوع نہ ملتے تو لطافت اور نزاکت سخن کے یہ مدارج عالیہ اس کے نصیب میں کہاں آتے۔

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی ؎ چندیں سخن نغز کہ گفتی کہ شنیدی

فقیہ ابوالعماد شبلی

از

از عبدالسلام قدوائی ندوی

انگریزی کے مشہور ادیب اور نامور مصنف واشنگٹن ارونگ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "جس طرح بڑے درخت کے سایہ میں چھوٹے پودے مرجھا جاتے ہیں اسی طرح بڑے آدمی کے زیرسایہ چھوٹے آدمی مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں" یہی حال علامہ شبلی کے ہمنام و معاصر مولانا شبلی کا ہوا۔ وہ اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت رکھتے تھے یوں تو تمام علوم مروجہ میں انھیں دسترس حاصل تھی لیکن فقہ و اصول میں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بڑی گہری تھی نحو پر تو اتنا عبور رکھتا کہ انھیں امام نحو کہنا مبالغہ نہ ہوگا اس علمی کمال کے ساتھ اصلاح و تربیت کا بہت اچھا سلیقہ تھا ساری عمر طلبہ کی نگرانی ان کے سپرد رہی تدریس میں ایسی مہارت تھی کہ بابد و شاید ان کی درسی تقریر بڑی واضح موثر اور دل نشین ہوتی تھی مشکل سے مشکل مباحث ان کے بیان سے پانی ہو جاتے تھے۔

لیکن ان صلاحیتوں کے باوجود ان کا نام ہنوز غیر معروف ہے اور پچاس ساٹھ برس کی خدمات اب تک پردۂ خفا میں روپوش ہیں۔ ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ان کی تربیت سے بھی مستفیض ہوا ہوں ان کی رہنمائی میں کئی برس تعلیم و تربیت کی خدمت بھی انجام دی ہے اس لیے ان کو قریب سے دیکھنے ان کی باتیں سننے اور

ان کے حالات و معمولات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس وقت ان کی وفات کو ۵۳ سال ہو چکے ہیں، رفقا و احباب سب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، شاگردوں کی بڑی تعداد بھی ختم ہو گئی ہے، ان حالات میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے دماغ میں جو واقعات محفوظ ہیں انھیں قلمبند کر دوں تاکہ نئی نسل ان کے حالات اور کارناموں سے واقف ہو جائے ممکن ہے کسی کے دل میں ان کی مثالِ نیک کو نمونۂ عمل بنانے کا خیال ہو،

خاندان اور پیدائش | مولانا کے والد شیخ محمد علی اعظم گڈھ کے مشہور گاؤں چیراج پور سے تعلق رکھتے تھے، ان کی زندگی یہیں بسر ہوئی، زمین داری ذریعۂ معاش تھی، اس کے ساتھ زراعت کا مشغلہ بھی تھا، اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آرام سے گذر ہوتی تھی، مولانا شبلی یہیں پیدا ہوئے، سالِ پیدائش کے بارہ میں صحیح علم نہیں ہے تذکرہ نگاروں نے اس بارہ میں کچھ نہیں لکھا لیکن ان کی وفات بڑی کبر سنی کی حالت میں ہوئی تھی، اس وقت عمر اسی سے متجاوز تھی، پچاسی سے کم نہ ہوگی، اس حساب سے سالِ پیدائش ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) ہوگا، ممکن ہے دو ایک سال کم و بیش ہو لیکن زیادہ فرق نہ ہوگا۔

ابتدائی تعلیم | اس زمانہ میں گاؤں گاؤں مدرسے قائم تھے، جہاں ذی استعداد علماء درس دیتے تھے، اکثر اہلِ علم دور دراز کی درسگاہوں میں ملازمت پسند نہیں کرتے تھے، اور اپنے ہی وطن میں قناعت کے ساتھ رہتے اور اہلِ وطن کی خدمت کرتے، وہ گھر کے دال دلیہ کو باہر کے پلاؤ قورمہ پر ترجیح دیتے تھے، ان نیک نفس، سادہ مزاج اور قناعت پسند بزرگوں کی بدولت پورب کا یہ علاقہ علم کا مرکز بن گیا تھا

جو بچتے تھے ان میں مہینہ بھر کا جیب خرچ ہو جاتا تھا، عجب سستا زمانہ تھا، اس دن کی ارزانی کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا، بھلا کون ایک روپیے کے ۴۵ سیر گیہوں ڈھائی سیر خالص گھی، اور بارہ سیر بکری کے گوشت کا خیال کر سکتا ہے، پرانے بزرگوں کی یہ باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی کچھ جھلک تو میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھی ہے، اور اس سے پچاس برس پہلے کا حال بزرگوں سے سنا ہے، اسلیے مولوی صاحب کے بیان پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ الغرض اس دور روپے ماہوار میں وہ آرام سے زندگی بسر کرتے تھے اور اطمینان و دلجمعی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے، مولوی صاحب لکھنؤ کے قیام کے حالات اور تعلیمی مشاغل کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے، اور اس دور کے بعض طلبہ کی خدا ترسی اور پرہیزگاری کے حیرت انگیز واقعات سناتے تھے،

رام پور کا قیام لکھنؤ میں مولانا کے اصل مربی اور استاد مولانا حفیظ اللہ تھے، وہ مولانا عبد الحئی کے نامور شاگرد تھے، اس لیے ان کی شہرت دور دور تک تھی، مدرسہ عالیہ رامپور میں تدریس کے لیے ان کو بلایا گیا، انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی، ان کے پیچھے مولانا شبلی بھی رام پور چلے گئے، اور کئی سال وہاں قیام کر کے مولانا حفیظ اللہ اور دوسرے اساتذہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی، یہ نواب کلب علی خاں کا آخری دور تھا، ان کی قدر دانی نے رام پور کو اہل علم و کمال کو مرکز بنا دیا تھا، مولانا ارشاد حسین جیسے فقیہ اور اہل دل، مولانا عبد الحق خیرآبادی جیسے علامۂ عصر، مولانا حسن شاہ جیسے محدث، مولانا ہدایت اللہ جیسے امام معقولات، منشی امیر مینائی، نواب مرزا داغ اور اسیر لکھنوی جیسے اساتذۂ سخن کی موجودگی سے رام پور دار السرور ہی نہیں دار العلم والادب بھی بن گیا تھا اور اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی،

اہل علم سے استفادہ | اس فضا میں مولانا شبلی نے علم و فن کے مدارج عالیہ طے کیے۔ مولانا حفیظ اللہ پہلے مدرس تھے لیکن آگے چل کر صدر مدرس ہو گئے، ان کی اس ترقی نے ان کے شاگرد شبلی کی رسائی اور بڑھا دی اور انھیں مشاہیر علم و ادب سے استفادہ کا زیادہ موقع ملنے لگا،

مولانا عبدالحق خیرآبادی کی خدمت میں | مولانا عبدالحق خیرآبادی کی شان و تمکنت کا حال جن لوگوں کو معلوم ہے وہ جانتے ہیں، ان کی بارگاہ میں حاضری اور ان سے استفادہ ہر شخص کے بس میں نہ تھا، ان کی خودداری، اور نازک مزاجی سے نواب کلب علی خاں، جیسے صاحب جبروت ڈرتے تھے، منشی امیر مینائی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نواب صاحب نے کہا کہ میں محرور المزاج ہوں، اس لیے مجھے غصہ آتا ہے تو اسے دبانا مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات ضبط کرنا پڑتا ہے تو حرارت ہو جاتی ہے، مولانا عبدالحق نے کہا بھلا وہ کون ہے جس کا آپ کو اتنا لحاظ کرنا پڑتا ہے تو فرمایا کہ ایک تو آپ ہی ہیں، پھر منشی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دوسرے یہ منشی امیر مینائی تو بڑے حلیم اور نرم مزاج تھے لیکن مولانا عبدالحق بڑے تیز اور حاضر جواب تھے، کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف ہو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور برجستہ کوئی فقرہ کہہ دیتے تھے،

نواب صاحب بچ کو جانے والے تھے، خیال ہوا کہ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتے ہیں، شاید انھوں نے امام مالکؒ کے نامور شاگرد یحییٰ کا واقعہ سنا ہو کہ ایک مرتبہ کہیں سے کوئی ہاتھی آگیا تھا، ہاتھی عرب میں نایاب ہیں، طلبہ نے سنا تو حلقۂ درس سے نکل کر سب اسے دیکھنے کے لیے چلے گئے، امام مالک نے یحییٰ سے کہا کہ تم بھی جاکر دیکھ لو، تمھارے ملک

اور شیراز ہند کہلاتا تھا، مولانا عبد اللہ ایسے ہی صاحب ایثار لوگوں میں تھے
انھوں نے علوم مروجہ کی تعلیم مولانا محمد یوسف فرنگی محلی سے حاصل کی تھی جو ان
دنوں جون پور کے مدرسۂ حنفیہ میں مدرس تھے، مولانا محمد یوسف کے علاوہ دوسر
کے دوسرے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا، حدیث کی تعلیم میاں سید نذیر حسین سے حاصل کی
ان علوم دینیہ کے ساتھ طب کی تحصیل خاندان شریفی کے نامور طبیب حکیم محمود
خاں دہلوی سے کی تاکہ خدمت خلق کے ساتھ مصارف زندگی میں بھی اس سے مدد
ملے اس علم وکمال کے حصول کے بعد وہ اپنے وطن جیراجپور واپس آگئے اور یہیں
مسند درس بچھادی، تدریس کے علاوہ خالی اوقات میں مطب بھی کرتے تھے،

ان کا حلقۂ درس بہت مشہور ہوا، اطراف وجوانب سو طلبہ ان کی خدمت میں
حاضر ہوتے تھے اور اس دریائے علم سے سیرابی کے بعد اپنے اپنے اطراف میں تشنگان
علم کی پیاس بجھاتے تھے، اس زمانہ کے متعدد نامور علما ان کے شاگردوں کی صف
میں نظر آتے ہیں، مولانا سلامت اللہ، مولانا حیدر علی، مولانا عبد اللہ اور علامہ
شبلی سبھی نے ان سے اکتساب فیض کیا، صاحب تذکرہ مولانا شبلی بھی اردو و فارسی
خواندگی کے بعد ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور
فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

مولانا عبد الحی فرنگی محلی کی خدمت میں | اس زمانہ میں مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی کی بڑی شہرت
تھی، سارا ملک ان کے تبحر علم کا قائل تھا اور ان کی وسعت نظر، فکر عمیق
قوت تدریس اور فصاحت بیان کا دور دور چرچا تھا، مولانا عبد اللہ بھی
ان کے علم وکمال کا ذکر کرتے رہتے تھے، یہ سن کر مولانا شبلی کو بھی لکھنؤ

یاں ہوا ان کے ایک بزرگ استاد اور مربی مولانا حفیظ اللہ مولانا عبدالحی کے
ز شاگرد تھے، وہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں ان کے قریب ہی مقیم تھے اور ان کے
سے کچھ درس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے ان کے سہارے مولانا شبلی لکھنؤ
نچے، مولانا عبدالحی بہت مصروف رہتے تھے، دور و نزدیک کے استفتوں کے جواب
در اونچی کتابوں کے درس میں ان کا وقت گزرتا تھا، چھوٹی کتابیں ان کے
اگرد پڑھاتے تھے، اس طرح مولانا شبلی عموماً اپنی درسی کتابیں مولانا حفیظ اللہ
ے پڑھتے تھے لیکن مولانا عبدالحی کی خدمت میں بھی کبھی کبھی باریابی کا موقع مل
جاتا اور ان کے مواعظ میں بھی شریک ہوتے، جمعہ کی نماز کے بعد عصر تک ان
کا وعظ ہوتا تھا، جو وسعت معلومات، حسن بیان اور قوت تاثیر میں بے نظیر ہوتا
تھا، مولانا شبلی اسباق کے علاوہ اس مجلس وعظ میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے
طلبہ زیادہ تر فرنگی محل کے قرب و جوار کی مسجدوں میں مقیم ہوتے تھے، چوک
میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد خاصی وسیع تھی، بہت سے طالب علم اس میں قیام
کرتے تھے، مولانا شبلی بھی اسی مسجد میں رہتے تھے، اکثر طلبہ کے وظائف تھے، اور
خوشحال لوگ ان کی مدد کرتے تھے، لیکن مولانا شبلی نے اسے پسند نہیں کیا کہ اپنا
بار دوسروں پر ڈالیں، اس لیے جو کچھ والد بھیجتے تھے اسی پر گذر کرتے تھے زمانہ بھی
ارزانی کا تھا، کہتے تھے کہ دو روپے ماہوار گھر سے آتے تھے ایک روپیہ چھ آنے ماہوار
میں گوشت روٹی دال چاول، دونوں وقت حسب دلخواہ باورچی کے یہاں سے
مل جاتے تھے اور جو ملازم کھانا لے کر آتا تھا دو آنے ماہوار اس کی اجرت ہوتی
تھی، اسی میں وہ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا، اس کے بعد آٹھ آنے ماہوار

جو بچتے تھے ان میں مہینہ بھر کا جیب خرچ ہو جاتا تھا، عجب سستا زمانہ تھا، اس وقت کی ارزانی کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا، بھلا کون ایک روپیہ کے ۴۵ سیر گیہوں ڈھائی سیر خالص گھی، اور بارہ ۱۲ سیر بکری کے گوشت کا خیال کر سکتا ہے، پرانے بزرگوں کی یہ باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن اس کی کچھ جھلک تو میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھی ہے، اور اس سے پچاس برس پہلے کا حال بزرگوں سے سنا ہے، اسلئے مولوی صاحب کے بیان پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ الغرض اس دور روپے ماہوار میں وہ آرام سے زندگی بسر کرتے تھے اور اطمینان و دلجمعی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے، مولوی صاحب لکھنؤ کے قیام کے حالات اور تعلیمی مشاغل کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے، اور اس دور کے بعض طلبہ کی خدا ترسی اور پرہیزگاری کے حیرت انگیز واقعات سناتے تھے،

رام پور کا قیام | لکھنؤ میں مولانا کے اصل مربی اور استاد مولانا حفیظ اللہ تھے، وہ مولانا عبدالحئی کے نامور شاگرد تھے، اس لیے ان کی شہرت دور دور تک تھی، مدرسہ عالیہ رامپور میں تدریس کے لیے ان کو بلایا گیا، انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی، ان کے پیچھے مولانا شبلی بھی رام پور چلے گئے اور کئی سال وہاں قیام کر کے مولانا حفیظ اللہ اور دوسرے اساتذہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی، یہ نواب کلب علی خاں کا آخری دور تھا، ان کی قدر دانی نے رام پور کو اہل علم و کمال کا مرکز بنا دیا تھا، مولانا ارشاد حسین جیسے فقیہ اور اہل دل، مولانا عبدالحق خیرآبادی جیسے علامۂ عصر، مولانا حسن شاہ جیسے محدث، مولانا ہدایت اللہ جیسے امام معقولات، منشی امیر مینائی، نواب مرزا داغ اور اسیر لکھنوی جیسے اساتذہ سخن کی موجودگی سے رام پور دار السرور ہی نہیں دار العلم والادب بھی بن گیا تھا، اور اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی،

اہل علم سے استفادہ | اس فضا میں مولانا شبلی نے علم و فن کے مدارج عالیہ طے کیے
مولانا حفیظ اللہ پہلے مدرس تھے لیکن آگے چل کر صدر مدرس ہو گئے، ان کی اس ترقی
نے ان کے شاگرد شبلی کی رسائی اور بڑھا دی اور انھیں مشاہیر علم و ادب سے
استفادہ کا زیادہ موقع ملنے لگا،

مولانا عبدالحق خیرآبادی کی خدمت میں | مولانا عبدالحق خیرآبادی کی شان و تمکنت کا حال جن لوگوں کو معلوم ہے وہ جانتے ہیں، ان کی بارگاہ میں حاضری اور
ان سے استفادہ ہر شخص کے بس میں نہ تھا، ان کی خودداری اور نازک مزاجی سے
نواب کلب علی خاں، جیسے صاحب جبروت ڈرتے تھے، منشی امیر مینائی کا بیان ہے
کہ ایک مرتبہ نواب صاحب نے کہا کہ میں محرور المزاج ہوں، اس لیے مجھے غصہ آتا ہے تو اسے
دبانا مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات ضبط کرنا پڑتا ہے تو حرارت ہو جاتی ہے، مولانا
عبدالحق نے کہا بھلا وہ کون ہے جس کا آپ کو اتنا لحاظ کرنا پڑتا ہے تو فرمایا کہ ایک
تو آپ ہی ہیں، پھر منشی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دوسرے یہ منشی امیر مینائی تو
بڑے حلیم اور نرم مزاج تھے لیکن مولانا عبدالحق بڑے تیز اور حاضر جواب تھے،
کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف ہو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور برجستہ
کوئی فقرہ کہہ دیتے تھے،

نواب صاحب کو بچپن ہی سے خیال ہوا کہ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتے ہیں، شاید انھوں
نے امام مالکؒ کے نامور شاگرد یحییٰ کا واقعہ سنا ہو کہ ایک مرتبہ کہیں سے کوئی ہاتھی
آگیا تھا، ہاتھی عرب میں نایاب ہیں، طلبہ نے سنا تو حلقۂ درس سے نکل کر سب اسے
دیکھنے کے لیے چلے گئے، امام مالک نے یحییٰ سے کہا کہ تم بھی جا کر دیکھ لو تمھارے ملک

اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتے ہیں لیکن یحیٰ نے عرض کیا میں یہاں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا ہوں، میں تو اتنا دور دراز کا فاصلہ طے کرکے آپ کو دیکھنے اور آپ کی زبان سے حدیث نبوی کو سننے کے لیئے حاضر ہوا ہوں، نواب صاحب نے ارادہ کیا کہ اپنے ساتھ سفر حج میں ہاتھی لے جائیں تاکہ اس بھاری بھرکم جانور کو دیکھ کر عرب محظوظ ہوں اور حکم دیا کہ اس کے لیے انتظامات کیئے جائیں ایک دن مولانا عبدالحق کو انھوں نے اپنے اس ارادے سے مطلع کیا مولانا نے برجستہ کہا ایک اصحاب فیل پہلے مکہ معظمہ میں آئے تھے، اور دوسرے صاحب فیل آپ ہوں گے یہ سن کر نواب صاحب کی طبیعت مکدر ہو گئی اور ہاتھی لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی قسم کی فقرہ بازیوں نے ایک مرتبہ نواب کو بے حد برافروختہ کر دیا اور مولانا نے رام پور چھوڑ دیا، اس زمانہ میں اہل کمال کی قدردانی کا یہ حال تھا کہ فوراً مہاراجہ کشمیر نے اپنے یہاں جگہ دی لیکن وہاں رام پور والی بات کہاں تھی، ایک دن مہاراجہ کو خواہش ہوئی کہ علماء کا مناظرہ دیکھیں چنانچہ مولانا عبدالحق سے فرمایش کی کہ ایک صاحب علم سے کسی علمی مسئلہ پر ان کے سامنے بحث کریں، یہ بات مولانا کو بہت ناگوار ہوئی اور بگڑ کر کہا کہ مہاراجہ صاحب آپ نے مرغوں کی پالیاں دیکھی ہوں گی، یہ کہہ کر دربار سے چل دیئے، ادھر ان کے جانے سے نواب صاحب کو ملال تھا ہی، یہ خبر ملی تو فوراً عزت و تکریم کے ساتھ بلا بھیجا، یہ واقعہ میں نے ریاض خیر آبادی مرحوم سے سنا ہے۔

ان حالات میں مولانا عبدالحق کی خدمت میں باریابی آسان نہ تھی، مولانا شبلی نے مولانا عبدالحق سے باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں پڑھی لیکن ان کی خدمت میں

آنا جانا ہوتا تھا اس طرح ان کے خیالات سے واقفیت، ان کے علم سے استفادہ ان کے لطائف و ظرائف سے محظوظ اور ان کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا، ان کے استاد مولانا حفیظ اللہ ریاست میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کا ایک بلند علمی مقام تھا، وہ علوم نقلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ میں بھی خاص درک رکھتے تھے اور ہیئت، ریاضی اور منطق و فلسفہ میں بڑی شہرت کے مالک تھے، ان سے مولانا عبدالحق سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور بعض اوقات علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات بھی ہوتا، کبھی کبھی بحث بھی ہو جاتی تھی، مولانا شبلی اکثر ان مواقع پر موجود ہوتے اور ان دونوں بزرگوں کی گفتگو سے مستفید ہوتے، ہم لوگوں کو رامپور کے زمانۂ قیام کے حالات سناتے تو مولانا عبدالحق کے علمی کمالات کے ساتھ ان کی تمکنت نازک مزاجی، خودشناسی اور جرأت و بے باکی کے واقعات سناتے تھے،

منشی امیر مینائی کا مشورہ | مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مدرسۂ عالیہ رامپور کے اساتذہ کے علاوہ ادبی حلقوں سے بھی کسی قدر تعلق تھا، مولوی صاحب ادیب و شاعر نہ تھے لیکن سخن فہم تھے، منشی امیر مینائی کے یہاں بچوں کی تعلیم کی غرض سے زیادہ قیام رہتا، کہتے تھے کہ کئی سال ان کے مکان پر رہنے کا موقع ملا، منشی صاحب کے یہاں شعراء اور اساتذۂ سخن آیا کرتے تھے اور اکثر اپنا کلام سناتے تھے ان محفلوں کی شرکت سے مولوی صاحب کی ادبی واقفیت میں اضافہ ہوا، کبھی کبھی شعر کہنے کی بھی کوشش کرتے، ایک مرتبہ منشی صاحب سے اپنے اس شوق کا ذکر کیا، اور خواہش کی کہ وہ اس بارہ میں ان کی رہنمائی کریں، لیکن منشی صاحب نے ہمت افزائی نہیں کی اور فرمایا کہ غزل گوئی تو مشکل ہے، البتہ واقعات نظم

کرسکتے ہیں، مگر محنت کے باوجود اس میں بھی ترقی کا زیادہ امکان نہیں ہے، اس لئے بہتر ہے کہ شعر و سخن کے کوچہ میں قدم نہ رکھیں، بلکہ علوم و فنون کی طرف توجہ کریں اور معقولات و منقولات میں کمال حاصل کرکے درس و تدریس کو مشغلۂ حیات بنائیں،

اس نصیحت سے شاید وقتی طور پر کچھ صدمہ پہونچا ہو، مگر اس مشورہ نے ان کو ضیاع وقت سے بچا لیا اور انھوں نے شعر و سخن کو نظر انداز کرکے علوم اسلامیہ کی طرف پوری توجہ کی، اور ہمہ تن مطالعۂ کتب میں مصروف ہو گئے، فرماتے تھے کہ اتنی محنت کی کہ دماغ میں خشکی آگئی اور نیند غائب ہوگئی، مہینوں بے خوابی کی شکایت رہی اور بڑی دوا دوش سے یہ تکلیف دور ہوئی، ان کے گرد وپیش بڑے مخلص اور ہمدرد لوگ رہتے تھے، ورنہ جو دوائیں تجویز کی گئی تھیں ان کی فراہمی اور استعمال ممکن نہ ہوتا، مولوی صاحب کہتے تھے کہ چھ ماہ بڑی پریشانی اور بے چینی سے گذر رہے، بالآخر اللہ نے شفا بخشی اور مطالعہ پھر شروع ہو گیا،

ملازمت تعلیم مکمل ہوگئی تو ملازمت کا خیال ہوا، غازی پور میں چشمۂ رحمت عربی کا معروف مدرسہ تھا یہ مدرسہ اب بھی موجود ہے، کسی زمانہ میں اس کی بڑی شہرت تھی، بڑے نامور علماء یہاں درس دے چکے ہیں، یہ مولانا شبلی کی نوعمری اور جوانی کا زمانہ تھا، مگر استعداد بڑی پختہ تھی، منتظمین مدرسہ نے انھیں پسند کیا اور ان کا تقرر ہو گیا، کئی سال وہ چشمۂ رحمت سے وابستہ رہے،

ندوہ میں آمد علامہ شبلی ان سے پہلے سے واقف تھے، ان کی لیاقت اور قوتِ تدریس

کا انھیں پورا اندازہ تھا، جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد مقرر ہوئے اور تعلیم کی دیکھ بھال ان کے سپرد ہوئی تو فقہ کی تعلیم کے لیے ان کی نظر مولانا شبلی پر پڑی اور اصرار کرکے انھیں لائے، اس وقت ان کا سال تقرر یاد نہیں آرہا ہے، شاید ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کا کوئی مہینہ تھا، علامہ شبلی ان کے نحوی کمال کے معترف اور فقہ و اصول میں ان کی وسعت نظر کے قائل تھے، انھیں مسائل پر بہت عبور تھا اور تدریسی صلاحیت غیر معمولی رکھتے تھے، علامہ ان کے علم اور کارکردگی کے بڑے قدرداں تھے اور پیچیدہ فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے،

علامہ شبلی کے علاوہ ندوہ کے دوسرے ارباب حل و عقد بھی ان کی قدر کرتے تھے، ارکان، مہتمم، اساتذہ اور طلبہ سبھی ان کی عزت کرتے تھے، انھوں نے پچاس سال کا طویل زمانہ ندوہ میں گذارا، اتنی طویل مدت تک سب کا اعتماد برقرار رکھنا آسان نہیں ہے، ندوہ میں بڑے انقلابات آئے، عہدہ داروں میں ردوبدل ہوا، ناظم بدلے، متعدد مہتمم آئے اور گئے، بیسیوں اساتذہ اور کارکنوں سے سابقہ ہوا، لیکن کبھی کسی سے چپقلش نہیں ہوئی، ان کی زندگی باہمہ اور بے ہمہ تھی، تکرار تو بڑی بات ہے، کسی سے کبھی شکررنجی بھی نہیں ہوئی۔ خوشامد اور چاپلوسی کی عادت نہیں تھی، کبھی دربارداری نہیں کی، ندوہ کے عہدہ داروں یا شہر کے صاحبان دولت و ریاست، وہ کسی کے گھر پر حاضری کے عادی نہیں تھے، کسی کام کے لیے بلائے جاتے یا کوئی ضروری مشورہ ہوتا تو چلے جاتے اور کام کے بعد واپس آجاتے، بات صاف اور بے لاگ کہتے، لیکن اس طرز عمل کے باوجود کوئی ان سے ناراض نہ ہوتا لوگ ان کے اخلاص اور حسن نیت کے قائل تھے، اسی لیے ان کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے،

بورڈنگ کی نگرانی | تعلیم کے ساتھ طلبہ کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی، ملازمت کے آغاز سے سبکدوشی کے وقت تک برابر یہ خدمت انجام دیتے رہے، بڑے لڑکوں کے بھی نگراں ہوتے تھے، اور چھوٹوں کے بھی، اس وقت عمارتیں زیادہ نہیں تھیں، اکیلی دارالعلوم کی عمارت ہی طلبہ کی قیام گاہ بھی تھی، اور درس گاہ بھی، ہال میں تعلیم ہوتی تھی، اور اس کے دونوں طرف کے کمروں میں طالب علم رہتے تھے، عموماً ایک طرف بڑے لڑکے رہتے، اور دوسری طرف چھوٹے، دارالعلوم اتنا وسیع نہیں تھا، نہ ابتدائی درجات تھے، نہ ثانوی، نہ دفاتر تھے، نہ مطبخ و مکتبہ، بس ایک درجہ فارسی کا تھا، اور آٹھ عربی کے، ہال سے متصل مشرقی، مغربی جانب کے دونوں بڑے کمروں کی چھت نہیں تھی، ہر طرف دو دالان اوپر اور دو نیچے تھے، ان آٹھ دالانوں میں عربی کے درجے ہوتے تھے، اور ہال کے ایک کونہ میں فارسی کی تعلیم ہوتی تھی، عربی کے پہلے درجہ میں اگر طلبہ زیادہ ہوتے تو ڈائس پر بھی ایک درجہ لگا دیا جاتا، نمازیں سب ہال کے درمیان میں ہوتی تھیں روزانہ کی پنج وقتہ بھی، اور جمعہ کی بھی،

آج اس تنگی سے گذر کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اب تو بڑی بڑی متعدد عمارتیں بن گئی ہیں، اور اس کے باوجود تنگ دامانی کا شکوہ ہے، اب طلبہ کی تعداد بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، ۱۹۲۳ء میں جب میں دارالعلوم میں داخل ہوا تو مولانا شبلی خورد و کلاں سب طلبہ کے تنہا نگراں تھے، مطبخ کی دیکھ بھال بھی ان کے سپرد تھی، کھانا دارالطعام (ڈائننگ ہال) میں ہوتا تھا، اور مریضوں کے سوا سبھی طالب علم وہیں کھاتے تھے کھانا شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے مولانا وہاں پہنچ جاتے اور کھانا ختم ہونے کے ایک گھنٹہ بعد واپس آتے تھے، جاڑے

گرمی، برسات، ہر موسم میں یہی مستقل معمول تھا۔ کھانے کی تقسیم میں ملازمین کا ہاتھ بٹاتے اور گھوم پھر کر دیکھتے رہتے کہ طلبہ اطمینان و خوش اسلوبی کے ساتھ کھا رہے ہیں اور کہیں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے۔ تقریباً بیس سال مطبخ کا انتظام ان کے سپرد رہا۔ اس اثنا میں پہلی جنگ عظیم کا مشکل زمانہ آیا اور اس کے بعد سالہا سال اشیا کی گرانی اور نایابی کا دور دورہ رہا لیکن مولانا کے حسن انتظام کی بنا پر طلبہ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے پائی نہ فیس طعام میں غیر معمولی اضافہ ہو سکا۔ بورڈنگ میں طلبہ کی تربیت اور دیکھ بھال کی جانب بڑی توجہ رکھتے۔ بعض طلبہ اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ بعض اوقات بستر پر پیشاب کر دیتے تھے۔ مولانا بذات خود بستر دھلاتے اور انھیں صاف کپڑے پہناتے۔ بعض بچے والدین سے چھٹنے کی بنا پر غمگین ہوتے، انھیں تسکین دیتے اور اپنی پُر لطف باتوں سے ان کا غم غلط کرتے، لیکن مولوی صاحب کی یہ شفقت ان کو بے راہ رو نہیں ہونے دیتی تھی۔ اللہ نے ان کا رعب ایسا دلوں پر قائم کر دیا تھا کہ کسی کو ان کی حکم عدولی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان کی ایک آواز سے لوگ کانپ جاتے۔ صبح کی اذان کے بعد اور عشا سے پہلے دو سارے بورڈنگ کا گشت کرتے اور لڑکوں کو نماز با جماعت کی تلقین کرتے۔ کبھی کسی اور وقت بھی آ جاتے۔ اس طرح طلبہ کے حالات اور ان کی ضروریات کی پوری خبر رکھتے۔ وہ شاید ہی کسی کو سزا دیتے ہوں۔ میں نے انھیں کبھی کسی کو مارتے نہیں دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیتے لیکن ان کی یہ ڈانٹ سو سزاؤں سے بھی بڑھ کر تھی۔ بڑے سے بڑے سرکش طالب علم لرز جاتے تھے۔ طالب علمی کے بعد بھی ان کے رعب میں کوئی کمی نہ آتی تھی بلکہ زندگی بھر اس کا اثر رہتا تھا۔ میں نے متعدد ذی حیثیت اور صاحب اثر و رسوخ ندویوں کو دیکھا ہے کہ مولوی صاحب کے سامنے

ان پر طالب علمی کی وہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی' مولانا مسعود علی بڑی آن بان کے ندوی تھے' ان کے سامنے اچھے اچھوں کو یارائے سخن نہ تھا' دہ ندوہ کی مجلس منتظمہ کے با اثر رکن بھی تھے اور ایک عرصہ تک سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے' مگر مولوی صاحب کے سامنے ان کی ساری طاقت لسانی ختم ہو جاتی تھی' بڑی احتیاط کے ساتھ بولتے اور گفتگو میں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھتے' مگر اس رعب و داب کے باوجود وہ کسی کو تکلیف نہیں پہونچاتے تھے اگر ان کو محسوس ہوتا کہ ان کی کوئی بات کسی کی دل آزاری کا باعث ہوئی تو اس سے معافی مانگنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

دبدبہ کے ساتھ ان کے اندر محبت و شفقت بھی بہت تھی وہ ایک مربی اور معلم کی حیثیت سے طلبہ کے احتساب پر مامور تھے' کبھی کبھی انھیں تنبیہ و تادیب سے بھی کام لینا پڑتا تھا' لیکن اس کے ساتھ انھیں خدا کے سامنے اپنے محاسبہ کا بھی ہر وقت خیال رہتا تھا' وہ روز جزا کی باز پرس سے ڈرتے رہتے اور کوشش کرتے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے' اس احساس نے ان کے اندر عفو و درگذر کا بڑا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کا دل بغض و نفرت سے پاک تھا اور چاہتے تھے کہ دوسروں کے دل بھی ان کی طرف سے اسی طرح صاف رہیں' راقم الحروف نے بار ہا انھیں اپنے خوردوں سے معافی مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔

طلبہ کی عزت نفس کا خیال | ادبیہ کی سطور میں طلبہ اور ملازمین و ماتحتین کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کا ذکر آچکا ہے وہ سب کی عزت کا خیال رکھتے تھے اور کسی کی خودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے تھے' مدرسوں میں غریب طالب علم خاص طور

سے منتظمین کی زد میں رہتے ہیں، اور ان کو دبا کر دوسروں پر دبدبہ قائم کیا جاتا ہے کمزوروں پر زور آزمائی دنیا کا عام دستور ہے مگر مولوی صاحب کا مزاج بالکل اس کے برعکس تھا وہ کمزوروں کو نظرِ عنایت سے دیکھتے' محبت کے ساتھ پیش آتے اور کوشش کرتے کہ نہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگنے پائے نہ ان کی عزتِ نفس مجروح ہو' ندوہ کے بانیوں کے پیشِ نظر تھا کہ نادار اور خوش حال طلبہ کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جائے اور روز مرہ کی زندگی میں ایسا معمول رکھا جائے کہ غریبوں کو اپنی غربت و تنگدستی کی وجہ سے نہ کوئی پریشانی ہو' نہ ان کی آنکھ نیچی ہو نہ ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو اس طرزِ عمل کی بنا پر غیر مستطیع طالب علموں کے معیارِ زندگی کو اتنا بلند رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان کو دیکھ کر کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ غریب ہیں برسوں ایک ساتھ بیٹھنے اور ایک ہی کمرہ میں رہنے کے باوجود پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون مستطیع ہے اور کون غیر مستطیع' ان لوگوں کو دیکھ کر قرآن مجید کی یہ آیت یاد آتی تھی۔

یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف۔	خودداری کی وجہ سے ناواقف انھیں غنی سمجھتے ہیں۔

اس روایت کے قائم رکھنے میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا وہ یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ طالبانِ وظائف کو درخواست کی منظوری کی اطلاع بھی بڑی پوشیدگی کے ساتھ دیتے تھے' بعض طلبہ اتنے غریب ہوتے تھے کہ کپڑے بھی نہیں بنا سکتے تھے ایسے لڑکوں کے لئے کپڑے اور جاڑے میں لحاف گدے بڑے احتیاط کے ساتھ تیار کرائے جاتے اور رات میں جب سناٹا ہو جاتا تو چپکے سے ان کے پاس پہونچا دیتے' لیکن وہ واقف دوستوں سے

نقد رقم دلا دیتے یا کوئی ایسی ترکیب کرتے کہ اس کے ساتھی یہ نہ سمجھ پائیں کہ مدرسہ کی طرف سے یہ سامان فراہم کیا گیا ہے، کمال یہ تھا کہ آٹھ آٹھ سال ساتھ رہنے کے باوجود خوشحال طالب علم اپنے نادار ساتھی کی ناداری سے ناواقف رہتے، اس میں مولوی صاحب کی احتیاط کے ساتھ اس دور کے طالب علموں کے رکھ رکھاؤ کو بھی بڑا دخل تھا، وہ غریبی میں خودی کی نگہبانی کا ڈھنگ جانتے تھے، ان کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر اکثر زبان پر آجاتا تھا۔

غریبی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ منعم کو گدا کے خوف سے بخشش کا نہ تھا یارا

خطرہ میں پڑ کر دوسروں کی حفاظت | طلبہ کو نقصان اور تکلیف سے بچانے کی بڑی فکر تھی ان کی حفاظت میں بعض اوقات اپنے کو خطرہ میں ڈال دیتے تھے، علامہ شبلی کی ندوہ سے علٰحدگی کے بعد دارالعلوم کے طالب علموں نے اسٹرائک کردی جس کا سلسلہ کئی مہینے جاری رہا، اخبارات نے پرزور مضامین لکھے، زعمائے ملت نے مدلل بیانات دیئے، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، نواب علی حسن اور ناظر یار جنگ وغیرہ متعدد سربرآوردہ اصحاب نے علامہ کی حمایت میں غیر معمولی جد و جہد کی، ان حالات کی تفصیل حیات شبلی اور الہلال کے اوراق میں پڑھی جاسکتی ہے۔

اس زمانہ میں مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری ندوہ کے ناظم ہوگئے تھے، وہ علامہ شبلی کے حریف سمجھے جاتے تھے اس لیے یہ سارا ہنگامہ انھیں کے خلاف تھا، بڑی عمر کے سب طالب علم اسٹرائک میں شریک تھے صرف کچھ چھوٹے بچے دارالعلوم میں باقی رہ گئے تھے، مولانا شبلی ان لوگوں کے نگراں بھی تھے اور قائم مقام مہتمم بھی، ان بچوں میں

مولوی سعد الدین انصاری بھی تھے، اس وقت ان کی عمر دس بارہ سال کی تھی، ان کے بڑے بھائی پروفیسر عبد الباری ندوی علامہ کی حمایت میں سرگرم عمل تھے، اتفاق سے اسی زمانہ میں سعد الدین صاحب نے بچوں کے کسی رسالہ میں ایک مضمون لکھا، مولانا عبد الباری نے چھوٹے بھائی کی ہمت افزائی کے لیے انھیں لکھا کہ تم نے خوب لکھا ہے، اس مضمون کا ندوہ کے اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہ تھا، مگر مولانا خلیل الرحمٰن کی اس خط پر نظر پڑی تو انھوں نے سمجھا کہ سعد صاحب نے ان کے خلاف مضمون لکھا ہے اور بازپرس کے لیے انھیں طلب کیا، مولوی صاحب لے کر گئے، سعد صاحب نے بہت صفائی دی، مولوی صاحب نے بھی یقین دلایا کہ یہ چھوٹا سا بچہ آپ کے خلاف کوئی مضمون نہیں لکھ سکتا ہے، مگر مولانا عبد الباری کے مخالفانہ رویہ کی وجہ سے مولانا خلیل الرحمٰن کا شبہہ دور نہیں ہوا اور سزا دینے کے لیے بید اٹھا لیا، یہ دیکھ کر سعد صاحب کے ہوش اڑ گئے، انھوں نے بھاگ کر مولانا شبلی صاحب کے دامن میں پناہ لی، مولانا خلیل الرحمٰن اس بات پر ان سے ناراض ہو گئے اور ان کی برخاستگی کا حکم دے دیا، مگر اتنے بڑے مدرس اور قائم مقام مہتمم کی علیحدگی مجلس انتظامی کی منظوری کے بغیر محض ناظم کے حکم سے نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے یہ حکم نافذ نہ ہو سکا، مگر وہ اتنے خفا تھے کہ اپنے زمانۂ نظامت میں ان کی کوئی ترقی نہیں ہونے دی، یہ واقعہ مولوی صاحب کی زبان سے میں نے خود سنا ہے۔

ذوقِ تدریس | مولانا کو تدریس سے بڑی دلچسپی تھی، وہ بڑے شوق سے طلبہ کو درس دیتے تھے، مدرسہ کی طرف سے پانچ گھنٹے کی تعلیم ان کے سپرد تھی، لیکن وہ اس کے علاوہ شب و روز درس دیتے رہتے تھے، جس کا سلسلہ نماز فجر کے بعد ہی شروع ہو جاتا تھا، مولانا حفیظ اللہ اور ان کے بعد مولانا حمید رحمٰن خاں مرحوم صبح کی نماز غلس (اندھیرے

میں شروع کرتے تھے، سلام پھیرتے وقت خاصی تاریکی ہو تی تھی، اس زمانہ میں ندوہ میں بجلی نہیں آئی تھی، لالٹین جلا کر مولوی صاحب پڑھانا شروع کرتے تھے، یہ سلسلہ نو بجے تک جاری رہتا، اسی دوران چائے بھی پی لیتے، نو بجے وہ مطبخ کی دیکھ بھال کے لیے چلے جاتے، وہاں سے واپسی پر مدرسہ کے اسباق شروع ہو جاتے، عصر کے بعد مغرب تک پھر پڑھاتے، عشا کے بعد بھی دو ایک سبق ہوتے، تعطیل کے زمانہ میں بھی یہ معمول اسی طرح جاری رہتا، بعض اوقات دارالعلوم کے طلبہ کے علاوہ دوسرے شائقین علم بھی فیضیاب ہوتے

کمالِ تقویٰ یہ خدمت وہ محض اللہ واسطے انجام دیتے تھے، اس بارہ میں کسی سے ایک حبہ کے بھی روادار نہ تھے، مدرسہ کے اوقات میں عموماً وہ فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دیتے تھے، کبھی نحو یا کسی اور فن کی کوئی کتاب بھی پڑھا دیتے، قرآن و حدیث کی تعلیم مقررہ اوقات درس کے علاوہ دیتے، فرمایا کرتے تھے کہ میں ان خالص دینی علوم کی خدمت پر کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا ہوں، اس لیے انھیں مدرسہ کے مقررہ اوقات میں نہیں پڑھاتا ہوں، ہم لوگوں نے کہا پھر آپ فقہ کیوں درجہ میں پڑھاتے ہیں، فرمایا وہ اصل دین نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت سے مجتہدین کے استنباط کردہ قوانین ہیں، ساری زندگی ان کا یہ معمول رہا، کبھی اساتذہ کی قلت ہو جاتی تو مہتمم صاحب کے حکم پر مجبوراً قرآن و حدیث کے کچھ سبق پڑھا دیتے تھے، مگر اس کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی۔

طرزِ تدریس ان کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے طالب علم سے کتاب کی عبارت پڑھواتے، تاکہ اعراب درست ہو جائیں اور عبارت کی تصحیح ہو جائے، پھر اسی سے ترجمہ کراتے ترجمہ بڑی حد تک لفظی ہوتا جسے وہ تحت اللفظ مگر بامحاورہ کہتے تھے، اس سے ان کا

مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو عبارت پڑھنے کا سلیقہ آجائے اور مطلب سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ترجمہ کی مہم سے فارغ ہو کر پھر وہ اس کی وضاحت کرتے ان کی تقریر نہ بہت مختصر ہوتی نہ بہت طویل لیکن مطالب کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی سے ہو جاتی تھی اگر طالب علم کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تو اس کی مزید وضاحت کر دیتے اس توضیح کے بعد ایک بار پھر عبارت کی تشریح کر دیتے، وہ اپنی تقریر میں دور از کار مباحث سے احتراز کرتے تھے اور طلبہ کی استعداد کے مطابق اظہارِ خیال کرتے فرمایا کرتے تھے کہ استاد کو طلبہ کے سامنے اپنی قابلیت کا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے بلکہ ان کی ضرورت اور صلاحیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ان کے اس حکیمانہ طرزِ تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ کتاب کے مطالب بھی بخوبی سمجھ لیتے تھے اور نصاب درس بھی مقررہ مدت میں پورا ہو جاتا تھا انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ درس دیا مگر اس طویل عرصہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی کوئی کتاب ختم ہونے سے رہ گئی ہو عموماً امتحان سے ایک ماہ پہلے ان کا کام پورا ہو جاتا اور طلبہ کو ایک بار پھر نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا۔

مطالعہ کی اہمیت | درسی کتابیں ان کو ازبر تھیں بعض اوقات ہم لوگوں سے کہتے کہ میں زبانی پڑھوں اور تم اسے کتاب سے ملالو مگر اس کے باوجود وہ پڑھانے سے پہلے کتاب پر ایک نظر ضرور ڈال لیتے تھے متاخرین کی کتابیں زیادہ پڑھانی پڑتی تھیں اس لیے ان کے طرزِ تحریر سے بخوبی آگاہ تھے لیکن متقدمین کی کتابیں بڑے اہتمام سے دیکھتے تھے ہم لوگ کہتے کہ متاخرین کی دقیق اور پیچیدہ عبارتوں کی آپ اتنی فکر نہیں کرتے لیکن متقدمین کی سہل اور واضح کتابوں کے مطالعہ کا اتنا اہتمام کرتے ہیں تو فرماتے کہ متاخرین کی تصانیف تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں، ان کی پیچیدگی محسوس نہیں ہوتی ہے مگر متقدمین

کی کتابوں سے سابقہ کم رہتا ہے اس لئے ان سے طبیعت کم مانوس ہے طلبہ کو تاکید کرتے تھے کہ درجہ میں جانے سے پہلے سبق پر ضرور نظر ڈال لیا کریں اور جہاں تک ہوسکے حواشی کی مدد سے مطالب کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں تاکہ استاد کی تقریر اچھی طرح سمجھ میں آسکے مزید استفادہ کی صلاحیت پیدا ہو اور فہم مطالب کی قوت بڑھے۔

درس میں طلبہ کے نشاط کا خیال | خشک علمی مباحث کو دیر تک سننا آسان نہیں ہوتا ایسے مواقع پر طلبہ عموماً غفلت و کسل کا شکار ہو جاتے ہیں اس کیفیت کو دور کرنے اور ذہنی بیداری اور حاضر دماغی پیدا کرنے کے لئے مولوی صاحب درس کے دوران میں دلچسپ قصص و حکایات اور لطائف و ظرائف بیان کرتے تھے جو ذہنی نشاط کے ساتھ نصیحت آموز بھی ہوتے تھے، مثلاً کسی نے عبارت پڑھنے میں کوئی اہم غلطی کی جس سے مفہوم بدل گیا تو کہتے تیرا حال تو اس عطار کا سا ہے جس کی غلط خوانی نے غریب بڑھیا کو بے حال کر دیا تھا لڑکے پوچھتے مولوی صاحب کیا ہوا تھا تو فرماتے بھائی ایک بڑھیا کا لڑکا بیمار ہوا وہ حکیم صاحب کے یہاں گئی اور حال بیان کر کے نسخہ لکھا لائی لیکن عطار تمہارے دوست ہی کی طرح لائق تھے انھوں نے شربت بنفشہ کو شر ثبت بنفسہ پڑھا اور بڑھیا سے کہا حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ تو اس کی جان کو پی گئی پھر دانہ الائچی کو دانہ لا یجی پڑھ کر کہا اور وہ زندہ نہیں رہے گا یہ سن کر بڑھیا رونے پیٹنے لگی اتفاق سے کوئی پڑھا لکھا آدمی ادھر سے گذر رہا تھا اس نے اس آہ و زاری کا سبب دریافت کیا تو عطار کے ہاتھ سے حکیم صاحب کا نسخہ لے کر نظر ڈالی اور کہا مردے آدمی اس میں جان کھا جانے اور زندہ نہ رہنے کا کہاں ذکر ہے تم نے شربت بنفشہ

اور دانہ الائچی کی مٹی پلید کر کے غریب بڑھیا کو ادھ مرا کر دیا۔

اس طرح ایک بار کسی صاحب کے تکیۂ کلام کے سلسلہ میں فرمایا کہ اس سے بعض اوقات ایسا مطلب خبط ہو جاتا ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے پھر فرمایا ایک قاضی کو ہر بات میں جو ہے سو ہے کہنے کی عادت تھی ایک مرتبہ کہیں نکاح پڑھانے گئے انھوں نے دولہا کو ایمان مفصل کی تلقین کی اور کہا پڑھو آمنت باللہ جو ہے سو ہے اس نے اسی طرح پڑھا تو قاضی صاحب نے کہا ہم جو کہیں جو ہے سو ہے تم نہ کہو جو ہے سو ہے کہو آمنت باللہ جو ہے سو ہے، اب کے اس نے قاضی صاحب کی طرح ایمان مفصل کے ساتھ پوری عبارت دہرا دی، اس پر قاضی صاحب بہت برہم ہوئے اور نکاح کو ناتمام چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح کے بہت سے لطیفے مولوی صاحب سبق کے اندر سناتے تھے اس سے طلبہ کی عارضی غفلت بھی دور ہو جاتی تھی اور مستقل طور پر ان کی اصلاح بھی ہو جاتی تھی لڑکے ان کے درس میں شوق سے شریک ہوتے اور خوش دلی اور حاضر دماغی کے ساتھ ان کی تقریر سنتے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے پڑھی ہوئی کتاب ایسی ذہن نشین ہو جاتی تھی کہ پھر کبھی فراموش نہ ہوتی اور برسوں دوسرے مشاغل میں انہماک کے باوجود جب پڑھانے کا اتفاق ہوتا تو کوئی دشواری محسوس نہ ہوتی۔

نظام کی پابندی وہ مدرسہ کے قواعد وضوابط کے بہت پابند تھے جو کام سپرد کیا جاتا خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے، بیماری میں بھی جہاں تک ہو سکتا اسباق کا ناغہ نہ کرتے، بستر علالت کے پاس طلبہ جمع ہو جاتے اور لیٹے لیٹے پڑھا دیتے آخر زمانہ میں کئی سال وجع مفاصل کی وجہ سے نقل و حرکت دشوار تھی مگر تکلیف کے باوجود برابر درس دیتے رہے اور نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، افسروں کے احکام کی بجا آوری میں کبھی کوتاہی نہیں کی، ان کی

طویل مدت ملازمت کے زمانہ میں کئی ناظم بدلے اور متعدد مہتمم آئے مگر انھوں نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا وہ مشورہ کے وقت صفائی کے ساتھ اپنی رائے دیتے تھے پھر اس کے بعد ناظم و مہتمم جو حکم دیتے تھے اس کی تعمیل کرتے تھے، وہ امیر کی اطاعت سے انحراف پسند نہیں کرتے تھے اس بارہ میں وہ خورد و کلاں کے درمیان امتیاز کے قائل نہ تھے، مہتمم کو ہر حال میں مہتمم سمجھتے تھے خواہ ان کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو مولانا محمد عمران خاں ان کے بچوں کی طرح تھے جب وہ دار العلوم میں داخل ہوئے تھے تو ان کی عمر بارہ سال کی رہی ہو گی مگر جب مصر سے واپسی کے بعد وہ مہتمم ہوئے تو ان کا پورا احترام کرتے تھے اور بے تامل ان کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، عمران خاں صاحب عرض کرتے کہ میں، تو آپ کا ادنیٰ غلام ہوں، مجھے مہتمم کے بجائے عمران کہہ کر مخاطب کیا کیجئے، مگر مولوی صاحب نے اپنا طرز کلام نہیں بدلا اور برابر مہتمم صاحب کہتے رہے فرماتے تھے کہ میں تو عہدہ کا احترام کرتا ہوں اطاعت و انقیاد کی مثال ایسی مشکل سے کہیں اور ملے گی، جس زمانہ میں چھوٹے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوں اور خورد بزرگوں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہوں، اس زمانہ میں مولوی صاحب کی روش حیرت انگیز ہے، اگر اس کا رواج ہو جائے تو جماعتیں اور ادارے شکست و ریخت سے بچ جائیں، ملت کی پراگندگی دور ہو جائے، اور انتشار کے بجائے قوم کے اندر نظم و ضبط اور اجتماعیت و استحکام پیدا ہو۔

حلیہ اور وضع قطع | مولوی صاحب لانبے قد اور کسی قدر دہرے بدن کے تھے، سینہ چوڑا، ہڈی چکلی، چہرہ بڑا اور کسی قدر گول تھا، داڑھی گھنی، آنکھیں بڑی، رنگ سانولا اور آواز بلند تھی، قدم زمین پر زور سے رکھتے اور پاؤں کچھ گھسیٹتے ہوئے چلتے، لباس بہت معمولی استعمال کرتے تھے، موٹے کپڑے کی دو پلی ٹوپی، لانبا کرتا اور تہبند یہی ان کی پوشاک تھی اکثر ایک

بڑا رومال ساتھ رکھتے، جاڑوں میں روئی دار شلوکہ اور روئی دار پاجامہ پہنتے تھے مگر اتباعِ
سنت کے خیال سے تہبند اس موسم میں بھی ترک نہ کرتے اور پاجامہ کے اوپر پہن لیا کرتے تھے،
بال نہ کترواتے نہ منڈاتے بلکہ پٹوں کی شکل میں گردن تک رکھتے، پانوں میں معمولی سی چپل ہوتی
لیکن اس سادگی کے باوجود اللہ نے بڑا وقار عطا کیا تھا، کھانا سادہ ہوتا تھا، گوشت بہت
مرغوب تھا اور ترکاریوں میں کریلے پسند تھے، بڑے اہتمام سے پکاتے، طلبہ کو بھی کھلاتے، پان
کے عادی تھے، ڈبیہ ساتھ رہتی، حقہ بھی پیتے تھے اور چائے کا بھی شوق تھا، ملی اور بکری سے
دلچسپی تھی لیکن جب بورڈنگ کے آس پاس آم کا باغ لگا تو بکریاں ختم کر دیں تاکہ درختوں
کو نقصان نہ پہونچے۔

اخلاق و عادات | مہمان نواز بہت تھے، اور صلہ رحمی کا بڑا خیال رکھتے، لڑکوں کا انتقال ہو چکا
تھا مگر پوتے، نواسے اور دور و نزدیک کے عزیز خاصی تعداد میں ان کے ساتھ رہتے
تھے، خاندان کے بہت سے لڑکوں نے ان کی بدولت اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی، عزیزوں کے
علاوہ احباب اور اہل تعلق کے بچے بھی ان کی فیض سے مستفید ہوتے تھے، چھوٹے اور
غریب لوگوں کا خاص خیال رکھتے لیکن کبھی کسی سے خدمت نہیں لی۔

مذہبی زندگی | فرائض، واجبات اور سنن کا بڑا اہتمام تھا، نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے
ایک زمانہ میں پانوں میں شدید اکوتہ تھا، بوڑھاپے میں وجع مفاصل کی تکلیف ہو گئی
تھی لیکن جماعت کی پابندی کبھی نہیں چھوڑی البتہ جب باقاعدہ بیٹھنے میں دقت ہونے لگی
تو چہار زانو بیٹھنے لگے، گرمی بہت ہوتی تو کرتے کے بجائے بنیائن پر اکتفا کرتے۔
باقاعدہ اذکار و اشغال کرتے تو نہیں دیکھا لیکن نماز کے بعد کچھ دیر وظیفہ ضرور
پڑھتے تھے، حضرت سید احمد شہید کے عزیز خاص خواجہ احمد نصیر آبادی سے بڑی عقیدت

تھی اشاید ان کے مرید بھی ہوں، بدعات سے شدید اجتناب تھا، مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے،
مگر حنفیت میں غلو نہیں تھا۔ دوسرے ائمہ کا بڑا احترام کرتے تھے، اہل حدیث سے
بھی سوظن نہیں تھا، ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اور مولانا عبداللہ اہل حدیث
تھے، برادری میں بزرگوں میں مولانا سلامت اللہ اور ساتھیوں میں مولانا عبدالغفور
اور ندوہ کے مدرسین میں شیخ تقی الدین ہلالی بھی سلفی تھے۔ شاگردوں میں قاری محمد منیر
وغیرہ متعدد اصحاب غیر مقلد تھے، مولوی صاحب ان سب سے محبت و حسن اخلاق کے
ساتھ پیش آتے، یہ غالباً مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی اور ان کے شاگردوں کا اثر تھا، جو بہرکیف
اندر بڑا توسع تھا، دلائل سے متاثر ہو کر کہیں کہیں دوسرے ائمہ کی رائے کو اختیار کر لیتے
تھے، مثلاً سری نمازوں میں وہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، عصر کی نماز ایک مثل
پر جائز سمجھتے تھے۔

روزے بڑے اہتمام سے رکھتے تھے رمضان شریف میں شب بیداری کا معمول تھا،
تراویح کے علاوہ تہجد بھی پڑھتے اور دعا و مناجات میں کچھ وقت صرف کرتے، اول وقت
فجر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کرتے، عیدالاضحیٰ میں قربانی بڑے اہتمام سے کرتے، ندوہ میں
ہوتے تو طلبہ کو بھی دعوت دیتے اور بڑی شفقت کے ساتھ کھلاتے۔

فرنگیت سے بیزاری | مولانا سیاسی آدمی نہیں تھے، انھوں نے وقت کی سیاست میں کوئی
حصہ نہیں لیا مگر اپنے بزرگوں اور استادوں سے انگریزوں کے جو مظالم سنتے تھے اور ان کے
ہاتھوں جس طرح مسلم حکومتیں برباد ہوئیں اور اسلامی تہذیب و روایات کو صدمہ پہونچا
اس کی بنا پر ان کے اندر فرنگ بیزاری بہت تھی اور اسے باعث نجات سمجھتے تھے، فرمایا
کرتے تھے کہ تین باتوں کی وجہ سے مغفرت کا امیدوار ہوں، ایک تو یہ کہ میں کسی سے بغض

نہیں رکھتا، دوسری یہ کہ میں نے کبھی کسی انگریز سے ہاتھ نہیں ملایا اور تیسری بات یہ کہ انگریزی الفاظ بھی سے صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے ہیں اس سلسلہ میں ان کا یہ حال تھا کہ انسلٹ اور سرٹیفکٹ جیسے روزمرہ کے الفاظ بھی وہ صحیح نہیں استعمال کرتے تھے فاؤنٹین پن کو ہمیشہ سیاہی دان کہتے تھے، انگریزی جوتے، انگریزی ٹوپی، انگریزی لباس کے بھی عجیب نام رکھے تھے ممکن ہے آج یہ باتیں تعصب پر محمول کی جائیں لیکن جن لوگوں کو برطانوی مظالم سے واقفیت ہے اور انگریزوں کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کا تجربہ ہے وہ مولوی صاحب کو اس بارہ میں حق بجانب سمجھیں گے۔

غیر درسی کتابوں کا مطالعہ مولوی صاحب کا زیادہ وقت تدریس میں گذرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ غیر درسی کتابوں پر بھی نظر رکھتے تھے اور اہم مطبوعات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، فقہ واصول اور تفسیر وحدیث کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی، ادب سے زیادہ ربط نہ تھا، مگر جب اساتذۂ ادب کی کمی ہوتی تو ادبی کتابیں بھی پڑھا دیتے تھے میرے زمانۂ درس میں ایک بار انھوں نے مقامات حریری پڑھائی تھی، بلاغت کی فنی کتابیں مختصر المعانی وغیرہ تو عموماً وہی پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ ایک عرب استاد کے سپرد یہ کتاب ہوئی، شروع کی تمہیدی عبارت تو انھوں نے پڑھا لی لیکن جب ضمیمہ شک اور رخیہ نظر وغیرہ سے دوچار ہوئے تو کتاب پھینک دی۔

اخبارات ورسائل سے دلچسپی نہ تھی مگر کبھی کبھی سرخیوں پر نظر ڈال لیتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں اودھ پنچ پڑھا تھا، کبھی کبھی اس کے ظریفانہ فقروں کا ذکر کرتے تھے، اردو کتابوں سے زیادہ تعلق نہ تھا لیکن اہم کتابوں سے یک گونہ واقفیت تھی، اس زمانہ میں سید علی بلگرامی نے لیبان کی کتاب کا ترجمہ تمدن عرب کے نام سے شائع کیا تھا، اس میں

عہد اسلامی کے تمدنی کارناموں کا ذکر ہے، اس لیے مسلم حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا،
مولوی صاحب نے اس کا غور سے مطالعہ کیا اور تعریف کے اندر چھپی ہوئی تنقیص محسوس
کر لی، فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسے ملّا ہی اس زہر کا پتہ چلا سکتے ہیں جو شکر کی گولیوں کے
اندر رکھا ہوا ہے۔

زبان و بیان | مولوی صاحب کی افتاد مزاج اور طرز زندگی کا ذکر ہو چکا ہے، وہ نہ
خطیب بلند بانگ تھے نہ واعظ خوش بیان، ان کے اندر نہ شاعروں کی شیریں نوائی تھی
نہ ادیبوں کی سحر طرازی، وہ نہ مرشدوں کی شان رکھتے تھے نہ عالموں کی آن بان، بڑی سادگی
سے رہتے اور بے تکلفی سے بات کرتے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا، طالب علمی کا
زمانہ اہل زبان کے درمیان بسر ہوا، رامپور میں سالہا سال منشی امیر مینائی کے یہاں
آمد و رفت رہی، لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کی نفاست اور حسن بیان سے بے تعلق رہے، سادہ
زبان میں بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے جس میں کہیں کہیں ان کے وطن کا رنگ آجاتا، ایک مرتبہ
کہنے لگے ہاتھی آئی ہے ہم لوگ ہنس پڑے، فرمایا بھائی ہم تمھارے ہاتھی کو ہاتھا اور تمھاری ہتھنی کو
ہاتھی کہتے ہیں، مسجد کو کبھی کبھی مسیت کہہ دیتے تھے، لہجہ میں بھی کبھی پورب کی جھلک آجاتی
تھی لیکن چند مستثنیٰ الفاظ کے علاوہ وہ عموماً لکھنؤ ہی کی زبان بولتے تھے۔

تفہیم و اصلاح خیال | لیکن اس سادگی کے باوجود ان کی مجلس میں جی لگتا تھا، اور بعض اوقات
ان کی باتوں سے طبیعت کی الجھن دور ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ علماء کے اختلافات پر لوگ اظہار
افسوس کر رہے تھے، اس پر فرمایا کہ مناظرانہ نقطۂ نظر کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ
اختلاف اللہ کی رحمت نظر آئے گا، اگر مجتہدین کے درمیان یہ اختلاف نہ ہوتا تو مسائل
کی یہ کثرت کہاں سے ہوتی، دین کی ابدیت کا تقاضا ہے کہ اس کے اندر وسعت ہو

تاکہ قیامت تک شریعت کے دائرہ میں تنگی محسوس نہ ہو اور ہر دور میں عمل کی راہیں کشادہ نظر آئیں۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ بڑا پرآشوب تھا، دنیا میں قتل وغارت کا بازار گرم تھا، رہ رہ کر خیال آتا کہ ہم اس مصیبت کے زمانہ میں کیوں پیدا ہوئے، ایک دن مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ "یہ انداز فکر صحیح نہیں ہے، پیدائش تمہارے اختیار میں نہ تھی جو ہونا تھا ہو چکا اب تو یہ سوچنا چاہئے کہ ان حالات میں تمہیں کیا کرنا چاہیے، اس طرح فعل خداوندی پر اعتراض بھی نہ ہوگا اور ان مشکلات کے حل کی تدابیر بھی سمجھ میں آئیں گی۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ کے وقت اکثر افسوس ہوتا ہے کہ ہم عہد رسالت اور دورِ صحابہ میں کیوں نہ ہوئے کہ مراتب عالیہ حاصل کرتے، ایک مرتبہ مولوی صاحب کے سامنے اس کا ذکر آیا تو فرمایا کیا ضرور ہے کہ تم ابوبکرؓ و عمرؓ ہی ہوتے آخر ابوجہل و ابولہب بھی تو اسی زمانہ میں تھے، میاں جس حال میں ہو خدا کا شکر کرو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے صحیح الخیال ماحول ملا، دین کا علم حاصل ہوا اور کیا چاہیے، اب عمل صالح اختیار کرو اللہ دین و دنیا میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

فتاوی مولانا زندگی بھر درس دیتے رہے، تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار نہیں کیا، اس لیے کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مگر ان کے فتاوی بڑی اہمیت رکھتے تھے، فقہ کی جزئیات اور اصول پر ان کی وسیع نظر تھی، وہ مجتہدین کے طریق استنباط کو خوب سمجھتے تھے، ان کے اندر حالات پر روایات کے انطباق کی اچھی صلاحیت تھی، وہ استفتوں کا جواب بڑی دقتِ نظر اور دیدہ وری کے ساتھ دیتے تھے، ان کے فتوے بڑی تعداد

میں تھے ان کے نواسے اور ندوہ میں ان کے جانشین مفتی محمد سعید مرحوم نے بتایا تھا کہ یہ
کئی جلدوں کے بقدر ہیں معلوم نہیں یہ ذخیرہ اب کہاں ہے ندوہ کے موجودہ مفتی مولانا
محمد ظہور صاحب سے جو مولوی صاحب اور مفتی صاحب مرحوم کے عزیز بھی ہیں میں نے دریافت
کیا مگر پتہ نہیں چلا

وفات جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مولانا آخر میں بیمار رہنے لگے تھے اکو تہ اچھا ہوا تو وجع
مفاصل میں مبتلا ہوئے جب تک تھوڑی بہت سکت رہی دارالعلوم ہی میں قیام رہا اور
مقررہ اسباق پڑھاتے رہے لیکن جب بیماری اور کمزوری نے بالکل مجبور کر دیا تو
گھر چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہاں ۲ شعبان ۱۳۶۴ھ (۱۵ اگست ۱۹۴۵ء)
میں وفات پائی۔ غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ مثواہ

تذکرۃ المحدثین

سلسلہ سیرۃ النبی، سلسلہ سیر الصحابہ، سلسلہ تابعین وتبع تابعین کے بعد محدثین کرام کے حالات
کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگا، اس کی ایک جلد ہندوستان کے
محدثین پر ہوگی، جو زیر ترتیب ہے، دو جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، پہلی جلد دوسری صدی ہجری
کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام
کے حالات اور ان کی حدیثی خدمات پر مشتمل ہے، دوسری جلد چوتھی صدی
ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کے حالات
وسوانح پر مشتمل ہے۔

مرتبہ ۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی قیمت فی جلد ۱۳ روپے

مطبوعات جدیدہ

الحاوی علیٰ مشکلات الطحاوی مرتبہ مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب تقطیع متوسط کاغذ بہتر کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۴۲۴ قیمت بارہ روپے پتے (۱) موتمر المصنفین اکوڑہ خٹک پشاور پاکستان (۲) کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارن پور

امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) مشہور فقہائے احناف میں تھے، حدیث اور شرح حدیث میں بھی وہ بہت ممتاز تھے، ان کی تصنیفات میں "معانی الآثار" فقہ و حدیث کی جامع ہونے کی بنا پر زیادہ اہم خیال کی جاتی ہے، اس کی متقدمین نے جو شرحیں لکھی تھیں وہ نا پید ہیں، اور شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف رح کی شرح بعد میں تحریر کی گئی، اس لیے جب معانی الآثار مظاہر العلوم سہارن پور کے نصاب میں داخل کی گئی اور اس کے درس کی خدمت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری کو تفویض کی گئی تو وہ اس کے متعلق اپنے شکوک و اشکالات قلمبند کرکے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے پاس بھیج دیتے، وہ جواب تحریر کرکے مولانا عبد اللطیف ناظم مدرسہ اور دوسرے علماء کے پاس بھیج دیتے، یہ حضرات بھی اپنی رائیں تحریر کر دیتے، اگر اس کے بعد بھی مولانا کامل پوری کو تشفی نہ ہوتی تو وہ دوبارہ ان حضرات کے پاس بھیج کر جواب طلب کرتے، اب اسی سوال و جواب کو جو متفرق اور منتشر حالت میں تھا، مولانا عبد الرحمٰن مرحوم کے فرزند قاری سعید الرحمٰن صاحب نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس طرح

زیر نظر کتاب میں ۱۹۸ شافعی اشکالات مع جواب درج ہیں پہلے امام طحاوی کی اصل عبارت مع حوالہ نقل کی گئی ہے پھر اسکے متعلق اشکال اور آخر میں جواب ناموں کی تصریح کے ساتھ درج ہے۔ مگر جواب میں یکسانیت نہیں ہے کچھ اردو اور کچھ عربی میں ہیں اگر عربی جواب کا اردو ترجمہ کر دیا جاتا تو فائدہ دو چند ہو جاتا اردو جواب کی زبان اور پیرایۂ بیان قدیم طرز کا ہے تاہم اس کتاب سے حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کو بڑا فائدہ

روح البیان (حصہ دوم) از مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۵۰۰ قیمت بارہ ۱۲ روپے ناشر ڈاکٹر ابرار احمد نمبر ۵ سلطان پور، عجادہ الہ آباد

مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ حضرت شاہ بدر علی کے خلیفہ اور خود ایک بڑے شیخ طریقت ہیں، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی وفات کے بعد ان کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی ہے، مشرقی یو۔ پی کے لوگوں کو خاص طور سے ان سے بڑا فیض پہنچ رہا ہے، مولانا کے عقیدت مندوں نے افادۂ عام کے خیال سے ان کے مواعظ کا ایک مجموعہ پہلے شائع کیا تھا اور اب یہ دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں رضائے الٰہی کے حصول، آخرت کے استحضار، کتاب وسنت کے اتباع، ذکر تلاوت و عبادت میں مشغولیت، اخلاق و معاملات کے تصفیہ قلب کے تزکیہ، نیت کے اخلاص، عمل کی اصلاح، صلحاء کی صحبت اور اہل اللہ کی ہم نشینی وغیرہ کی تلقین پُر اثر انداز میں کی گئی ہے، مواعظ کو پڑھ کر قلب میں گداز روح میں بالیدگی، دل میں عمل کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور آخرت کی فکر میں اضافہ ہوتا ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر مقدمہ اور ایک وعظ کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی موثر تعارفی تقریر بھی ہے، زبان آسان اور عام فہم ہے تاکہ ہر ذوق واستعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ "ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۰

اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ـ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

مجلس ادارت

(مرتبہ)
سید صباح الدین عبد الرحمن

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

۱۹۶۰ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی پاکستان تشریف لے گئے تھے، تو وہاں کے قیام کے زمانہ میں ایک علمی مجلس میں سوال کیا گیا کہ پاکستان میں معارف کی طرح کوئی رسالہ نکلتا ہے کہ نہیں، تو ایک صاحب بول اٹھے کہ جی نہیں، یہ خاکسار بھی اس مجلس میں تھا جب اس کی اشاعت کی تعداد مجھ سے پوچھی گئی تو اس کے بتانے میں کچھ محجوب سا تھا،

معارف ۱۹۱۶ء سے برابر نکل رہا ہے، اس ۶۲ برس میں کسی مہینہ ناغہ نہیں ہوا، اتنی طویل مدت میں ایسی پابندی شاید ہی کسی اور رسالہ کی اشاعت میں کی گئی ہو، الحمد للہ جس مقصد سے یہ نکالا گیا، اس کی بھی تکمیل برابر ہوتی رہی، اور مدح و تحسین کے پھول بھی اس پر نچھاور کئے جاتے رہے، ڈاکٹر اقبال نے اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم جوہر کو بھی اس رسالہ سے بڑا انس رہا، اپنے ایک مکتوب میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ میں رسالوں کی جلدیں نہیں بندھواتا ہوں مگر یہ شرف خاص رسالہ معارف کو حاصل ہے کہ میرے پاس یہ مجلد ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے ایک خط میں استاذی المحترم ہی کو تحریر فرمایا تھا کہ معارف ہی ایک پرچہ ہے ورنہ ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ مولانا شبلی کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں، پاکستان کے مشہور صاحب قلم عبد المجید صاحب سالک مرحوم نے جنوری ۱۹۵۴ء کے رسالہ "ماہ نو" کراچی میں لکھا کہ ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین کا مشہور و معروف علمی رسالہ معارف جاری ہوا، جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے، اور جس نے ہمارے تحقیق و تاریخ کے ذخیرے کو مالا مال کر دیا۔

معارف کے پہلے پرچے کی اشاعت کو کل ۶۳ برس ہوئی ہے، کراچی کے نقاد اور مشہور ادیب جناب مشفق خواجہ نے شروع سے اب تک کے معارف ابھی منگوائے، تو لکھا کہ اگر یہ رسالے اُن کے کتب خانے میں نہ ہوتے تو وہ بہت بڑی دولت سے محروم رہتے، کراچی ہی کے علم کے شہزادے جناب سید حسام الدین راشدی کو یہ رسالہ کسی مہینہ نہیں ملتا ہے تو تقاضا آتا ہے کہ ان کو یہ ہر مہینہ رجسٹری سے بھیجا جائے تاکہ اُن کو ضرور ملے، معارف کی اس قدردانی کے باوجود اگر سوال کیا جائے کہ اس ۶۳ برس میں اس کے لئے کتنا سرمایہ جمع ہوچکا ہے تو اس کے جواب دینے میں شرمندگی محسوس ہوگی،

شروع سے اس کے اڈیٹر کی کوئی تنخواہ نہیں رہی، اس کے مضمون نگاروں کو کوئی اجرت بھی نہیں دی جاتی، صرف اس کی لکھائی چھپائی، جزبندی اور کاغذ کی خریداری میں خرچ ہوتا ہے، اگر کسی آڈیٹر سے گذشتہ ۶۳ برس کا حساب آڈٹ کرایا جائے، تو اس کی رپورٹ یہی ہوگی کہ جب اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں تو اس کو کیوں جاری رکھا گیا ہے، اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں، کل پندرہ روپے سالانہ ہے، ابھی حکومت دہلی کے ایک بہت بڑے ہندو افسر دارالمصنفین تشریف لائے، اپنی علم دوستی سے یہاں کی ہر چیز دیکھی، معارف کی سالانہ قیمت سن کر بولے کہ اس سے تو اس کے ٹائٹل کے خریدنے میں بھی یہ رقم کم پڑتی ہوگی، اس کی سالانہ قیمت یقیناً بہت کم ہے، پھر بھی زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو معارف کے خریدار بننے کے بجائے ایک روز میں کافی کی پیالیاں پینے میں کئی پندرہ روپے خرچ کرنا زیادہ پسند کریں گے،

ممکن ہے کہ یہ الزام رکھا جائے کہ معارف کا اشتہار نہیں ہوتا، اور دوسرے رسالوں کی طرح اس کے لئے گھر گھر جاکر خریدار نہیں بنائے جاتے، دارالمصنفین نشر و اشاعت کا کوئی تجارتی ادارہ نہیں، یہ ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوا تھا، اور اس نے ملک میں جو وزن و وقار پیدا کیا ہے، اس کو برقرار رکھنے میں یہ دریوزہ گری کسی طرح مناسب نہیں، دارالمصنفین نے

گذشتہ ۳۲ برس میں کسی سے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، یہاں کے خدمت گذاروں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ اپنی علمی زندگی میں مالی صعوبتوں کی پریشانیاں برداشت کرلیں، مگر اس کے قدر دان اور وقار میں حتی الامکان کمی نہ آنے دیں،

.....✕.....

اگر دارالمصنفین کے ساتھ معارف بھی اپنا فرض لوگوں کی توقعات کے مطابق ادا کررہا ہو تو کیا وہ خود ان لوگوں سے یہ توقعات نہیں کرسکتا ہو کہ وہ اپنا فرض ادا کریں، اگر معارف سے واقعی حرارت ایمانی پیدا ہوتی ہے، اس سے علمی تشنگی دور ہوتا ہے، اور یہ گھروں میں علمی دولت پہنچاتا ہے تو یہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ خریدار ہوں،

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ۱۹۶۵ء ہی میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کی رسم افتتاح کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ "دارالمصنفین کے قدر دانوں معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہو کہ قدر دانی تعریف اور شکر گذاری اپنی جگہ بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن ان سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہو، نہ بھاپ بنتی ہو، نہ گاڑی چلتی ہو، اس عالم مادی میں ذہنی اور روحانی کاموں کے لئے بھی مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ہم آپ بھی دارالمصنفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کیلئے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہو، اور یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے، کہ قدمے سخنے سے آگے بڑھ کر دامے درمے سے اس کی دل کھول کر مدد کریں"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اوپر جو کچھ کہا ہو اس میں دارالمصنفین کے خدمت گذار یہ ترمیم کرتے ہیں کہ ہم کو دامے درمے کی امداد نہیں چاہئے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد جو کہا تھا وہ ہم چاہتے ہیں، انھوں نے بڑی دلسوزی سے فرمایا تھا کہ "مجھے امید ہو کہ ارباب علم و دانش زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی مطبوعات کے (جس میں معارف بھی شامل ہو) خریدار بنیں گے، اور ارباب حکومت و اقتدار کو اس پر آمادہ کریں گے کہ انھیں مدرسوں اور عام کتب خانوں کیلئے خریدیں، یہ کوئی احسان نہ ہوگا، بلکہ ایک اچھا سودا ہوگا جس میں چاندی کے چند ٹکوں، بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آئے گی، جو بے بہا اور لازوال ہے"

مقالات

امیر خسرو اور افضل الفوائد

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جعلی ملفوظات میں ایسا مواد بالکل نہیں ہے، جو اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالتا ہو، یہی کیفیت افضل الفوائد کی بھی ہے، (ص ۸۳)

اگر اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ کے حالات مراد ہیں، تو فوائد الفواد میں سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد بن تعلق کے دور کے سیاسی و معاشی حالات ملنے چاہئیں، مگر ان سلاطین کا اس میں مطلق ذکر نہیں، البتہ محمود غزنوی، شمس الدین التتمش، رضیہ اور ناصر الدین محمود کا ذکر ضرور ہے، مگر افضل الفوائد میں بھی محمود غزنوی، معز الدین سام اور شمس الدین التتمش کا ذکر ہے، اس سے نسبتاً زیادہ تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

فوائد الفواد میں محمود غزنوی کا ذکر احترام سے کیا گیا ہے، یہی احترام افضل الفوائد میں ہے، یہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی مجلس کی حسب ذیل روایت سے ظاہر ہے۔

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ سلطان محمود غزنوی کے دو زنار دار یعنی ہندو اس کے یہاں سے روتے ہوئے واپس گئے، اور اپنے بت خانہ میں پہونچے، انھوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ الٰہی! اگر ہم لوگ اسلام (مسلمانی) سے دور ہیں، تو ہم لوگوں کو تو ہی نے پیدا کیا ہے، تمام بندے تیرے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں اگر تو ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے گا تو ہم اس جگہ سے باہر نہ جائیں گے، اور نہ ایک دوسرے سے بات کریں گے، پھر وہ دونوں مندر (بت خانہ) میں بیٹھ گئے، اسی روز سلطان محمود انار اللہ برہانہ کے پیٹ میں درد اٹھا، کبھی تخت پر سے زمین پر گر جاتا، اور کبھی زمین پر سے تخت پر آجاتا، اولیاء اور حکماء اس کے گرد جمع ہو گئے، علاج ہوا، دعائیں ہوئیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ اور حالت خراب ہوتی گئی، اور جب سب عاجز ہو گئے تو سلطان محمود نے حسن میمندی کو بلایا اس سے کہا کہ لوگوں کی کوئی تدبیر کام نہیں کر رہی ہے، اب خدا ہی کچھ کر سکتا ہے، خواجہ بہلول دیوانہ کے پاس جاؤ، اور ان سے درخواست کرو، شاید صحت پا جاؤں، جب حسن میمندی خواجہ بہلول کے پاس پہونچا تو خواجہ نے تبسم کیا، اور فرمایا محمود کو کوئی ضرورت آپڑی ہے اسی لئے تجھ کو بھیجا ہے، بتاؤ کیا بات ہے، سلطان محمود کے پیٹ کے درد کا حال ان سے کہا گیا، تو وہ ہنسے اور بولے کہ جاؤ کہدو کہ وہ اپنے قصر کے در پر طبل بجانے کا حکم دیں، اسوقت بھلا ہو جائے گا، حسن میمندی نے یہ بات سنی تو واپس ہوا، سلطان سے یہ سب کچھ کہا، پھر ایسا ہی کیا گیا، جب قصر کے اوپر طبل بجا تو وہ دونوں ہندو ایک دوسرے سے بولے کہ

شاید سلطان محمود کی وفات ہوگئی ہے، یا کسی نے ہم لوگوں کا حال اس سے چھپایا ہے؛
اسی لیے یہ طبل بجا ہے، جس وقت ان دونوں نے یہ بات کہی تو سلطان کے پیٹ کا
درد جاتا رہا، سلطان گھوڑے پر سوار ہو کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور
بہت معذرت کی، خواجہ نے کہنا شروع کیا کہ دوسرے لوگ رہزنی کرتے ہیں،
اور تمھارے پیٹ میں درد ہوتا ہے، ملازمین ظلم کرتے ہیں، اور بلا ان کے مالک
پر نازل ہوتی ہے، خواجہ نے ان ہندوؤں کی کیفیت سے سلطان کو مطلع کیا،
وہ وہاں سے واپس ہوا تو ان ہندوؤں کے پاس پہونچا، ان کو خوش کیا اور
بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کو واپس کیا، یہ حکایت سنا کر حضرت خواجہ
یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی آنکھیں پرآب ہوگئیں، روئے اور
فرمایا، یگانوں کو ستانے میں تو یہ حال ہوتا ہے، بے گانوں کو ستانے میں قیامت
کے روز کیا حال ہو (قلمی نسخہ ص ۱۱۹ - ۱۱۸)

یہ حکایت امیر خسرو ہی خاص طور سے پسند کر سکتے تھے، کیونکہ ان کے دل میں ہندوؤں
کی جو محبت بھری تھی، اس کا اظہار انھوں نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں کیا (تفصیلات
کے لیے دیکھو میرا رسالہ "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں")

سلطان شہاب الدین غوری یعنی سلطان معز الدین سام کے کردار کے متعلق
ایک سبق آموز روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی مجلس میں اس طرح
بیان کی گئی ہے،

فرمایا کہ سلطان معز الدین محمد سام انار اللہ برہانہ کی عادت تھی کہ جب
کوئی بوڑھا آدمی اس کے پاس آتا تو وہ تخت سے اٹھ جاتا، کھڑا رہتا اور

ان کی باتیں پوری کرے، دوسرے روز ... نے عرض کیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں کہ [illegible]

ہو جائیں۔ سلطان نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ اس کا مقصد کیا ہے، انھوں نے جواب

دیا ہم کیا جانیں، حضرت خلیفہ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا کہ میں سفید بال کی

عزت میں اٹھ جاتا ہوں تاکہ کل قیامت کے روز میرا حشر نیکان بزرگوں

کے ساتھ شاید ہو جائے، اور دوزخ کی آگ سے نجات ہو، حق تعالٰی نے

سفید بالوں میں اپنے نور کا اضافہ کیا ہے، اس نور کی عزت سے شاید میری نجات

بھی ہو جائے۔ (قلمی نسخہ ص ۲۰۸)

جامع الحکایات ولوامع الروایات مرتبہ سدید الدین محمد عوفی میں شہاب الدین غوری

کے کردار کی خوبیوں کے متعلق کچھ ایسی ہی روایتیں ہیں۔

سلطان شمس الدین التتمش کی سیرت سے متعلق بھی افضل الفوائد میں ایک روایت

ہے، جو فوائد الفواد میں بھی ہے، دونوں کی عبارتیں یہ ہیں۔

افضل الفوائد

فرمود کہ سلطان شمس الدین انار
اللہ برہانہ را رسم بود کہ نیم شب در
عبادت مشغول شدے و آن زمان
کہ برخاستے خود آب بستدی و وضو کردے
و ہیچ کس را از بندگان بیدار نکردے
تا وقتے ازیں حال سوال کردند فرمود
چرا [illegible]

فوائد الفواد

از عقیدۂ خوب او التتمش، فرمود کہ شبہا
بیدار بودے و چون از خواب بیدار شدی
وضو ساختے، دوگانہ بگزاردی و باز در
خواب شدے و ہیچ کس را بیدار نکردے

۱۱۔ خواب پریشاں کیتم (ص ۲۰۹)

اوپر کے دونوں اقتباسات لفظاً بلفظ نہیں ہیں، معناً یکساں ضرور ہیں، ممکن ہے کہ یہ روایت امیر خسرو کے سامنے بھی دہرائی گئی ہو، پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی باتیں نہ ہوتیں تو کہا جاتا کہ افضل الفوائد میں وہ موضوعات نہیں ہیں، جو فوائد الفواد میں ہیں، اور اگر ایسی باتیں پائی جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے، کہ فوائد الفواد ہی کے مضامین دہرا دیئے گئے ہیں،

اگر افضل الفوائد پر یہ اعتراض ہے کہ اس سے اس عہد کے سیاسی حالات پر روشنی نہیں پڑتی ہے، (ص ۲۰۸) تو یہ اعتراض فوائد الفواد پر بھی کیا جا سکتا ہے، مگر ملفوظات کے مجموعے تاریخ کی کتابیں نہیں ہوتی ہیں، جن میں سیاسی، سماجی، اور معاشی مواد کا ہونا ضروری ہو، ضمناً ایسی باتیں آجاتی ہیں، تو ان سے معلومات حاصل کرلی جاتی ہیں، ورنہ ان میں زیادہ تر مذہبی اور روحانی باتیں بیان کی جاتی ہیں، اگر کبھی ان میں معاشرہ سے متعلق باتیں آجائیں تو یہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس زمانہ کے معاشرہ کو سنوارنے کے لیے یہ باتیں کہی گئی ہیں، افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مجلس میں یہ بیان کیا گیا کہ آسمان سے بڑی چیز بہتان تراشی اور دروغ گوئی ہے، زمین سے بھی فراخ تر چیز سچائی کا اعلان ہے، اور دریا سے زیادہ توانگر چیز خود منعم کا قول ہے، اور آگ سے بھی زیادہ گرم چیز مردم حریص کا قول ہے، اور زمہریر سے زیادہ سرد چیز یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں، قرابت مندوں، اور دوستوں کی حاجت روائی نہ کرکے ان کو ناامید کیا جائے، اور پتھر سے زیادہ سخت کافروں کا دل ہے، اور تیموں سے زیادہ خوار تر چیز چغل خوری ہے، اور

گناہوں میں بہتان باندھنے سے زیادہ سخت اور زیادہ ہولناک کوئی اور گناہ نہیں ہے۔ (ص ۲۴۴) کیا ان ملفوظات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے، کہ اس زمانے کے معاشرہ کے بعض حلقہ میں بہتان تراشی، دروغ گوئی، اور رشتہ داروں کی حاجت روائی سے بے اعتنائی، اور چغل خوری وغیرہ رائج تھی، یہ ساری باتیں ان کی اصلاح کے لیے کہی گئی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں میں شرم، حیا، اور عفت کا معیار گر گیا تھا، گانا بجانا زیادہ ہونے لگا تھا، علماء بے عمل ہو گئے تھے، مغنی، مطرب، مسخرے اور اہل فساد بڑھ گئے تھے، اور ان کی سرپرستی ہونے لگی تھی، مرد رنگین کپڑے پہننے لگے تھے، حاکم حکم کو فروخت کرنے لگے تھے، دنیا کے مال کی خاطر حق کو ناحق قرار دیا جانے لگا تھا، معاشرہ کی ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر حضرت خواجہ نے حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا کہ جب ایسی باتیں ہونگی تو زمین سے اگنے والی نباتات میں برکت نہ ہوگی، آسمان سے بارش کم ہوگی، اور اگر ہوگی تو بے وقت ہوگی، (ص ۲۴۱) ایسی حدیثیں ترمذی ابواب الفتن اور بخاری و مسلم میں ملیں گی۔ (دیکھو مشکوٰۃ جلد ۳ ص ۱۰۲۲)

حدیث اور ملفوظات کی باتیں جب باضابطہ ملائی جائیں گی تو یہ ضروری نہیں کہ ملفوظات میں حدیث کی باتیں لفظاً بہ لفظ دہرائی گئی ہوں، وہی فرق ہوگا، جو کتاب کو دیکھ کر پڑھنے اور اسی بات کو زبانی دہرانے میں ہوگا، مجلس میں زبانی باتیں کہنے کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے، کہنے میں بعض اوقات کچھ باتیں اس طرح بڑھ جاتی ہیں یا کم ہو جاتی ہیں کہ اصل سے مختلف ہو جاتی ہیں، مگر مفہوم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، ان میں جو مفید باتیں ہوں، ان سے درس حاصل کیا جائے نہ کہ تحقیقات کے پردے میں

ہر قسم کی خامیاں دکھائی جائیں، آج کل بھی بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں،
جن میں ایک عیب جو ہر قسم کی خامیاں دکھا سکتا ہے، مثلاً مولانا اشرف علی
تھانویؒ نے اپنے ایک وعظ میں نصاب الاحتساب کے مصنف قاضی ضیاءالدین
سنامی اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی ایک حکایت سنائی، جو انھوں
نے اپنے ایک بزرگ سے الٰہ آباد میں سنی، ان بزرگ نے یہ حکایت اپنے کسی
بزرگ کی کسی کتاب سے نقل کی ہے اور وہ ایسے بزرگ تھے جن کو حضرت خضر علیہ السلام
ملا کرتے تھے، ان کے یہاں ایک کتاب حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے
لکھی ہوئی ہے، شاید انھوں نے حاشیہ کے طور پر کوئی فائدہ لکھنا چاہا تھا،
مگر ن لکھ کر آگے نہیں لکھ سکے، وہ کتاب تبرک کے طور پر ان کے کتب خانہ میں
رکھی ہوئی ہے، ان ہی بزرگ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور قاضی
ضیاءالدین سنامی کی یہ حکایت سنائی۔

"قاضی صاحب یعنی قاضی ضیاءالدین سنامی کا وقت وصال سلطان جی (یعنی
حضرت سلطان الاولیا خواجہ نظام الدین اولیا) سے پہلے آیا، سلطان جی ان کی
عیادت کو گئے دروازہ پر پہنچ کر اجازت مانگی، قاضی صاحب نے فرمایا سلطان جی سے کہدو
کہ یہ وقت وصال حق کا وقت ہے، اس میں بدعتی کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا
سلطان جی نے جواب دیا کہ قاضی صاحب سے عرض کردو کہ وہ بدعتی ایسا
بے ادب نہیں کہ بارگاہ سنت میں بدعت سے ملوث ہو کر آتا، وہ حضرت والا کے
مذاق سے واقف ہے، اور آپ کے مذاق کی پوری رعایت کر کے حاضر ہوا ہے،
میں اس بدعت سے توبہ کر کے حاضر ہوا ہوں، یہ جواب سن کر قاضی صاحب پر حالت

طاری ہوگئی، دست بستہ ہو کر اپنا عمامہ سر سے اتار کر خادم [illegible]

سے کہو کہ اس عمامہ پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں، ابھی ابھی ایک [illegible]

نہیں ہوئی۔ یہاں ان کے مقامات عالیہ اور کمالات سے میں واقف نہیں ہوں

گر بہ سر و چشم من نشینی — نازت بکشم کہ نازنینی

خادم قاضی صاحب کا عمامہ لے کر سلطان جی کے پاس حاضر ہوا، تو آپ نے عمامہ کو

سر پر رکھ لیا کہ یہ عمامۂ شریعت ہے، اس کو اپنے سر پر رکھ کر حاضر ہوں گا، چنانچہ

تشریف لائے، قاضی صاحب نے فرمایا۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حضرت اب میرا آخری وقت ہے، اور میرے اوپر توجہ فرمائیے، چنانچہ حضرت سلطان

جی نے توجہ شروع کی، اور ایسی توجہ کی کہ قاضی صاحب کی روح نہایت فرح و شادمانی

کے ساتھ عالم بالا کو پرواز کر گئی، حضرت قاضی صاحب کا وصال ہو گیا تو سلطان جی

روتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ افسوس شریعت کا ستون گر گیا،

اس حکایت کو ذکر کر کے وہ بزرگ فرماتے ہیں، کہ نہ میں نظام الدین

ہوں جو اجازت دوں نہ ضیاء الدین ہوں کہ جو منع کروں، یہ حکایت میں

نے اخبار الاخیار میں دیکھی ہے مگر مختصر۔ تو حضرت یہ تھا ہمارے سلف کا

کا طریقہ امر بالمعروف میں کہ ایک دوسرے کا ادب کرتے تھے اور نصیحت

بھی کرتے تھے۔ (حاشیہ [illegible] ص ۲۰۹)

یہ حکایت اخبار الاخیار سے لی گئی ہے [illegible] ضیاء الدین سنامی

کے تذکرہ میں اجمالاً درج ہے

"مولانا ضیاء الدین سنامی دیانت اور تقویٰ میں مقتدائے وقت تھے، شریعت کی پابندی میں بڑے راسخ تھے، شیخ نظام الدین اولیاؒ کے معاصر تھے۔ ان سے سماع سے متعلق احتساب کرتے، شیخ ان سے معذرت کرتے ہوئے، ان کی تعظیم میں کوئی فروگذاشت نہ کرتے، ان کی ایک کتاب نصاب الاحتساب ہے، جو بدعت کے دقائق اور احتساب کے ساتھ احکام شریعت پر مشتمل ہے، شیخ نظام الدین اولیا، مولانا ضیاء الدین کے مرض الموت میں ان کی عیادت کو گئے تو مولانا نے اپنی دستار شیخ کے قدموں میں ڈال دی شیخ نے دستار کو اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا، اور جب وہ مولانا کے پاس بیٹھے تو مولانا آنکھیں چار نہ کر سکے، جب شیخ اٹھ کر باہر آئے تو مولانا کی وفات کی خبر گونجی، شیخ رونے لگے اور افسوس کرتے ہوئے کہا کہ شریعت کی حامی ایک ذات تھی، وہ نہ رہی، رحمۃ اللہ علیہما،

(اخبار الاخیار ص ۱۰۲-۱۰۱)

اخبار الاخیار کی روایت کیا تھی، اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ میں محض اثر پیدا کرنے کے لیے کیا سے کیا کر دی گئی، اب کوئی عیب جو اور خردہ گیر مولانا تھانوی کی روایت کو جعلی اور فرضی قرار دے تو اس کا کیا علاج ہے،

افضل الفوائد میں حقوق ہمسایہ، عیادت، بیمار پرسی، دل جوئی، رواداری، اور نفس کشی وغیرہ پر بہت سے ملفوظات ملیں گے، جو احادیث یا بزرگان دین کے عمل کی روشنی میں بیان کیے گیے ہیں، ان میں جو تعلیم و تلقین کا رنگ ہے، اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے معاشرہ میں یا تو ان کی کمی تھی، جن کو پورا کرنے کا جذبہ تھا، یا یہ اوصاف موجود تھے، تو ان کو اور بہتر طریقہ سے سنوارنے کی کوشش تھی۔

افضل الفوائد پر بھی اعتراض ہے کہ اس میں تصوف اور مذہب کی ان باتوں کا ذکر
کثرت سے شک انگیز حد تک آتے ہیں، اس میں کچھ کتابیں اور اوراد و وظائف کے مجموعے، کچھ
تصوف، کچھ فقہ اور کچھ تفسیر کی کتابیں، تفسیر کشاف، تفسیر امام زاہدی، تفسیر امام ناصری،
تفسیر امام مجاہد، تفسیر خواجہ شقیق بلخی کے حوالے ہیں، پھر خواجہ حمید الدین ناگوری کی دو کتابیں
راحت الارواح اور لوائح کے بھی نام آئے ہیں، ایک تصنیف تحفۃ العارفین کا بھی ذکر ہے۔

ص ۲۰۲) ان کتابوں کے نام آنے کی وجہ سے افضل الفوائد کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا، جو خواجہ
نظام الدین اولیا کی مجلسوں میں ان کتابوں کے حوالے نہ آتے تو اور کن کتابوں کا ذکر آتا، خود
فوائد الفواد میں احیاء العلوم، الکتاب، ایجاز التفسیر امام ناصری، جوامع الحکایات، روح
الارواح، شافی، صحیحین، طبقات ناصری، قوت القلوب، کشاف، کشف المحجوب، لمعات، مع المعانی،
مرصاد العباد، مشارق الانوار، مکتوبات عین القضاۃ ہمدانی، نافع، نوادر الاصول اور ہدایہ کا ذکر
ہے، فوائد الفواد میں خواجہ فرید الدین عطارؒ کا نام تو آیا ہے، مگر تذکرۃ الاولیاء کا ذکر نہیں، اگرچہ
اس سے بہت سی باتیں لی گئی ہیں، افضل الفوائد میں خود دلیل السالکین، کتاب العارفین، اور انیس
الانس کے بھی حوالے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتابیں، اس زمانہ میں رائج تھیں، اور
جب افضل الفوائد میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ

"در دولت خواجہ یعنی شیخ الاسلام خواجہ عثمان ہرونی رسیدہ ام"

"در دولت شیخ قطب الدین بختیار اوشی نشستہ بودہ ام" فرمود کہ شیخ معین الدین
سجزی در دولت او خود این نشستہ"

"فرمود کہ در دولت شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز
نشستہ بودہ ام"

کیا سب فرضی ہیں؟ کیا ثمر رسالے خواجگان چشت کی تعلیمات کہیں قلمبند
ہی نہیں ہوئیں؟ کیا ان بزرگان دین کے حالات اور خیالات صرف فوائد الفواد اور
سیر الاولیاء ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں، محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ ملفوظات دوسری
کتابوں کو سامنے رکھ کر وضع کر لیے گئے ہیں (ص ۷۰)، جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ یہ ملفوظات
کن کن کتابوں سے ماخوذ ہیں، محض قلم کے زور سے ان کو فرضی قرار دینا صحیح نہیں، یہ کہہ دینا
بھی کافی نہیں کہ ان ملفوظات میں معمولی مضامین ہیں، اور ان میں زیادہ تر قصص الانبیاءؑ
ہیں، فوائد الفواد میں بھی حضرت حوا، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ
السلام، اور ہود علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا ذکر ملے گا، اور اپنے رسول حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک سے تو کتاب بھری ہوئی ہے، اور جس طرح
افضل الفوائد میں خواجہ ذوالنون مصری، خواجہ فضیل عیاض، حضرت
ابراہیم ادھم، خواجہ ابو تراب بخشی، خواجہ جنید بغدادی، خواجہ ابوبکر شبلیؒ
شاہ شجاع کرمانی، خواجہ عبداللہ سہیل تستری، شیخ شہاب الدین تستریؒ داؤد
طائی، ابو سلیمان، رابعہ بصری اور حسین منصور حلاج کا ذکر ہے، اسی طرح فوائد الفواد
میں ابراہیم ادھم، شیخ ابو الاسحاق گازرونی، خواجہ اجل شیرازی، شیخ احمد معشوقؒ
حضرت بایزید بسطامی، خواجہ شاہی موتاب، شیخ شبلی، شیخ علی ہجویری، اور
شیخ یوسف ہمدانی کا ذکر ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ افضل الفوائد اور راحت المحبین میں حضرت
نظام الدین اولیاءؒ یا آپ کے شیوخ یا معاصرین کے بارے میں کوئی نکتہ ایسا
نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں نہ ملتا ہو یا اس کتاب میں زیادہ صحت و صراحت

یا جزئی تفصیلات کے ساتھ درج ہو، (ص ۴۴) اگر فضل الفوائد کے مستند ہونے کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں حضرت نظام الدین اولیآ اور ان کے مرشد کے متعلق ایسی روایتیں ہوں جو دوسرے مجموعہ ملفوظات میں نہ ملیں تو ایسی بہت سی روایتیں فضل الفوائد میں مل جائیں گی، کچھ مثالیں یہ ہیں،

ایک مجلس جاری تھی کہ حسن سجزی اور خواجہ عزیز ایک آگئے، یہ ندیم خاص میں تھے، دونوں نے حضرت خواجہ کے سامنے اپنے سروں کو زمین پر رکھا، خواجہ پر غلبہ طاری تھا، اُن پر بڑی شفقت فرمائی، کہا کہ بیٹھو، پھر خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے عزیز سے کہا کہ ایک غزل سناؤ کہ حق تعالےٰ نے اس وقت تم کو یہاں بھیج دیا ہے، خواجہ عزیز نے جب غزل شروع کی تو خواجہ عزیز اور تمام مجلس والوں پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ وہم اور فہم میں نہیں آسکتی، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اپنا خاص جامہ خواجہ عزیز اور برادرم حسن کو عطا کیا، اس طرح اس روز سعادت پر سعادت حاصل ہوئی، خواجہ عزیز نے جو غزل سنائی وہ یہ تھی، میرے پیش نظر قلمی نسخہ میں اشعار جس طرح درج ہیں اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں،

گر پردہ برکشائی ازاں روی دلبرشت　　　روشن شود براہل نظر حالِ خوب و زشت

گل را صفت کنم مہ و خورشید را اگر　　　اے ہر کہ خوب خوب بہ پیشِ تو زشت زشت

رضواں اگر ببیند خشتِ درت کنند　　　جملہ نگار خانۂ فردوس خشت خشت

کاغذ گریہ تر شد و خامہ زآہ سوخت　　　حالِ دل خراب بگو چوں تواں نوشت

کشتِ امید گشتم و تو ابر رحمتی　　　بگذر بہ کشت زار کہ رست کشت کشت

چندیں حسن برشیشہ جہاں دل چہ بستہ　　　سلت اگر گست زیں سرنوشت رفت

یہ امیر حسن سجزی ہی کی غزل ہے، مگر ان کے مطبوعہ دیوان میں مذکورہ بالا اشعار دو علٰحدہ علٰحدہ غزلوں میں درج ہیں، معلوم ہوتا ہے، کہ عزیز ایبک نے دونوں غزلوں کے کچھ اشعار کو لے کر ایک ساتھ لگا دیا، اور بقیہ اشعار کو چھوڑ دیا، میرے پیش نظر قلمی نسخہ میں، اشعار کی کتابت میں بڑی غلطیاں رہ ہیں مطبوعہ نسخہ میں مطلع کا پہلا مصرع اس طرح ہے، ع:-

گر پردہ برکشائی ازاں روے چوں بہشت

قلمی نسخہ میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے، ع

گر پردہ برکشائی ازاں روے در بہشت

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں مہ و خورشید را اگرا کے بجاے مہ و خورشید را اکرا ہے، اسی کے دوسرے شعر میں اسے ہر کہ کے بجاے اسے آنکہ ہے، تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں رضواں اگر بہ جنید (؟) ہے، چوتھے شعر کا دوسرا مصرع مطبوعہ نسخہ میں بالکل بدلا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے:-

ع شرح فراق خویش بتو چوں تواں نوشت

پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں کشت امید کے بجاے تخم امید ہے، اور دوسرا مصرع یہ ہے،

بگذر بکشت زار کہ زارست حال کشت

آخری شعر کے پہلے مصرع میں چند اے حسن بریشہ جاں کے بجاے مطبوعہ نسخہ میں چند یں حسن برشتہ، جاں ہے، اور اس کا دوسرا مصرع اس طرح ہے،

ع سست گلستہ چشم ...

کتابت کی ان غلطیوں کو نظر انداز کرکے اس مجلس میں جو کیفیت طاری ہوئی
اس کے ایسا نقشہ فوائد الفواد میں نہیں ملتا، اسی طرح افضل الفوائد میں ہے کہ ایک موقع
پر فرمایا کہ میں نے قصص الانبیاء میں لکھا ہوا دیکھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس قدر
روئے تھے کہ ان کے گوشت پوست اور رخسار کی ساری چیزیں بہہ گئی تھیں، آپ
سے پوچھا گیا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں، جواب دیا کہ میں کیا کروں، کہ میرا یہ
دیدہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے، جن کو نہ دیکھنا چاہئے، میں حق تعالیٰ سے مغفرت
چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو اس کے لئے بخش دے، جب خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے یہ حکایت
بیان کی تو حسن سجزی مجلس میں حاضر تھے، وہ جھکے اور عرض کیا کہ اسی بات کو میں
نے چند مصرعوں میں ادا کیا ہے، اگر حکم ہو تو عرض کروں، فرمایا سناؤ، وہ اشعار
یہ ہیں :-

شبے آن چشم مست وآن لب خونخواره را دیدم
زگریہ چشم من خون شد پشیمانم چرا دیدم
ندیدی چشم من بر سر زلف بلا شوری
ازیں چشم پریشاں بیں ہمیشہ ایں بلا دیدم
مرا گفتند سوے او مبیں دیدم بلا کردم
چہ خوش گفتند روے او مبیں دیدم جفا دیدم

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے ان اشعار کو سن کر بڑی تعریف کی (ص ۳۶-۳۷)
اوپر جن دونوں مجلسوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان دونوں میں امیر حسن سجزی موجود تھے

انھوں نے اپنی فوائد الفواد میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ
بھی رہے تھے کہ ان کو امیر خسرو قلمبند کر رہے ہیں، پھر ان کو اپنی فوائد الفواد میں کیسے ذکر
کرتے جس حجری کے مطبوعہ نسخہ میں مذکورہ بالا غزل ہے، جس میں چند اشعار ہیں مگر افضل الفوائد
میں صرف تین ہی اشعار حسب مطلب نقل کیے گئے ہیں، اوپر کے دوسرے شعر میں کتابت کی
تھوڑی غلطیاں ہیں، اس کا پہلا مصرع مطبوعہ دیوان میں اس طرح ہے،

ندیدا این چشم من جز در سر زلف بلا شورش

اب کتابت کی ان غلطیوں کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ یہ شعر جعلی ہے تو کیا یہ کہنا صحیح
ہوگا، اسی طرح آخری شعر کا دوسرا مصرع مطبوعہ نسخہ کے مصرع سے بالکل مختلف
ہے، مطبوعہ نسخہ میں یہ مصرع اس طرح ہے،

مرا گفتند گفت دل کمی کردم سزا دیدم

اس اختلاف سے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، ایک تو یہ کہ یہ سب کچھ جعلی اور فرضی ہیں،
یہ کہ یہ کتابت کی غلطیاں ہیں یا یہ کہ ملفوظات قلمبند کرنے میں سہو ہو گیا ہو، اس کے بعد
یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بہت سی غلطیاں اور ہونگی جن کو دیکھ کر یہ فرضی بات گڑھنے
میں آسانی ہو گئی کہ یہ ملفوظات جعلی ہیں،

اگر ذہن صاف ہو تو اوپر کی جن دو مجلسوں کی پر کیف باتوں کا ذکر آیا ہے، ان میں
ایسے نکتے پیدا کیے جا سکتے ہیں، جو اور دوسرے مجموعہ ملفوظات میں نہ ملیں گے، ایسے ہی
نکتے اور مجلسوں میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً

ایک بار عشق پر کچھ باتیں نکل پڑیں تو خواجہ ادام اللہ برکاتہ کی آنکھیں پر آب
ہو گئیں اور یہ شعر زبان پر لائے ؎

فلولاکم ماعرفنی الہویٰ ۔۔۔ ولولا الہویٰ ماعرفناکم

پھر شوق و اشتیاق (یعنی جذبۂ عشق) سے مغلوب ہو کر یہ دو شعر پڑھے

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی ۔۔۔ چندیں سخن عشق کہ گفتی کہ شنودی

گر باد نبودی سر زلفش کہ ربودی ۔۔۔ رخسارۂ معشوق بہ عاشق کہ نمودی

ایک دوسری مجلس میں ہے کہ خواجہ کی چشم پر آب ہو گئی، اور فرمایا کہ عشق کا سرمہ ایسا سرمہ ہے کہ اگر یہ آنکھوں میں لگا لیا جائے تو فرش سے عرش تک کوئی حجاب نظر نہیں آئے، پھر یہ دو مصرعے زبان مبارک پر لائے۔ (ص ۳۹)

عشق آئینہ ایست کاندر و زنگی نیست

نامردان را ازیں گل رنگی نیست

اگر یہ ساری باتیں لفظ بہ لفظ کسی اور مجموعۂ ملفوظات میں پائی جائیں تو پھر یہی سمجھا جائیگا کہ یہ ملفوظات مسروقہ ہیں، ورنہ یہ سمجھنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ یہ باتیں ایک عارف باللہ ہی کی زبان سے نکل سکتی ہیں، اور ایک صاحب دل ہی ان کو قلمبند کر سکتا ہے، ورنہ ایسی مجلسوں سے دور رہ کر کوئی محض ملفوظات کے ایک مجموعہ کو فروخت کرنے کی خاطر نہیں لکھ سکتا،

(باقی)

جمالی

لودی اور مغل دور کا شاعر

(۲)

از ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم، مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

مثنوی مرآۃ المعانی یہ مثنوی شش رکنی بحرِ رمل مقصور میں لکھی گئی ہے۔ اس میں سات سو اشعار ہیں۔ اس میں تصوف کی مختلف منزلوں کا بیان ہے۔ اس کے دو مخطوطات کا سراغ ملا ہے ایک پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا حبیب گنج کتب خانہ، علی گڈھ میں[۱]۔

اس کی ابتدا حمد[۲] سے ہوتی ہے پھر نعت[۳] ہے اور نعت کے بعد شیخ سماء الدین کی منقبت[۴] اور پھر مقصدِ تصنیف[۵]۔

---

۱ مقالات شیرانی صفحہ ۲۱۳ تا ۲۳۱ (اورینٹل کالج میگزین شمارہ نومبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۴ تا ۷۴) مصنفہ ایچ۔ آر۔ کے شیرانی بھی دیکھئے ۲ مرآۃ المعانی پنجاب یونیورسٹی (مخطوطہ) ورق ۱۱ الف تا ۱۲ الف ۳ ایضاً ورق ۱۲ الف تا ۳ ب ۴ ایضاً ۳ ب تا ۴ ب ۵ ایضاً ۴ ب تا ۵ ب

مثنوی کی ابتدا سراپا سے ہوتی ہے[1] - جامی کا خیال ہے کہ جسم کے حصے محض مادی کام انجام دینے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ ان کے کچھ روحانی کام بھی ہیں، سراپا میں جن اعضا کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہیں زلف، رخسار، خط ابرو، چشم، دہن، لب، زنخدان، زلف، خال، گیسو، ساعد، قامت اور کمر[2] اس کے بعد تصوف میں مستعمل مختلف اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے جیسے کفر، میخانہ، مے فروش، رند قلاش، صبر اور تسلیم وغیرہ -

سببِ تصنیف | جامی نے اس کا سبب تصنیف خود ہی بیان کیا ہے[3] وہ کہتا ہے کہ اکثر اس سے پوچھا جاتا تھا کہ تصوف میں، زلف، خد و خال، دود و دوی، گیسو، چشم و ابرو، قد، کمر، دہن، خط و ذقن، شاہد، ساقی و جام بت و بتخانہ اور زنار کی کیا اہمیت ہے، اس لیے اس نے یہ مثنوی لکھ ڈالی، تاکہ سائل اسے پڑھ کر خود ہی اپنے سوالوں کے جواب پائے اور ایسے سوالات اس سے بار بار نہ پوچھے جائیں اور اسی لیے اس مثنوی کا نام اس نے مراۃ المعانی رکھا ہے[4] وہ کہتا ہے

هرچه بود از آشکارا و نهان — اصطلاح عارفان کردم بیان
از رخ معنی حجاب انداختیم — آنچه پنهان بود پیدا ساختیم
نامه را چون روشنائی برفزود — گشت مرآتی که روی حق نمود
چون معانی کرد حق الهام او — گشت مرآة المعانی نام او

مثنوی کا اختتام خاتمہ[5] پر ہوتا ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں

منت ایزد که در بحر عظیم — آشنا گشتم پی در یتیم

---

[1] مراۃ المعانی ۵ ب تا ۱۱ الف [2] ایضاً ۸ ب تا ۵ الف [3] ایضاً ۵ الف [4] ۵ ب

ندر آن دریائے پر خون بے درنگ — خویش را انداختم مثل نہنگ
وط خوردن ہچو خواصان دور — مشکل خود ساختم آسان دور
ین معنی چون صدف بشگافتم — گوہر اسرار حق دریا فتم
ے جالی جملہ دریا نوش باش — چون صدف پُر در شود خاموش باش

اس مثنوی سے محض اتنا ہی پتہ نہیں چلتا کہ جالی کو زبان پر قدرت حاصل
تھی بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تصوف کے جملہ مسائل سے کما حقہٗ واقف تھا۔ اس نے
نستہ، سلیس، دلکش اور مسحور کن زبان استعمال کی ہے۔ تصوف کے جن مسائل کا اس
میں ذکر ہے، ان پر بحث کرنے کے لیے ادق الفاظ اور مشکل اصطلاحات کا استعمال
ناگزیر ہوتا ہے لیکن جالی ان مراحل کو آسانی کے ساتھ طے کر گیا ہے۔ چند شعر
مثالاً درج کیے جاتے ہیں جن سے زبان و بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حمد

نامہ آغاز م بنام ذوالجلال — آن کہ بیرون ذاتش از وہم و خیال[1]
جانِ عالم پرتو انوار اوست — عرشِ اعظم نقطۂ پرکار اوست
صانع ہفت و نہہ و پنج و چہار — خالق ماہ و خور و لیل و نہار
عالم اعیان کہ آیات ویست — حرف ہائے معرف ذات ویست

نعت

احمد مرسل کہ محبوب خداست — در صفِ اول امام انبیاست[2]
گوہر بحر صفات و ذات اوست — بیگمان مقصود موجودات اوست

---

[1] مراۃ المعانی ورق ۱ الف [2] ایضاً ورق ۲ الف تا ۲ ب

گر نہ بودے ذات آں عالی صفات — در عدم ماندے وجود کائنات

وز پس توحید و نعت مصطفیٰ — برکشایم مدح پیر با صفا[1]

زانکہ اول واجب آمد بر مرید — تا بساز د نام پیر خود پدید

چون کلید نام پیر آمد بدست — برکشاید ہر قفل گنجے کہ ہست

ہر کہ اول ذات پیر خود شناخت — با خدا آخر تواند عشق باخت

ہر کہ او عاشق نہ شد بر روئے پیر — با خدا ہرگز نہ شد نعمت پذیر

ہست چشم اینجا بمعنی نظر ذات — کز عیان بنید وجود کائنات[2]

ہست گیسو راہ او دور و دراز — ہر کہ اینجا شد نشد بر خویش باز[3]

ساعد آمد قدرت دانائے راز — می کند ہر سو کہ می خواہد دراز[4]

کفر در فقر و فنا کوشیدن است — خویشتن را در فنا پوشیدن است[5]

مے فروش اینجا بمعنی مرشد است — ہر کہ او مرشد نہ دارد ملحد است[6]

رندی این جا عالم بے باکی است — در طریقت چستی و چالاکی است[7]

مثنویات جمالی | مختلف کیٹلاگ[8] میں درج ذیل مثنویات بھی جمالی کے نام سے منسوب ہیں:

(الف) بیان حقائق احوال سید المرسلین (ب) محبوب الصدیقین (ج) مہر القلوب

---

[1] مراۃ المعانی ورق ۳ ب [2] ایضاً ورق ۸ الف [3] ایضاً ورق ۹ ب [4] ایضاً ورق ۱۰ الف [5] ایضاً ورق ۱۱۲ الف [6] ایضاً ورق ۱۱۲ ب [7] ایضاً ورق ۱۱۳ الف [8] کیٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹ آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد اول صفحہ ۲۸۲ تا ۲۸۶ بوہار لائبریری جلد اول صفحہ ۲۶۳ تا ۲۶۵ شاہان اودھ کا کتب خانہ صفحہ ۴۴۳ تا ۴۴۷ بوڈلین لائبریری صفحہ ۲۸۷ تا ۲۸۸

کشف الارواح (ہ) فرحت نامہ (و) نصرت نامہ (ز) قدرت نامہ (ح) فضیلت العقل (ط) نور علیٰ نور۔

ن۔ بیان الحقایق احوال سید المرسلین[1] یہ مذہبی مثنوی مخمس اور جامع ہے۔ اس کی بحر مثمن۔ رمل محذوف ہے۔ مولانا روم نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی اسی بحر میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ حصے ہیں اور ہر حصے کا نام جداگانہ رکھا گیا ہے۔ اختتام پر کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصباح الارواح اس کا پہلا[2] اور شہر الواصلین اس کا ساتواں اور آخری حصہ ہے[3]۔ باقی حصے یا تو دستیاب نہیں یا جمالی کے نام سے منسوب دوسری مثنویات میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس نکتہ پر آگے بحث آتی ہے۔

۱۔ پہلا حصہ مصباح الارواح یہ بیان الحقایق کا پہلا حصہ ہے۔ اس کی تکمیل[4] ۲۰ صفر المظفر ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء کو ہوئی

ماندہ بد دہ روز از ماہ صفر	کیں فلک گردید با شمس و قمر
ہشت سال و شصت سال و ہشتصد	رفتہ بعد از ہجرت شاہ رصد

---

[1] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ نمبر ۶۴۴ کیٹلاگ صفحہ ۲۸۳ [2] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ جلد اول ورق ۱۶۷ الف تم القسم الاول من بیان حقایق احوال سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقد سمی ھذا القسم بمصباح الارواح والحمد للہ رب العالمین [3] ایضاً جلد دوم ورق ۱۰۰ ب تم الکتاب المسمیٰ بشہر الواصلین وبا تمامہ تم الاقسام السبعۃ الموعودۃ من الکتاب الوارد فی بیان حقایق احوال المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والحمد للہ رب العالمین

[4] ایضاً جلد اول ورق ۱۶۷ الف

یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی احادیث پر مشتمل ہے۔ اس میں قرآنی آیات کے حوالے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سمجھانے کے لیے کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس میں رسول اللہؐ کی احادیث اور حضرت علیؓ کے اقوال نثر میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ کچھ عربی اشعار بھی ملتے ہیں[1]

اس میں رسول اللہؐ کے ذکر کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے

[2] زانکہ بے مصباح ننماید جمال — حسن خوباں در جبین بے مثال
ذکر نور مصطفٰی در منزلات — فاش بنمودم دریں ذات و صفات

مصباح الارواح مصنف کی پہلی کتاب نہیں۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس ضخیم کتاب کی تصنیف سے پہلے وہ تیرہ کتابیں لکھ چکا ہے۔

[3] بعد از مصباح روح عاشقاں — شعلہ افروز دریں مشکات جاں

ان تیرہ کتابوں کے نام اس نے (حصہ اول ورق ۱۷۴ تا ۱۷۵) خود تحریر کیے ہیں جو درج ذیل ہیں،

(۱) مرآت (۲) کنز و قائق (۳) روح القدس (۴) تنبیہ (۵) محبوب (۶) کشف الارواح (۷) مفتاح فتوح (۸) ملفوظات (۹) غزل (۱۰) مستزاد (۱۱) قصائد (۱۲) ترجیعات (۱۳) میزان حقائق

ان کی ضخامت کے پیش نظر مشکل ہی سے انہیں کتاب کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] مصباح الارواح جلد اول ورق ۱۵۴ الف [2] مثنویات جامی مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)، جلد اول ورق ۱۷۴ الف
[3] ایضاً ورق ۱۷۵ ب

(ب) ساتواں حصہ۔ شرح الواصلین، اس کا پورا نام شرح الواصلین وصیف الی اصلین وشہید المرتبثین وسیم الغافلین ہے۔ اسپرنگر (SPRENGER) نے اس کا نام شرح الواصلین وسیم الغافلین وشہید المرتبثین وصیف الی اصلین لکھا ہے۔ ایوانوف (IVANOW) نے اپنے کیٹلاگ میں اس کا نام شرح الواصلین وتوصیف الی اصلین لکھا ہے جو غلط ہے، اس حصے کا پورا نام مخطوطہ حصہ دوم ورق ایک اور ۲ الف (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ ایوانوف کی نظر سے یہ مخطوطہ گذر چکا ہے، پھر بھی وہ غلطی کر گیا۔ علاوہ ازیں توصیف الی اصلین مفہوم کے لحاظ سے بھی بے معنی ہے۔

یہ حصہ ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل ۸۸۲ھ میں ہوئی ہے[۳]

چونکہ شرح الواصلین آرام یافت	دل زین یار جام کام یافت
مہر باید کرد بر نام حبیب	تا شود تاریخ وپیغام غریب
ھجرت آں در د نوش وصاف کش	بود اندر ھشت صد وھفتاد وشش

(۸۷۶ھ)

اس کی زبان وبیان مصباح الارواح کی زبان وبیان جیسی ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت علیؓ کی دل کھول کر تعریف کی گئی ہے۔

چونکہ شرح الواصلین است ایں کتاب	داتمایم حسن ماہ وآفتاب
از محمد گویم واز آل او	در علی بوطالب واقبال او

---

[۱] مثنویات جامی جلد دوم ورق ایک اور ۲ الف [۲] کیٹلاگ آف لائبریری آف اودھ صفحہ ۴۴۴ [۳] مثنویات جامی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد دوم ورق ۸۸ اب [۴] ایضاً ورق ۸۸ اب

مصنف پہلے ایک یا دو حدیث لکھتا ہے پھر اس کا فارسی ترجمہ کرتا ہے پھر نثر میں اس کی تشریح کرتا ہے اور اشعار میں دلائل پیش کرتا ہے۔ اس میں شیعہ اماموں اور درویشوں کے اقوال ناصحانہ اور صوفیانہ انداز میں نقل کیے گئے ہیں۔

(۵) دوسرے حصے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مصباح الارواح (مثنوی کا پہلا حصہ) [illegible] میں اور ساتواں اور آخری حصہ شرح الواصلین [illegible] میں مکمل ہوا اس سے ظاہر ہے کہ دوسرے حصے (دوم سے ششم تک) اسی درمیان میں لکھے گئے ہوں گے۔ اس طرح مثنوی بیان الحقایق کے ساتوں حصے نو سال میں مکمل ہوئے۔ آخری حصے میں مصنف نے شرح الواصلین سے پہلے لکھی گئی کتابوں کی ایک لمبی فہرست زیر عنوان "اشارات باسامی کتب" دی ہے۔[1] ان میں سے محض تین زمانہ کے دست برد سے بچ سکیں واضح ہے کہ یہ [illegible] سے پہلے لکھی گئی ہوں گی۔ ان تینوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محبوب الصدیقین[2] (۲) مہر القلوب[3] (۳) کشف الارواح[4]۔

اس فہرست میں سے اگر ان کتابوں کے نام نکال لیے جائیں جن کے نام پہلے حصے مصباح الارواح (سال تصنیف [illegible]) میں درج ہیں تو باقی کتابوں کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے وہ بھی [illegible] اور [illegible] کے درمیان لکھی گئی ہوں گی چونکہ تین مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ کسی دوسری کتاب کا سراغ نہیں ملتا اس لیے یہ ممکن نہیں کہ بیان الحقایق کے بقیہ پانچ حصوں کا تعین کیا جا سکے البتہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نام شرح الواصلین میں درج ہیں۔

---

[1] مثنویات جانی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد دوم ورق ۱۸۲ ب تا ۱۸۳ ب
(۱) نعت و منقبت (۲) مرأت (۳) گنج (۴) روح القدس (۱۸۳ ب ورق) (۵) تنبیہ (۶) محبوب

(محبوب القلوب) الصدیقین یہ ۱۰۸ صفحوں کی ایک مختصر مثنوی ہے لیکن بوہار لائبریری (جلد نمبر ۳۵۷)
فوظ پانچ مثنویوں میں سب سے طویل مثنوی یہی ہے۔ بقیہ چار مثنویاں صرف ۴۲ صفحات
تل ہیں۔ یہ بیان الحقائق کا حصہ نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بیان الحقائق کے پہلے جے مصباح الارواح؟
دو سال پہلے ۸۶۲ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ سے

ت صد و شصت و شش ز ہجرت . دست کرد صاف اوبجام سبو است

اس مثنوی کا انداز بیان بھی دوسری مثنویوں جیسا ہی ہے لیکن اس کی بحر بدلی
لی ہے۔ یہ مثنوی صدق اور سچائی کی تعلیم دیتی ہے، اس لیے اس کا نام محبوب الصدیقین
ھا گیا ہے۔ یہ خدا سے لو لگانے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔

بس کنم ایں حدیث پر آشوب	روئے آرم بجانب محبوب
ایں مقالات و ذکر آتشبار	ہیچ کردم زبہر راہ گذار
تا بخوانند و ذکر راہ کنند	چشم دل سوئے روئے شاہ کنند
زاں دریں کتاب اے ستار	شرح زلف و خال آں دلدار
اندریں سفر ذکر بتاں نیست	غیر اشراق حال مستاں نیست

بقیہ حاشیہ ص ۲۶۸ (۷) کشف روح (۸) مصباح (۹) احکام (۱۰) نہایت (۱۱) بدایت (۱۲) ہدایت
(۱۳) فتح ابواب (۱۴) شرح الواصلین (۱۵) ترکیب و ترجیع (۱۶) مشکوٰۃ (۱۷) کلید باب فقر
(۱۸) معلومات (۱۹) مہر افروز (۲۰) مستزاد (۲۱) قصائد (۱۸۳ ب ورق) (۲۲) غزل
(ورق ۱۸۳ ب) (۲۳) میزان (۲۴) مہر القلوب ۔ ۲ مثنویات جمالی مخطوطہ (بوہار) نمبر ۳۵۷
ورق ۸۰ ب تا ۱۰۲ الف ۔ ۳ ایضاً ورق ا ب تا ۸۰ الف ۔ ۴ بوڈلیہ لائبریری کیٹیلاگ ورق ۴۸۷ تا ۴۸۸

۱ مثنویات جمالی مخطوطہ بوہار نمبر ۳۵۷ ورق ۱۰۲ الف ۲ مثنویات جمالی مخطوطہ بوہار نمبر ۳۵۷ ورق
۳۱ ب ۳ ایضاً ورق ۱۰۲ الف

میں مصنف نے لکھا ہے کہ وہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد مصباح الارواح تالیف کرتا ہے گا' اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بیان الحقائق کے گم شدہ حصوں میں سے ایک نہیں۔

اس کتاب کا موضوع بھی تصوف ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں کی آمیزش ہے۔ دوسری مثنویوں کی طرح اس میں بھی قرآن حدیث اور بزرگوں کے اقوال کے حوالے ہیں۔ ان کا فارسی نثر میں ترجمہ اور تشریح ہے۔ اور آخر میں اشعار پر کہانیاں بیان کی گئی ہیں تاکہ قاری اچھی طرح مفہوم سمجھ لے۔ اس کی بحر مسدس رکن ہزرج محذوف ہے جو محبوب الصدیقین اور بیان الحقائق کی بحر نہیں۔

اب ہم باقی چھوٹی مثنویوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں: فرصت نامہ[۲] نصرت نامہ[۳] قدرت نامہ[۴] فضیلت العقل[۵] نور علی نور[۶]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں کہن سالی میں بیان الحقائق کی تکمیل کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان کا ذکر محبوب الصدیقین۔ مصباح الارواح اور شرح لوامع[۷] میں نہیں ملتا۔ ان کے عنوانات بھی یہی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ کہن سالی کی تصنیفات ہیں کہن سالی میں اسے فرصت ہی فرصت تھی' نصرت' قدرت اور فضیلت اسے حاصل تھی' اور سب مل کر "نور علی نور" بن گئیں۔

---

[۱] مثنویات جالی ورق ۱ الف بنامت نامہ را سر برکشایم کہ اندر کوئے عشقت می سرایم

[۲] مثنویات جالی بوہار مخطوطہ نمبر ۵۷ ورق ۶ ب تا ۱۱ الف [۳] ایضاً ورق ۱۱ ب تا ۲۱ الف [۴] ایضاً ورق ۲۲ ب تا ۳۰ الف [۵] بوڈلین لائبریری مخطوطہ نمبر ۱۲۷ ورق ۱۸ ب تا ۲۳ ب [۶] ایضاً ورق ۱۲۰ الف تا ۱۲۱ الف [۷] مثنویات جالی بوہار مخطوطہ ورق ۹۸ الف تا ۹۸ ب مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد اول ورق ۴۷ ب تا ۵۷ ب جلد دوم ورق ۱۸۲ اب تا ۱۸۳ ب

ان مثنویوں سے چند شعر نمونتاً درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) بیا فرصت شمار این زندگانی   بچنگ آور حیات جاودانی

(فرصت نامہ ورق ۶ ب)

(۲) جالی بند کن این راز خوبان   بہار آمد روان شد سوئے بستان

(ایضاً ورق ۱۱ الف)

(۳) بہ تقویٰ اقتدا با مصطفیٰ کن   ببیں اس قامت ورد ورد خدا کن

بہ پیش مرتضیٰ بے شک فنا شو   با این علم و عمل دایم بقا شو

(ایضاً ورق ۱۰ ب)

(۴) جالی درین حسن گرفتار شد   کز خوش قامتے دید و بردار شد

(نصرت نامہ ورق ۱۳ ب)

(۵) جالی معین محبت بدید   جالش بدید و بجانش برسید

(قدرت نامہ ورق ۳۷ الف)

(۶) یکے وصل می دید در اصل ذات   یکے فرع می دید اندر صفات

(ایضاً ورق ۴۳ الف)

(۷) مرتضیٰ ساقی و جالی جام   مرتضیٰ بادہ و جالی کام

(ایضاً ورق ۳۷ الف)

(۸) باخرد مند باش و جبرش (؟) باش   مقصد کل نمودہ خوش باش

(نور علی نور ورق ۲۷ الف)

ان مثنویات میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ حوالے ان کی تشریح اور کہانیاں بھی ان میں پائی جاتی ہیں

نعتِ سنائی

از

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

فارسی زبان کے صوفی اور نعت گو شعراء میں حکیم سنائیؒ کو مقام رفیع اور مرتبۂ عالی حاصل ہے مشرب فقر میں مشائخ صوفیہ انہیں شیخ عالی قدر تسلیم کرتے ہیں اسم گرامی مجدود بن آدم ہے اور کنیت ابوالمجد ہے سنائی تخلص فرماتے ہیں

شعرا را بلفظ منضودم زین قبل نام گشت مجدودم (سنائی)

سنہ ولادت بہ تحقیق و تعیین مذکور نہیں لیکن مدرس رضوی نے تحقیق کے بعد ۴۷۳ھ کو قرین قیاس کہا ہے[1] وطن غزنین تھا[2]

گرچہ مولد مرا بہ غزنین بود نظم شعرم چو نقش ماچین بود

ابتدا میں شعرگوئی کو مدح امراء میں وسیلۂ معاش بنا لیا تھا[3] ایک دن ایک رند پاکباز کے اس طنز مخلصانہ پر کہ سنائی دروغ گو ہے یعنی مداح امراء ہے اگر قیامت میں سوال ہو کہ دربار میں کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا اس شغل سے توبہ کرکے گوشۂ قناعت اختیار کیا بعد ازاں حلقۂ تصوف میں داخل ہو گئے۔

من یکے شاعرم ذلیل و غریب راہ عزلت گزیدہ در عالم

یا تو یہ حال تھا کہ شب و روز تاجداروں کے درباروں میں مدح خوانی کرنے

---

[1] مقدمہ دیوان سنائی مرتبہ مدرس رضوی ص و [2] ایضاً ص ہ

نذر قبول ہو۔ آپ یہ حال ہو کر تا جداروں کی نذر تک قبول نہ کرتے، اور اپنے ہاں ان کی حاضری کی درخواست یہ کہہ کر رد فرما دیتے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا"۔ دین و دیانت کا یہ درجہ تھا کہ

عنایت ازلی راہ بسر چشمہ ازلی بردہ و بطور یکہ خود گفتہ بندۂ دین و
چاکر ورع و پارسائی بودہ است[۱]

برہنہ سر و پا عالم بے تابی و اضطراب شوق میں حج و زیارت مبارک سے مشرف ہوئے۔ غزنین واپس ہوئے تو جذب و مستی کا ایک عالم طاری تھا۔ حالِ دل ترک ماسوا پر مائل تھا۔ شیخ ابو یوسف ہمدانیؒ سے بیعت ارادت فرمائی۔ پھر صحبت شیخ نجم الدین کبریٰ سے بھی فیضیاب ہوئے۔ وفات کے وقت یہ شعر وردِ زباں تھا

بازگشتم زاں چہ گفتم زاں کہ نیست　　در سخن معنی و در معنی سخن

پایان زندگی کے متعلق قرین صواب قول ۵۴۵ھ (۱۱۵۰ء) سے پہلے کا ہے۔ شاعر نے یہ تاریخ وصال کہی

عقل تاریخ نقل او گفتا　　طوطی او بہ جنت والا[۲]

حکیم سنائی نے تقریباً ۳۰ ہزار اشعار کہے ہیں جو ان کی مندرجہ ذیل تصانیف میں مندرج ہیں:۔

(۱) دیوان قصائد و غزلیات۔ ایک بار یہ دیوان طہران میں اور پھر بمبئی میں طبع ہوا ہے اس میں تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں[۳]۔

---

[۱] نفحات الانس جامی ص ۲۸۹ [۲] مقدمہ دیوان سنائی از مدرس رضوی ص د ک ب۔
[۳] مقدمہ دیوان حکیم سنائی از رضوی ص بز [illegible] مقدمہ سیر العباد الی المعاد از سعید نفیسی۔

(۲) مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ و شریعۃ الطریقۃ: اس مثنوی میں بھی تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں، ارباب نظر اس کو حکیم سنائی کا شاہکار شمار کرتے ہیں جس کی تکمیل ایک سال کی مدت میں ہوئی

(۳) طریق التحقیق | کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں طریق التحقیق حکیم سنائی کے نام سے فارسی تصوف میں ایک قلمی مثنوی ہے[1] اس کو محمد فخرالدین صاحب کاتب نے کسی نسخہ سے نقل کیا ہے، آخر کتاب میں یہ عبارت درج ہے:-

تمت هذه الرسالة الشریفة مسمیٰ طریق التحقیق حکیم سنائی قدس الله سره العزیز

اس مثنوی میں چند مختلف صوفیانہ اور الٰہیاتی عنوانوں پر منظوم بحث و تلقین ہے لیکن اس میں کوئی عنوان نعت سے متعلق نہیں ہے

(۴) مثنوی سیر العباد الی المعاد | حکیم سنائی نے حدیقہ ہی کی بحر میں یہ مثنوی لکھی ہے اس کے شائع ہونے کی عرصۂ دراز تک نوبت نہیں آئی تھی، جامعۂ طہران کے نامور ادیب پروفیسر سعید نفیسی کی تصحیح اور حسین کوہی کرمانی کے اہتمام سے چھاپ خانہ آفتاب طہران میں شائع ہوئی ہے، مثنوی کی معنوی قدر و قیمت کے لحاظ سے حدیقہ کے بعد اس مثنوی کا مرتبہ مانا جاتا ہے

مثنوی سیر العباد الی المعاد کہ پس از حدیقہ پُر مغز ترین و بہترین مثنویات ہست[2]

لیکن اس کتاب میں بھی کوئی نعتیہ کلام موجود نہیں،

(۵) حدیقہ میں نعت | عام طور پر شعرا مثنویات میں حمد کے بعد نعت کو آغاز سخن میں بطور تبرک جگہ دیتے ہیں لیکن نعتیہ شاعری کے اس اولین ممتاز مخزن "حدیقۂ سنائی"

---

[1] فہرست مخطوطات کتبخانہ آصفیہ نمبر ۴۴۳، تصوف فارسی [2] سیر العباد الی المعاد مقدمہ آقای سعید نفیسی صفحہ ب

کا یہ عالم ہوا ہے

ملک توران و مملکت ایران ۔۔۔ شدہ از جور یکدگر ویران

حبشہ تا خفتہ سوئے یثرب ۔۔۔ فیل با ابرہہ ز حرص غضب[1]

خانہ کعبہ گشتہ بت خانہ ۔۔۔ بگرفتہ بغصب بے گانہ

بر جہالت جہاں ویر نیرنگ ۔۔۔ بر خرد مند راہ دین شد تنگ[2]

عالم انسانیت کی اس تباہی و گمراہی کو دور کرنے کے لیے نور ہدایت محمدی طلوع ہوا جیسا کہ پہلے بھی عہد بعہد انبیاؑ مطالع انوار بن کر ظہور پذیر ہوتے رہے ظلمات شرک انوار توحید ہی سے رفع ہوتے ہیں اور توحید کے حامل و علمبردار انبیاؑ ہی ہوتے ہیں اس لیے حکیم سنائی ثنائے حق کے بعد ثنائے انبیا سپرد قلم کرتے ہیں خاصۃً نعت احمد مرسلؐ و رحمت عالمؐ

چوں بگفتی ثنائی حق طرداں ۔۔۔ پس بگو نعت احمدؐ مرسل

چوں ز توحید گفتہ شد طرفے ۔۔۔ گفت خواہم ز انبیا شرفے

خاصۂ نعت رسول بازپسیں ۔۔۔ آں ز پیغمبراں بہیں و گزیں[3]

اس تمہید کے بعد باب ثانی یعنی "باب الثانی فی فضیلۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے نعتیہ نظموں کا سلسلہ شروع ہے پہلی نظم بعنوان فی فضیلۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وعلی سائر الانبیا ہے۔

ابتدا کے چند شعر آفتاب سعادت کی چند تجلیات کا تذکرہ ہیں کہ آفاق میں ایسا پا مرد کوئی ظاہر نہیں ہوا کہ اس کے نور کی تعظیم کے لیے دونوں عالم

---

[1] حدیقہ باب اول ص ۱۸، [2] حدیقہ باب اول ص ۱۸، [3] ذکر الانبیاء

ہ ہ رہبر ہدا کے بیان،

آمد اندر جہان جانِ ہر کس | جانِ جانہا محمد آمد و بس
چون بجنبید بر سپہر جلی | آفتاب سعادت ازلی
آن سپہرش چو بار دادِ ازل | آفتابش کہ احمد مرسل[1]

سنائی نے اس کے بعد سارے انبیاء پر فضیلت کے چند پہلو اور وجوہ کا ا
افت سے لکھے ہیں،

دیدہ جانِ پاک آدم ازو | معنی بکر[2] نقطۂ محکم ازو
انبیاء ریختہ ہم از زر او | ہر چہ شان نقد بود بر سر او
تا شب نیست صبح ہستی زاد | آفتاب چنین ندارد یاد[3]

ذکر فضیلت کے اختتام پر "عالم جزو و نفس کل" کے ساتھ آپ کی نسبت کا
بیان ہے،

عالم جزو را نظام بدو | غرض نفس کل، تمام بدو
قدمش در ازل نفرسودہ | قدمش در ابد نیاسودہ
ہست کردہ ز نور و لطف گلش | شرق و غرب ازل دروی و دلش[4]

دوسری نظم کا عنوان ہے، فی معراجہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ " اس نظم کا
مطلع ہے،

بر نہادہ ز بہر تاج قدم | پای بر فرق عالم و آدم[5]

---

۱ حدیقہ باب اول ص ۱۸۳ ذکر انبیاء ۲ معنی بکر نقطۂ محکم کنایہ از آیات محکم است۔ ص ۱۸۳ و ۱۸۵ ۳ حدیقہ ص ۱۸۳ ۴ حدیقہ ۱۸۵-۱۸۴ ۵ ایضاً ۱۸۵-۱۸۴

اس کے بعد ذکر معراج شروع ہوتا ہے اور صرف سات آٹھ اشعار میں
واقعات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ واقعات کے بیان نے اختصار کے باعث
جامع اشارات کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔

گفت سبحانش الذی اسریٰ | شدہ زانجا بہ مسجد اقصیٰ
در شب از مسجد حرام بکام | رفتہ دیدہ و آمدہ بمقام
بنمودہ بدو عیاں مولیٰ | آیۃ الصغریٰ و آیتہ الکبریٰ

معراج مبارک کے اس بیان میں بیانیہ مثنویات کا سا نہ تسلسل ہے نہ
تفصیل، صرف چند اشعار میں بلا ترتیب چند اہم واقعات کی طرف اشارے
کر دیئے گئے ہیں۔ یہ فارسی شاعری کا پہلا معراج نامہ ہے، اولیت و معنویت
کی وجہ سے اس کی اہمیت ہے، یہ معراج نامہ کی پہلی کڑی ہے، سنائی کے بعد کے
بڑے نعت گو شعراء نے معراج نامہ کو ارتقاء کے مدارج کمال پر پہونچا
دیا، خصوصاً نظامی کی نعتیہ شاعری میں معراج نامے نعتیہ شاعری کی معراج پر
پہونچ گئے ہیں۔

واقعات معراج کے بعد کی گفتگو معراج کے چند معنوی پہلوؤں پر مرکوز
ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے بعض شعراء واقعات معراج ہی کے سلسلہ میں
معنوی نکات سمیٹ لیتے ہیں، اس کے بعد سات اشعار حقائق محمدی کے سات نکات
کے ترجمان ہیں۔

شدہ اندر زمین لبفضل و نظر | خاک آدم ز آفتابش زر

سلہ حدیقہ ص ۱۰۶

زادہ از نطفۂ کن بکلم عدم | آدم از احمد و احمد از آدم

غرض عالم آدم از اول | غرض آدم احمد مرسل

از پے او نسانہ ما بچہ شد | بسر او خدائے را سوگند

در او بودہ جائے روح الامین | ہلّہ او سجدہ جائے روح القدس

گر نہ از بہر عاد بودے | ذل خاک این کمال ننمودے

خلق او مایۂ روح حیوان را | خلق او وہ بہ نفس انسان را[1]

تشبیہات ہیئت و فلکیات | ان نکات کے اختتام پر چند نعتیہ مضامین نے ہیئت و فلکیات سے ماخوذ تشبیہات کا پیرایہ اختیار کیا ہے[2]

اس کے بعد نئی نظم کا عنوان پہلی نظم کا تتمہ ہے البتہ بعنوان فی بدایۃ ذاتہ علیہ السلام[3] ایک مستقل نظم ہے اس نظم کے مباحث یہ ہیں

(۱) ظہور سے پہلے نور محمدی کا کیا مقام تھا اور کہاں (۲) فضل قدم نے اس رحمت الٰہی کو کیوں اور کس طرح رحمت عالم آب و گل دی (۳) اس ظہور رحمت کے کیا آثار پیدا ہوئے

اس کا جواب سنائی کی زبان پر یہ ہے۔

جان او بود در طریقت حق | گوہر حضرت حقیقت حق

رحمت آب و گل دریں عالم | رحمتش نام کردہ فضل قدم

زانکہ بنمود حق بجان و دلش | رمزہائے حقیقت از دلش

طینتش ز رحمت جہان آمد | راحتش راحت روان آمد[4]

۱؎ حدیقہ ۲۰۷، ۲؎ ایضاً ۲۰۸، ۳؎ ایضاً ص ۲۰۹، ۱۰

اس کے بعد کی نظم میں سنائی ؒ رسولؐ کی یہ کرامت واضح بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ آدم

ملک ابلیس ہو گیا تو آپؐ کا شیطان مسلمان و ملک ہو گیا۔ آپؐ نورِ جنیدؒ و دلِ جوینیؒ ہیں۔

واسطہ میانِ خلق و حق | فی اتباعہ علیہ السلام کے زیرِ عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا

اور مخلوق کے درمیان واسطہ قرار دیا ہے۔

معجزات | اس کے بعد معجزۂ شق القمر اور آتشکدہ کے سرد ہونے کا ذکر ہے۔

نطقِ رسولؐ اور دیدۂ قبول | معجزات کے بعد سنائی کہتے ہیں کہ نطقِ رسولؐ نے جو کچھ عقولِ انسانی

پر پیش کیا اُسے فطرتِ انسانی اور روحِ ایمانی نے دیدۂ قبول پر رکھا۔

نطقِ او ہرچہ در عقول نہاد روح بر دیدۂ قبول نہاد

یہ نظم اس پر ختم ہوتی ہے کہ جو کچھ نعتیہ مضامین بیان ہوئے ہیں انکی شرح یا سرچشمہ الم نشرح ہے

ہمہ خلق و وفا و بسط و فرح شرحِ این نعتہا الم نشرح[1]

شرحِ صدرِ رسولؐ | بعد کی نظم کا عنوان اسی مناسبت سے فی انشراح صدرہ علیہ السلام ہے۔

سینۂ او کشادہ روحِ نخست ہرچہ جز پاک دید پاک بشست[2]

عقل و رسالت | عقل کا تجربہ جوں جوں بڑھتا جائیگا یہ محسوس ہوتا جائیگا کہ عقل کو اشارۂ رسول

پر خمیدہ سر اور گوش برآواز ہونا چاہیے نورِ رسالت کے بغیر عقل یارِ دیو نفسانی ہوتی ہے

اور انوارِ رسالت کے ساتھ مل کر عقلِ روحانی بن جاتی ہے۔

نور کز خلقِ او مؤثر شد چشمۂ آفتاب ازو کور شد

عقل داؤد وارِ دو زِ محراب پیشِ او خم زدہ ر کعا وا ناب

شرع او روحِ عقلِ روحانیست رای تو یارِ دیوِ نفسانیست[3]

---

[1] حدیقہ ص ۱۹۹ [2] حدیقہ ص ۱۹۹ [3] حدیقہ ص ۲۰۲

وفیات

ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

گذشتہ ۲۰ر فروری کی رات کو ریڈیو میں خبر سنی کہ ڈاکٹر یوسف حسین اللہ کو پیارے ہوئے، یہ خبر سن کر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق بزرگ دائمی مفارقت دے گیا، رات بڑے کرب سے گذری۔

ان سے میرا پہلا تعارف ۱۹۳۲ء میں ہوا، میں کچھ دنوں جامعہ ملیہ میں بھی رہا، قرول باغ میں جس مکان میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے سکونت پذیر تھے، اسی کے پاس میں ایک مکان میں مقیم تھا، ان دنوں ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے استاد تھے، عید منانے اپنے محبوب بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس آگئے تھے، ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو سیاہ شیروانی میں ملبوس تھے، بہت ہی شکیل و رعنا جوان نظر آئے، اسی زمانہ میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین مرحوم یعنی ان کے سب سے بڑے بھائی کے لڑکے جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور مزید تعلیم کے لئے یورپ جانے کی فکر میں تھے، وہ خالی اوقات میں میرے پاس آجاتے، ان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے گھر کی عورتیں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو خوش قسمت اور مالدار سمجھتی ہیں، کیونکہ ان کے یہاں اچھے سوفہ سٹ اور دوسرے

فرنیچر ہیں جو اس زمانہ میں یہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں نہ تھے'

ڈاکٹر یوسف حسین کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ گیا اور ان کی وجاہت سے مرعوب ہو کر گھر واپس آیا۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر یوسف حسین نے گارساں دتاسی کے خطبات کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ کیا تھا جو رسالہ اردو حیدرآباد دکن میں شائع ہو رہا تھا یہ ڈاکٹر عبد الحق کی ادارت میں نکل رہا تھا اس میں کسی کی تحریر کا شائع ہونا اس کی علمی قابلیت کی بڑی سند تھی' ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کرکے فرانس گئے' اور پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی' وہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے فرانسیسی زبان بڑی محنت سے سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی' ہندوستان آکر ڈاکٹر عبد الحق کی فرمائش پر انھوں نے خطبات گارساں دتاسی کا ترجمہ شروع کیا تو اس کے پندرہ خطبات کے ترجمے کیے' جب یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تو ڈاکٹر عبد الحق ان کے بہت شکر گزار ہوئے' اس وقت وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ریڈر ہو چکے تھے' انھوں نے فرانسیسی ادب کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی'

مجھ کو دار المصنفین آئے ہوئے کچھ دن ہوئے تھے کہ ان کی انگریزی کتاب نظام الملک جاہ معارف میں ریویو کے لیے ۱۹۳۶ء میں آئی' اس کو بہت شوق سے پڑھا اور انگریزی زبان میں ان کی تحریری قدرت کا قائل ہوا' اس کتاب میں انھوں نے نظام الملک آصف جاہ کی سیرت نگاری جس طرح کی ہے وہ نظام حیدرآباد کے خاندان سے ان کی محبت کا ثبوت ہے' حیدرآباد میں ان کی زندگی کے بہت اچھے دن گزرے' اور انکی یادوں کی قندیلیں ہمیشہ روشن کرتے رہے'

نظام الملک دوسرے مذاہب کے بے حد روادار تھے لیکن اپنے اسلامی عقائد میں بہت پختہ تھے۔ ان کی پختگی یہیں تک تھی کہ وہ نعت گو اور اکثر کے تمام مذہبی مراسم اور عقائد کو بڑے اہتمام سے بجا لا کر رہتے وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن اور سنت کے احکام کی پابندی کرتے لیکن وہ عالی قسم کے متعصب مسلمان نہ تھے وہ دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے غیر مسلموں کو اہم اور اعلیٰ عہدوں پر مامور کرتے یہی روش ان کے جانشینوں نے اختیار کی۔ ان کے مزاج کی بے بنیاد اچھائیوں اور انسانیت نوازی کی وہ تمام لوگ قدر کرتے جن کا واسطہ ان سے پڑتا وہ ان کی مدح کرنے کے ساتھ ان سے محبت کرتے اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان کے اور دوسرے حکمرانوں اور رہنماؤں کی سیرت کی سطح بہت ہی نیچی ہو گئی تھی تو اس برے زمانہ میں نظام الملک کا اچھا کردار نمایاں ہو کر ابھرا (ص ۳۰۴)

ان کی اہم تصنیف روح اقبال ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تو اس سے ہند و پاک کے تمام ارباب ذوق ان کی ادبی بالغ نظری سے متاثر ہوئے۔ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری مرحوم نے اس کی اشاعت پر لکھا کہ اس سے بہتر کتاب تو پاکستان میں بھی نہیں لکھی گئی۔ ان کو اقبال سے عشق تھا اسی لیے اس کے لکھنے میں ان کے ہر صفحہ پر سرشارانہ کیفیت دکھائی دیتی ہے شروع میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین شاید یہ کہہ اٹھے ہونگے کہ اس کی ہر سطر پر ایک کرشمۂ حسن ہے جس کی طرف دامن دل کھنچ کر رہ جاتا ہے انھوں نے اس کی ابتدا ہی ایسے انداز میں کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت ان پر اقبال کی محبت اور عقیدت کا نشہ چھایا ہوا ہے

اقبال کی طبیعت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی اور اس کی شخصیت میں ایسے متضاد عناصر جمع ہوگئے تھے جو عام طور پر کسی ایک شخص کی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس کے ذہن اور اس کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی۔ اس کے جمال پرست اور عشق پرور دل نے اپنے تخیل کی گل کاریوں سے اپنی ایک الگ دنیا آباد کرلی تھی۔ اس دنیا کی خیالی تصویروں میں اس نے اپنے جذبات کے موئے قلم سے ایسی رنگا رنگی اور رعنائی پیدا کیا کہ انسانی نظر جب اس تصویر پر پڑتی ہے تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے۔ اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفانی صداقت پسند اور نظم آفرین روح تھی جو جذبۂ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ شاعر بھی تھا اور حکیم نکتہ داں بھی۔ اس کے ہاں درد و سوز بھی ہے اور رندی و مستی بھی، نصیحتیں بھی ہیں، اور دین و تمدن کی تعلیم بھی، عقل و عشق کی ابدی کش مکش کا بیان بھی ہے اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی نقاشی بھی"

یہ اور نقادوں کی طرح محض عبارت آرائی نہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اقبال کے آرٹ، شاعرانہ مسلک، تخیلی پیکر، محاکات، خودی، مقاصد آفرینی، انسانی فضیلت، تاریخی استقراء، انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد، جماعت، مملکت، تمدن، نظام معیشت، تقدیر، جبر و اختیار، عشق اور موت کے تخیلات کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا ہے۔ اور جس انداز میں انھوں نے اقبال کے ان تفکرات کو سمجھ کر سمجھایا، وہ اقبال شناسی میں عرصۂ دراز تک مدد دیتا رہیگا۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ لکھا جائیگا، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اقبال کو پہلی دفعہ جس طرح سمجھا

کوشش کی [illegible] اور بازگشت بعد میں ساٹھ دی غالب کو سمجھانے میں اولیت
جو درجہ حالی کی یادگار غالب کو ہے وہی اقبال کو سمجھانے میں روح اقبال کا ہے
روح اقبال کے بعد ان کی مشہور کتاب اردو غزل منظر عام پر [illegible] میں
آئی تو اس سے لوگ اردو شعر و شاعری میں ان کی گہری بصیرت سے متاثر ہوئے
اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب کے حلقہ میں اردو غزل
کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی۔ انھوں نے اردو غزل کو چار سو صفحوں سے زیادہ میں
سمجھایا ہے۔ اور جس دیدہ وری اور عرق ریزی سے اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش
کی ہے وہ ان نقادوں کے لیے ایک درس ہے جو چھوٹے چھوٹے مقالات لکھ کر اردو
کے نقادوں کی صف اول میں جگہ پانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ اس کو مٹانے والا۔ غزل گو شاعر جب زندگی
کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے ناموجود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائے گی
وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی
آرزوؤں کی صورت گری کریگا۔ وہ حسن آفرینی بھی کریگا اور قدر آفرینی بھی لیکن
یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا۔ جذباتی نتیجہ کلام
میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی
چاہیے جس میں اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہو، بغیر اس کے کلام میں
تاثیر اور دل کشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں
پنہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم یہ
یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آہنگی کے بغیر

نہیں پیدا ہو سکے اور یہ دونوں اجزا غزل کی جان ہیں ان ہی سے غزل کی
جلوہ گری ہوتی ہے۔ (ادب کی بنیادی قدریں، اردو غزل، ص ۲۰۔ ۲۰۴)

ڈاکٹر صاحب غزل کو سمجھنے کے لیے گویا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں اور جس صاف
ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں یہ تحریر قلمبند ہوئی ہے اسی کی شان پوری اردو غزل
میں جلوہ گر ہے جس کا اظہار پیرایۂ انداز ارباب ذوق کے ادبی کام و دہن کے
لطف و لذت کا باعث بنا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب حسرت موہانی کی غزل گوئی سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے
اپنی یہ کتاب ان ہی کے نام سے معنون کی۔ ان کی ایک مستقل کتاب "حسرت کی شاعری"
کے نام سے بھی شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنا خراج عقیدت ناقدانہ
انداز میں پیش کیا ہے۔ حسرت کی غزلوں کے استفہامیہ اشعار اور پیرایہ کے استعمال سے
وہ اپنے کلام میں جو تاثیر اور حسن پیدا کرتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر
پسند تھا۔

وہ اردو میں لکھنے کے ساتھ انگریزی میں بھی برابر کچھ لکھتے رہے۔ اسلامک کلچر
حیدرآباد میں ان کے جو مضامین نکلے وہ [illegible] میں کتاب کی صورت میں Glimpses of
Medieval Indian culture کے نام سے شائع ہوئی جس کے اندر طویل ابواب
میں یہ عنوانات ہیں: اسلام اور بھگتی کا عقیدہ، ہندوستان میں تصوف، تعلیمی نظام، اردو
زبان کا ارتقا، معاشرتی اور اقتصادی حالات، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں۔ ان
موضوعات سے جن کو بھی دلچسپی ہے وہ ان کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔
وہ جامعہ عثمانیہ سے منتقل ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس کے پرو وائس چانسلر

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] ہو گیا ہے، بڑھاپا غالب ہوتی رہی، میری کچھ تصنیف

[illegible] ہو چکی تھیں، میں ان سے ملنے جاتا تو میری تصانیف کو اپنی الماری میں

دکھاتے، اور جب وقت گھر میں جو میٹھی چیز ہوتی اس سے تواضع کرتے، ان کو رسا دل بہت

رغوب تھا، گھر میں جو کچھ ہوتی تو اصرار کر کے کھلاتے۔

وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی نامزد ہوئے تو ان سے تعلقات اور بھی

قریب تر ہو گئے، [illegible] میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

کے ساتھ وہ بھی دارالمصنفین تشریف لائے، اسی کے بعد انھوں نے اپنی کتاب یادوں کی دنیا

لکھی تھی جو ہم کو اور جناب شاہ معین الدین کو اس قدر پسند آئی کہ دارالمصنفین کے سلسلۂ کتب

میں تو نہیں لیکن اس کی طباعت معارف میں کرا لی، ان کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی،

یہ گویا ان کی خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں ان کے بیتے ہوئے زمانے کی یادیں

ہیں، ان کی قوت ارادی نے ان کے حافظہ کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو یہ سب کے سب

لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوئے جن میں جذبہ کی رنگ آمیزی اور خیالی پیکروں کی تحسین کے

ساتھ ان کے آبا و اجداد، خاندان، ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ، دیارِ فرنگ، دیار علیگ

علی گڑھ اور بہت سی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا بہت ہی دلچسپ مرقع ہے، وہ سات

سال تک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے، اسلیے یونیورسٹی کیلئے

دل میں بڑا درد اور نرم گوشہ رکھتے تھے، اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار

کے رہنے اور نہ رہنے کے مسئلہ پر بڑی دلسوزی سے لکھتے ہیں۔

"جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم سے نا آشنا ہیں یا جن کی نگاہ میں اس کی کوئی

اہمیت نہیں ہے وہ اسے قومی وحدت کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں، اسلامی کردار

سے مراد یہ ہے کہ مسلمان طلبہ میں دینی احساس اسلامی شعائر کا احترام ملی حمیت
کے جذبہ کے ساتھ ساتھ بیدار ہو، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں
یا انتظامی، مسلمانوں کی نمایاں اکثریت رہے، حکومت کے نامزد ارکان کی تعداد
کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کیے جائیں جو مسلمانوں
کی تہذیب اور روایات سے واقف ہوں اور یونیورسٹی کے سچے ہمدرد ہوں،
یہ باتیں نہ رجعت پسندی ہیں اور نہ فرقہ واریت اور نہ قومی وحدت اور
سیکولرزم کے خلاف بلکہ اقلیتوں کا تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو حکومت
سلب نہیں کر سکتی بجز ایسی صورت کے کہ وہ ناانصافی پر اتر آئے (ص ۳۵۳)"
ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی
ہے، اور وہ مسلم یونیورسٹی کیا مسلمانوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت کے ترجمان اپنی
ادبی تحریروں میں بھی بنے رہے۔ میں پاکستان گیا ہوا تھا تو اس کتاب کا ذکر وہاں
کے علمی حلقہ میں برابر آیا، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو غزل کا حق طباعت
دارالمصنفین کو دیا جو یہاں سے شائع ہو کر فروخت ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر یوسف صاحب کو اقبال کے ساتھ غالب سے بھی عشق تھا، انھوں
نے مجھ سے فرمایا کہ وہ یورپ تعلیم کے لیے گئے تو اپنے ساتھ صرف تین کتابیں لے گئے،
کلام مجید، کلام اقبال کا مجموعہ اور دیوان غالب، اسی لیے انھوں نے ۱۹۶۸ء میں
غالب اور آہنگ غالب لکھی، اردو غزل میں غالب پر جو باتیں اختصار سے لکھی تھیں
اسی کو پھیلا کر اس کتاب میں لکھیں جو ۳۰۴ صفحے پر مشتمل ہے، غالب پر انھوں نے جو
کچھ لکھا ہے اس پر میں نے اپنی کتاب غالب مدح و قدح کی روشنی میں بڑا لمبا تبصرہ کیا

ہے اور خوش تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے مگر افسوس یہ
کتاب اب شائع ہوئی جب ان کی رحلت ہو چکی ہے' یہ حصہ ان کی نظر سے نہیں گذرا تو
کتاب کی طباعت سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی' اس موقع پر جتنے مقالات لکھے اور پڑھے گئے
وہ ان ہی کی نگرانی میں بین الاقوامی غالب سیمینار کے نام سے شائع ہوئے۔

اس اثنا میں جب دہلی جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا' اور وہ اپنے
یہاں کھانا کھلائے بغیر رخصت نہ ہونے دیتے'

۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن حکومت ہند کی طرف سے منایا گیا تو
اس میں مجھ کو بھی شرکت کی دعوت تھی' اس کے مختلف اجلاس میں ڈاکٹر صاحب خاص
طور پر مجھ کو بلا کر اپنے پاس بٹھاتے' جناب علی یاور جنگ گورنر بمبئی کی نگرانی میں اس
جشن کی ساری کارروائیاں انجام پا رہی تھیں' اس موقع پر امیر خسرو سے متعلق
بہت کچھ ناروا باتیں کہی جا رہی تھیں' مجھ کو خسرو سے عشق ہے' ہر ناروا بات کا جواب
دیتا رہا' اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری بڑی ہمت افزائی کی' جب
امیر خسرو سے متعلق کوئی ناخوشگوار بات کہی جاتی تو وہ مجھ سے چپکے سے کہتے "اٹھو اور
جواب دو" میرا جواب سن کر میری پیٹھ پر تھپکی دیتے'

اسی موقع پر راشٹرپتی بھون میں حکومت ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا' ڈاکٹر
صاحب اصرار کر کے مجھ کو اپنے ساتھ وہاں لے گئے' ان دنوں دارالمصنفین کا کچھ مسئلہ
ایسا تھا جس کے متعلق ایک مسلمان وزیر حکومت ہند سے گفتگو کرنے والا تھا' مگر ڈاکٹر
صاحب رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کی حیثیت سے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان سے گفتگو

کی بات تھی کہ وزیر صاحب بھی آپ ہی میں تقریب ہونے لگے [illegible]
جو کہا گیا درست ہے اگر ان سے اس مسئلہ پر رسمی گفتگو ہی کر لی جائے، یہ سنا تو بیٹا ہاتھ
پکڑ کر بولے نہ جاؤ، ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہونچ جائے گا پھر ان کے پاس
جانے سے روک لیا"

۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب حافظ اور اقبال شائع ہوئی، جس
کے نام ہی سے ارباب ذوق چونکے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن
نکلا تو اس میں حافظ شیرازی کے متعلق لکھا تھا

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چون مریدان حسن دارد حشیش
بے نیاز از محفل حافظ گذر — الحذر از گوسفندان الحذر

اسرار خودی شائع ہوئی تو حافظ سے متعلق اشعار کی بڑی مخالفت ہوئی جس
سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں ان اشعا
کو نکال دیا، عام طور سے یہی خیال ہے کہ اقبال حافظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن
ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنی یہ کتاب لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔
وہ لکھتے ہیں کہ حافظ پر کڑی تنقید کرنے کے باوجود اقبال اس کے حسن ادا اور لطافت
بیان کا قائل تھا اور شعوری طور پر کوشش کرتا تھا کہ اپنی فارسی غزلوں میں اس کا
رنگ و آہنگ پیدا کرے اور اس کے رموز و علائم کو برتے۔ اس نے حافظ کے
استعاروں اور ترکیبوں کو اپنے فکر و فن میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے صرف ک

پوری کوشش کی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔" (ص ۱۴۰-۱۴۱)

دونوں کے کچھ اختلافات بھی دکھائے ہیں۔ مثلاً حافظؔ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف اقبالؔ کی اجتماعی مقصدیت کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کو مجبور نہ مانے، حافظؔ کے اشعار میں خودی کا مروجہ تصور کارفرما ہے، اقبالؔ اپنے تصور میں منفرد ہیں۔ اسی قسم کے اور اختلافات دکھا کر ڈاکٹر صاحب آخر میں لکھتے ہیں کہ

میں پھر اپنے اس خیال کو دہراتا ہوں کہ فارسی زبان کا کوئی شاعر طرز و اسلوب اور پیرایہ بیان میں حافظؔ سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ اقبالؔ ہے، اس کے ماسوا دوسرا کوئی شاعر حافظؔ کا تتبع نہ کر سکا۔ اقبالؔ کو اس ضمن میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ میں اسے حافظؔ کے روحانی فیض اور خود اس کی اپنی ریاضت کا ثمر خیال کرتا ہوں۔" (ص ۱۴۳)

یہ دعویٰ ایسا ہے جو متفق علیہ نہیں کہا جا سکتا۔ روحِ اقبالؔ میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا اس سے کسی کو اختلاف نہیں رہا، لیکن اس کتاب میں بہت سی مختلف فیہ باتیں آگئی ہیں، جن کی توضیح آئندہ ہی کی بحث و تمحیص سے ہو سکے گی، لیکن افسوس اس بحث میں خود ڈاکٹر صاحب کا کوئی حصہ نہ ہوگا، مگر وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے لکھ گئے ہیں، ہمارے نقاد اور ادیب اس کو پڑھتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے رہیں گے۔

۱۹۷۷ء میں اقبالؔ کا جشن منایا گیا، تو دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں میری بھی شرکت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس جشن کا اصلی روحِ رواں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس جشن کے منتظمین سے کچھ شاکی نظر آئے۔ اسی موقع پر غالب اکیڈمی میں ان

[illegible] ہوئے ایک کا عنوان تھا [illegible] اقبال [illegible]

"حافظ اور اقبال" ایک کی صدارت جرمنی کی مشہور مستشرق خاتون [illegible] شمیل نے کی تھی۔ جب
ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ختم ہوا تو اینی شمیل نے بہت پرزور تقریر میں ان کے لیکچر کی تعریف
کی۔ اتفاق سے اس کے بعد وہ گیارہ بجے ان میں ایک ہی میز پر لوگوں کو انہیں کے ساتھ بیٹھنے
کا موقع ملا گفتگو شروع ہوئی تو وہ بولیں کہ ڈاکٹر صاحب کچھ اس لب و لہجہ میں اپنا
مقالہ پڑھ رہے تھے کہ وہ ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکیں۔ ان کی یہ گفتگو سن کر مجھ کو ہنسی آ گئی
ڈاکٹر صاحب سے یہ گفتگو دہرائی تو وہ بھی ہنس کر کہنے لگے کہ ان لوگوں میں ایسے بھی قصے ہوا
کرتا ہے"

ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ "حافظ اور اقبال" جناب آنند نرائن ملا کی صدارت
میں پڑھا تھا۔ جب ان کا مقالہ ختم ہوا تو آنند نرائن ملا صاحب نے اپنے مختصر تبصرہ
میں کہا کہ "حافظ اور اقبال میں کوئی مماثلت نہیں" اس مختصر رائے سے حاضرین پر سناٹا
چھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہ سن کر خاموش رہے۔ یہ موضوع کچھ ایسا ہی متنازعہ فیہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پاکستان کے ناشر چھاپ کر فائدے اٹھا رہے تھے۔ ان
کی خواہش تھی کہ اقبال اکیڈمی لاہور اس کا حق طباعت ان سے خرید لے۔ ڈاکٹر
معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اقبال کے جشن میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ میں نے
ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ روح اقبال اور حافظ و اقبال کو اپنی کمیٹی کے
سامنے پیش کر کے ان کے حق طباعت کا معاوضہ ڈاکٹر صاحب کو دلائیں گے۔
مگر یہ اب تک انجام نہیں پا سکا ہے۔

[illegible] انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامیہ میں میری دوبارہ

رکنیت کا انتخاب تھا تو ڈاکٹر صاحب نے محض اپنی محبت میں مجھ کو زیاد
ووٹ دلائے ان کی اس محبت کی قدر میرے دل میں ہمیشہ باقی رہے گی۔
میں اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ دہلی میں تھا، وہاں پہونچا تو وہ اپنی وضعداری
میں اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، انھوں نے اپنے گھر کے ایک وسیع
کمرہ میں اپنے ذوق کی بہت سی کتابیں کئی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں، میں نے ان کا جائزہ
لینا شروع کیا، تو مجھ کو ان میں سے کئی کتابیں پسند آئیں جن میں مصر کا ایک بہت
ہی خوش خط مطبوعہ کلام پاک تھا، ایک لمبی تقطیع کا بھی کلام پاک تھا جو ایران میں
بہت ہی عمدہ کتابت کے ساتھ طبع ہوا، اس کو میں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم
بولے کہ شہنشاہ ایران نے اس کے کچھ نسخے ہندوستان بھیجے تھے، ان میں سے ایک ان
کو بھی نذر کیا گیا تھا، تاریخ و ادب کی کچھ اور کتابیں تھیں جو مجھ کو پسند آئیں، میں نے
ان سے عرض کیا کہ ان میں سے آپ کچھ دار المصنفین کو فروخت کر دیں، فوراً بولے جو
کتابیں پسند آئیں لے جاؤ، میری طرف سے دار المصنفین کو نذر ہیں، میں نے عرض کیا
کہ آپ قیمت نہ لیں گے تو میں ان کو دار المصنفین کے لیے لے جانا پسند نہ کروں گا، پھر میرا
سے کلام پاک کے یہ دونوں نسخے اور کچھ کتابیں میرے ساتھ کر دیں، کلام پاک کے یہ
دونوں نسخے یہاں کے کتب خانے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں، میں نے یہاں سے
ہی خط لکھ کر ان کی قیمت قبول کرنے کے لیے عرض کیا، مگر انھوں نے لکھا کہ اس
اصرار سے ان کو تکلیف ہو رہی ہے، یہ بھی مجھ کو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں انھوں
نے جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کو دے دی تھیں، انھوں نے ان کتابوں کے ساتھ اپنی دو
انگریزی تصانیف — SELECTED DOCUMENTS FROM
THE ALIGARH ARCHIVES

[illegible] Two Studies in Early Mughal History [illegible]

میں زیادہ تر سر سید احمد کے انگریزی، فارسی اور اردو میں خطوط ہیں، ان ہی کے
ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو انگریزوں یا دوسرے معاصرین نے انکو لکھے، علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کی تاریخ لکھنے میں اس کتاب سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے، یہ [illegible] میں ایشیا
پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی، دوسری کتاب ظہیر الدین محمد بابر پر دو لکچر ہیں، بابر
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا بہت ہی دل آویز اور رعنا حکمراں گذرا ہے، ڈاکٹر صاحب
مرحوم کے قلم سے اس کی شخصیت اور بھی زیادہ نکھر گئی ہے،

اسی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے غالب کی منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی
میں کیا ہے۔ جو چھپ رہا ہے، اس کے کچھ پروف بھی دکھائے اور کہا کہ بعض انگریزوں
نے اس ترجمہ کو بہت پسند کیا ہے، خدا کرے ان کا یہ ترجمہ مقبول ہو، ان کی
ایک کتاب "کاروان فکر" کے نام سے بھی شائع ہوئی، جس میں اخلاقی قدریں، علم اور
زندگی، تاریخ میں جبر و اختیار کی چھاؤں، اور ادبی قدریں کے عنوانات ہیں، میرا
خیال ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور اس حصہ کے شب و روز کے
زیادہ تر لمحات صرف لکھنے پڑھنے میں گذارے، نظام الدین ویسٹ کے مکان میں
ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے رہنے کے لئے انتخاب کر رکھا تھا، اسی میں علم و ادب کے سارے
جلوے ان کی نظروں کے سامنے سمٹ کر آتے رہے، جن کو وہ اپنے قلم کی رعنائی سے کاغذ
کے صفحات پر منتقل کرتے رہے، وہ کچھ دنوں شملہ میں انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ
اسٹڈی میں رہے، پھر دہلی چلے آئے یہیں آخر وقت تک رہے، یہاں رہ کر علم و ادب
کا مینارۂ رعنا رہ کر سرشار اور محظوظ کرتے رہے،

ان کی اردو غزلوں اور یادوں کی دنیا دارالمصنفین کے دارالاشاعت کی
یں ہیں گذشتہ جنوری میں ان کی رائلٹی کی رقم بھیجی جس کے شکریہ کا خط آیا یہی
ا آخری خط میرے نام تھا یہاں سے ان کی کتابوں کی رائلٹی بھیجی جاتی تو اس کو
ل کرتے وقت ایسا محسوس کرتے کہ گویا دارالمصنفین کی طرف سے ان کو رقم
ہی ہے اس کو وہ اپنا کوئی حق نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی شرافت اخلاق تھی، ان کی
د ری، ان کے رکھ رکھاؤ کا طریقہ، ان کا استغنا، اور شہرت سے بے نیازی
ایسی تھی کہ اس کی مثالیں بہت کم لوگوں میں ملیں گی، دہلی میں رہتے تھے، ہر قسم کے
ندانی ذرائع تھے، چاہتے تو اپنے لیے حکومت ہی سے بہت کچھ حاصل کرلیتے، خصوصاً
ب وہاں اس کی دوڑ لگی ہوئی ہے، کچھ ایسے مصنف بھی ہیں، جو ایک کتاب لکھتے ہیں، اس
ارسم اجرا یا رونمائی کراتے ہیں، اور ہر قسم کے فوائد اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے
یں مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کے وقار کو کسی موقع پر جھکنے نہیں دیا، وقار خود
ان کے سامنے آکر جھکا، ان کو پانچ ہزار کا ایوارڈ بھی ملا، مگر ان کے بیش بہا علم کی
یمت لگائی نہیں جا سکتی، ان کو پدم وی بھوشن کا اعزاز بھی ملا مگر خود اس اعزاز
کو ان سے عزت حاصل ہوئی۔

ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقہ میں بڑا ماتم ہوگا، آج کل خاص خاص
طقے ایسے بنے ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کے بجائے صرف ایک
دو سال رو کر اپنے چمن کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے، ایسے حلقہ کی نرگس اپنی بے
نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین کی دیدہ وری کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکی
اس لیے اُن کا یہاں ماتم نہ ہوا تو تعجب کرنے کی بات نہیں، مگر جو اپنی نظروں میں

باب التقریظ والانتقاد

فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

از

مولانا حبیب الرحمن اعظمی مئو

مجھے مخطوطات سے بہت شغف ہے، ایک دن اتفاق سے دارالمصنفین جانا ہوا تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی فہرست مخطوطات عربیہ کتب خانہ میں نظر پڑ گئی، میں نے اس کو بہت شوق سے پڑھا، میں صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی مہربانی سے یہ موقع نصیب ہوا، میں نے فہرست پڑھی تو میرا جی چاہا کہ اس پر تبصرہ کی خدمت میں بجا انجام دوں، تاکہ جس مقصد کے لئے فہرست کے مرتب قاضی عبد النبی کوکب صاحب نے دارالمصنفین کو پیشکش کی ہے وہ پورا ہو جائے،

قاضی صاحب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے اور وہ اس کے لیے مستحق مبارکباد ہیں، انھوں نے فہرست نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، اہل علم کا فرض ہے کہ ان کی وسعت نظر کے لیے مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ اس کام میں ان کا تعاون بھی کریں۔

پھر میری مطالعہ کے بعد کوکب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اس وقت جو باتیں ذہن میں آئی ہیں ان کو عرض کرتا ہوں،

کوکب صاحب نے ص۲۷ پر عنوان غرائب القرآن کے تحت دو قلمی کتابوں کا

تعارف کرایا ہے اور دونوں کا تعارف کراتے ہوئے یہ بات بالکل عیاں ہو کر

تالیفات سے جرمن مستشرق فلوگل کا تقدم قرآن کے اشاریہ ساز کی حیثیت

ثابت نہیں رہتا

مگر ان کا یہ فرمانا کہ قرآن کی اشاریہ سازی کی طرف توجہ کا سرا

واضح طور پر گیارہویں صدی ہجری میں پہونچتا ہے تو اس کو لکھنے سے پیشتر کوکب ما

کو سراغ رسانی کے لیے کچھ اور رنگ ودو کرنے کی ضرورت تھی

قدیم مطبوعہ کتابوں میں ہماری نظر سے ایک اور ہندوستانی عالم مصطفیٰ

سید کی قابل قدر کتاب گذری ہے، جس کا نام نجوم الفرقان لتخریج آیات القرآن

ہے کتاب کی زبان فارسی ہے، اور مصنف اورنگ زیب عالمگیر کے لڑکے سلطان

اعظم شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھا سال تصنیف سنہ [illegible] جلوس عالمگیر ہے

سنہ ہجری کی نشاندہی علامات نجوم الفرقان سے ہوتی ہے، جس سے [illegible] نکلتے ہیں،

مصنف نے الفاظ قرآن کو ان کی موجودہ شکل کے ساتھ حروف تہجی کی ترتیب

پر مرتب کر کے جس پارہ کے جس رکوع میں وہ لفظ پایا جاتا ہے اس کی نشاندہی

اس طرح کی ہے کہ لفظ پاک زیر وزبر کے ساتھ لکھ کر پارے کا عدد ہندسوں میں

اور رکوع کا عدد حرفوں میں حروف ابجد کے حساب سے بتایا ہے، مثلاً آبائهمْ

۲۲ د یعنی یہ لفظ بائیسویں پارے کے چوتھے رکوع میں ہے، یا مثلاً أخطأنا ۱۶ ب

یعنی یہ لفظ سولہویں پارے کے دوسرے رکوع میں ہے کتاب مطبع محمدی لکھنؤ

میں مجتہد شیعہ سید حسین کے حکم سے چھپی ہے،

اس کتاب کا ملاحظہ کیا ہو۔

ہرچند تالیف چند از سلفا نیز بنظر درآمدہ بود لیکن ہیچکدام از آنہا باوجود کثرت حجم کہ بدہ دوازدہ ہزار بیت می رسید در اصل تحصیل مطلب کافی و مغنی نبود (ص ۳۰)	باوجودیکہ سلف کی بھی چند کتابیں نظر سے گزری تھیں مگر ان میں سے کوئی بھی ضخامت زیادہ ہونے (یعنی دس بارہ ہزار بیت کی کتاب ہونے کے) باوجود اصل مطلب کی تحصیل کے لیے کافی اور دوسری کتاب سے بے نیاز کردینے والی نہ تھی'

اس بیان میں سلف کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلف کی نظر سے بہت پہلے کے علماء کی تالیفات اس موضوع پر گزر چکی تھیں اور یہ کہ فہرست مفصل میں جن دو کتابوں کا ذکر ہے مؤلف اس کو مراد نہیں لے رہا ہے' اس لیے کہ جس صدی میں وہ خود رہا ہو اس صدی کے علماء کو سلف سے تعبیر نہیں کرسکتا' دوسرے اس لیے بھی یہ کتابیں مراد نہیں ہوسکتیں کہ یہ دونوں ضخامت میں اس کی کتاب سے چہار گونہ بڑی نہیں ہیں' اس کی مطبوعہ کتاب ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے' اور ان دونوں کے صفحات چار سو سے کچھ اوپر ہیں' یعنی دو گنے سے کچھ زیادہ' برخلاف ان کتابوں کے جن کی طرف مؤلف اشارہ کر رہا ہے' وہ چار گونے کے قریب بڑی ہیں' مولف خود اپنی کتاب کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ تین ہزار اور کچھ کسر پر مشتمل ہے' اور اس کے مقابل سلف کی ہر کتاب دس بارہ ہزار بیت کی بتاتا ہے' اس تطویل سے میرا مقصد یہ ہے کہ مولف کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی اشاریہ سازی کی طرف مسلمان فضلاء گیارہویں صدی سے بھی پہلے متوجہ ہو چکے تھے' یعنی جرمن مستشرق

[illegible] نے سمرقندی نے [illegible] پر سب بلکہ سورتوں پر [illegible]

کا تعارف کراتے ہوئے کوکب صاحب ص۲۰۹ پر لکھتے ہیں کہ [illegible]

تک ہے' اس بیان میں مؤلف نے کشف الظنون کی پیروی میں غلطی کی ہے کیونکہ یہ ہے

کہ سورۂ انفال کے اول سے الناس تک ہے' اس لیے کہ اس کے بغیر حاشیہ دو حصوں

میں مکمل نہیں ہو سکتا' جس کا حاجی خلیفہ نے دعویٰ کیا ہے' کشف الظنون میں غلطی سے

الانفال کے بجائے البناء چھپ گیا ہے'

لیکن اس سے پہلے خود مؤلف سے ایک بھول ہوئی ہے کہ انھوں نے الاعراف

کے بجائے الانفال لکھ دیا ہے' اس تصحیح کی تائید خود مؤلف کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے

کہ "اس تالیف کا ایک نسخہ سورۂ اعراف کے آخر تک دمشق کے دار الکتب الظاہریہ

میں بھی موجود ہے' یعنی پہلا حصہ جو اول فاتحہ سے آخر اعراف تک ہے' وہ دمشق میں

بھی ہے'

ص۲۱۰ پر ملا صادق حلوائی کے بارے میں فہرست نگار نے لکھا ہے کہ "راشد

صاحب نے اپنے اس سارے بیان کے لیے کسی مآخذ کا حوالہ نہیں دیا" اس سلسلہ میں

بھی یہ گزارش کرتا ہے کہ نواب علی حسن خاں نے تذکرہ صبح گلشن میں مولانا محمد صادق

سمرقندی کا ذکر کیا ہے' اور یہ لکھا ہے کہ وہ شمس الائمہ حلوائی کی نسل سے تھے اور مولانا

اعصام جندی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے' وہ ان علماء اعلام میں سے

ہیں' جن کے مرتبہ سے شاعری فروتر چیز ہے' پہلے وطن سے زیارت حرمین کے لیے کمر ہمت

باندھی اور یہ سعادت حاصل کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور [illegible] بیرم

خان سپہ سالار کی حمایت سے مسند تدریس دا فادہ کو زینت بخشی' دوسری بار

وزیارت کا شرف حاصل ہوا اور حج و زیارت سے [illegible] واپس [illegible] کے بعد مرزا
مرزا محمد حکیم کی تعلیم پر مامور ہوئے بہت مقبولیت حاصل ہوئی حاضر باشوں دوسروں سے
بہت آگے بڑھ گئے، آخر میں ہندوستان سے کابل گئے اور مرزا حکیم کی محفل کے صدر
مجلس ہو گئے اور وہاں اتنا رسوخ بڑھا کہ مرزا کے تمام مہمات کے حل و عقد کی
باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، عمر کے آخر میں سمرقند چلے گئے اور وہاں سے سفر
آخرت اختیار کیا، اس کے بعد ان کے چند منتخب اشعار ذکر کیے ہیں جن میں
سے ایک شعر یہ ہے؎

چو خورشید از سفر اے ماہ سیما آمدی   خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی

اس حوالہ سے یہ معلوم ہوا کہ ملا صادق کی وفات سمرقند میں ہوئی، شاید
اسی لیے نزہۃ الخواطر میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ص۱۱۲ پر بحرق حضرمی کی شرح آیۃ الکرسی وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، بحرق کے
تعارف کے باب میں یہ اضافہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا ذکر سخاوی نے بھی
الضوء اللامع میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ بحرق نے ان سے بھی علم حاصل کیا ہے، شاعری
سے بہت دلچسپی تھی، عامر بن عبدالوہاب کی مدح میں انھوں نے قصیدہ لکھا ہے،
شذرات الذہب سے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کب آئے
تھے، ابن العماد ناقل ہے کہ وہ امیر مرجان بن عبداللہ کی وفات کے بعد ہندوستان
آئے اور مرجان کا سال وفات خود ابن العماد نے [illegible] بتایا ہے، یعنی وہ اپنی
وفات سے صرف اٹھارہ سال پہلے اور سخاوی کی وفات کے ۲۵ برس بعد
ہندوستان [illegible] اسی لیے الضوء اللامع میں ان کے ہندوستان آنے کا ذکر

ہے ۔ نیز ان کی تصنیفات کا ۱

فہرست نگار نے بحرق کے استاد کا نام عبداللہ فرمہ لکھا ہے، صحیح عبداللہ بالخرمہ یا عبداللہ ابی مخرمہ ہے

بحرق کی مطبوعہ کتابوں میں ذیل کی دو کتابوں کے ناموں کا اضافہ بھی ضروری ہے:

(۱) الحدیقۃ الانیقۃ فی شرح العروۃ الوثیقۃ، (۲) الحسام المسلول علی منتقصی اصحاب الرسول،

کوکب صاحب نے ان دونوں کے نام لکھے ہیں، مگر ان کے طبع ہونے کی شاید ان کو اطلاع نہیں ہے الحدیقۃ الانیقۃ کو سابق مفتی مصر علامہ حسنین محمد مخلوف نے ایڈٹ کرکے سنہ ۱۳۷۱ھ میں مطبعۃ المدنی (مصر) سے شائع کیا ہے، وہ عروہ اور حدیقہ دونوں کے بیحد مداح ہیں، دوسری کتاب بھی مفتی صاحب ہی نے ۱۳۷۶ھ میں شائع کی ہے، یہ باطنی فرقہ کے رد میں ہے، اس کے بارے میں مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بحرق نے اس میں ایک محقق عالم کے شایان شان اسلام کی طرف سے مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے،

منا پر علیا و ابا طلحۃ والزبیر کے بجائے علیا و طلحۃ والزبیر صحیح ہے، بتانا چاہئے تھا کہ یہ کتابت کی غلطی یا مؤلف کا سہو ہے،

ص۲۲ پر جواہر الاصول کو تقی الدین فاسی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور ان کا نام محمد بن احمد بن علی بتایا ہے فہرست نگار نے تمام تر خدا بخش لائبریری کے فہرست نگار کی پیروی کی ہے، معلوم نہیں مصنف کا نام محمد بن احمد بن علی کس طرح لکھ دیا گیا جبکہ جواہر الاصول کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے، قال الجامع الجانی تدارکہ اللہ تعالیٰ

---

۱ مطبوعہ میں یہی ارکم چھپا ہے، حالانکہ تدارکہ ہے،

بلطفه الخفی ابو الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی اعاذہ اللہ تعالیٰ من القلب القاسی؛

دوسرا تضاد یہ ہے کہ مصنف نے تو خود اپنی کنیت ابو الفیض لکھی ہے، مگر فہرست نگاروں نے معلوم نہیں کہاں سے ابو الطیب لکھ دیا، حقیقت یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری کے فہرست نگار سے چوک ہوئی ہے، اس نے فارسی کے بجائے بعض نسخوں میں فاسی دیکھا، اور محمد بن احمد بن علی تقی الدین فاسی، معاصر حافظ ابن حجر کو ایک بلند پایہ محدث پایا، تو یہ خیال جا لیا کہ جواہر الاصول کے مصنف وہی ہیں، اور محمد بن محمد کی طرف یا تو اس نے دھیان نہیں دیا یا یہ سمجھا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، اور چونکہ فاسی کی کنیت ابو الطیب ہے، اس لیے جواہر کے مصنف کی کنیت ابو الطیب لکھ دی، مانچسٹر کا فہرست نگار زیادہ ہوشیار اور دیدہ ور معلوم ہوتا ہے، اسی لیے اس نے یہ اقرار کر لیا کہ ہم کو مولف کا سراغ نہیں مل سکا۔

تقی الدین فاسی حافظ ابن حجر کے گہرے دوست بلکہ شاگرد بھی تھے، اور حافظ سخاوی اپنے استاذ کے اس دوست کے بہت بڑے واقفکار تھے، بلکہ روایت میں شاگرد بھی تھے، انھوں نے ان کا اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے، لیکن جواہر الاصول کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، انھوں نے ان کی ساری تصنیفات کے نام تو نہیں لکھے ہیں، لیکن یہ بتا دیا ہے کہ کس کس موضوع پر ان کی کتابیں ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ تو لکھا ہے کہ جو نام ہم نے لیے ہیں ان کے علاوہ اذکار، دعوات، اور مناسک پر بھی انھوں نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے، کہ اصول حدیث میں بھی ان کی کوئی کتاب ہے[1]

---

[1] دیکھیے مطبوعہ ۱۹۹۲ء، ور مخطوطہ دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)

[illegible] والصلاح حسن الاخلاق كثير التواضع ظاهر الفضل جليل القدر وحصل له في	نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۶	حمید شاہ بھی صاحب علم و صلاح تھے خوش اخلاق بڑے متواضع فضل و کمال میں نمایاں اور جلیل القدر تھے آخر عمر میں ان کو دنیاوی عزت و عظمت بھی حاصل ہو گئی تھی،

ان دونوں میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ مکہ مکرمہ میں نو برس مقیم رہے،
اور وہیں وفات پائی اور ان میں سب سے بڑی بات یہ مذکور ہے کہ وہ ابن علان
صدیقی کے پوتے محمد علی کے شیخ تھے، اور وہ سید محمد بن سید حمزہ حسینی شیخ الاسلام ونقیب
الاشراف دمشق کے استاذ تھے، تعجب ہے کہ ابن العماد نے ان کا سال وفات نہیں لکھا
شاید اس لیے کہ ان کی وفات سنہ ۱۰۰۰ھ کے بعد ہوئی ہے اور انھوں نے صرف سنہ ۱۰۰۰ھ
کے اندر وفات پانے والوں کا تذکرہ لکھا ہے،

شیخ حمید سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کی اجازت لی تھی اس کا ذکر
خود محدث دہلوی نے ثبت الشیخ عبدالحق المحدث الدہلوی میں کیا ہے، اس رسالہ کے آغاز
میں انھوں نے اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں،

"ثم الشیخ العالم العامل تذکرۃ السلف المتورعین وبقیۃ المشائخ المحدثین
مولانا الشیخ حمید الدین بن القاضی عبداللہ السندی"

پھر ہر ایک شیخ کا اجازت نامہ بھی نقل کیا ہے، یہ سب اجازت نامے ۹۹۵ھ کے
ہیں، صاحب نزہۃ نے اسی ثبت کے پیش نظر حمید الدین کے نام سے ان کا ذکر کیا ہے
شیخ حمید سے استفادہ کرنے والوں میں شیخ عبدالحق کا نام لینا اس کی دلیل ہے کہ
یہ بھی صاحب نزہۃ کے پیش نظر تھا، مگر شیخ عبدالحق نے زاد المتقین میں بھی ال

جہاں شیخ حمید کا نام لیا ہے، ان کو حمید الدین کے بجائے شیخ حمید یا شیخ حمید ہی لکھا ہے[1]۔

شیخ عبدالحق نے زادالمتقین میں لکھا ہے کہ یہ لوگ تین بھائی تھے، شیخ رحمۃ اللہ، شیخ حمید، اور شیخ صالح، ان کے والد بزرگوار قاضی عبداللہ سندھ سے چل کر کچھ دنوں احمد آباد میں شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے، پھر حرمین کی زیارت اور مدینہ منورہ میں توطن کی سعادت حاصل کی،

قاضی عبداللہ کے ایک یار و مصاحب شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندی تھے، قاضی عبداللہ کی وفات کے بعد ان کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت انھیں کے ہاتھوں ہوئی،

اشتباہ دور کرنے کے لیے تذکرہ نویسوں پر لازم ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ یا شیخ حمید کی ولدیت بیان کرنے کے وقت "ابن قاضی عبداللہ" لکھیں، اور دوسرے عبداللہ کو ہمیشہ شیخ عبداللہ کے عنوان کے ساتھ لکھیں جیسا کہ شیخ عبدالحق کا معمول تھا،

قدیم تذکرہ نویسوں نے شیخ حمید کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا، فہرست مفصل اور پنجاب یونیورسٹی کے ہم ممنون احسان ہیں، کہ ان کی بدولت ہم کو شیخ حمید کی اس قیمتی تالیف کا علم ہوا،

اب تک ہم یہی جانتے تھے کہ شیخ رحمۃ اللہ ہی اس میدان کے شہسوار رہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ ایں خانہ تمام آفتاب است، اگرچہ اتنا فرق اب بھی

---

[1] دیکھئے زادالمتقین قلمی ص۱۵۳ و ص۱۵۴

تی ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ اور ان کی تصنیفات کا پایہ بہت بلند ہے ان کی کتاب
جمع المناسک و نفع الناسک کی قدر دانی و مدح سرائی اس سے بڑھ کر اور کیا
ہو سکتی ہے کہ شیخ علی متقی اس کے باب میں فرمایا کرتے تھے

این کتابیست کہ در مناسک حج بے عدیل و بے نظیر واقع شدہ است[1]

یہ ایسی کتاب ہے کہ مناسک حج میں بے مثل و بے ہمتا واقع ہوئی ہے

اور شیخ عبدالحق اس کی تائید یوں فرماتے ہیں

و در واقع آں کتاب از یں قبیل است کہ از ہمہ رسائل کہ دریں باب تصنیف یافتہ اند جامع تر و شامل تر است[2]

اور در حقیقت یہ کتاب اسی قبیل سے ہے کہ جتنے رسائل اس باب میں تصنیف ہوئے ہیں سب سے زیادہ حاوی ہے

غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ عبدالقادر
عیدروس نے النور السافر میں "جمع المناسک و نفع الناسک" کو عبداللہ بن سعد اللہ
کی تصنیف قرار دیا ہے نزہۃ الخواطر میں اسی کو جوں کا توں نقل کر دیا گیا ہے حالانکہ
یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں ترکی کے مطبع محمودیہ میں طبع ہو چکی ہے اس کے سرورق پر یہ
لکھا ہوا ہے

انتقل الی رحمۃ اللہ تعالی مولف ھذا الکتاب الشیخ رحمۃ اللہ فی الضحوۃ الکبری من یوم الجمعۃ ثامن عشر محرم الحرام سنۃ اربع وتسعین وتسعمأۃ

اس کتاب کے مولف شیخ رحمۃ اللہ نے بوقت ضحوۂ کبریٰ جمعہ کے دن ۱۸ محرم ۹۹۴ھ کو انتقال کیا اور معلا میں مدفون ہوئے

۱؎ زاد المتقین ص ۲۵ ۲؎ زاد المتقین ص ۲۵

اور ملا علی قاری جو خود شیخ عبد اللہ سندی کے شاگرد ہیں لباب المناسک کی شرح

میں لکھتے ہیں "انی لما رأیت لباب المناسک مختصر نفع المناسک للعالم العلامۃ و

الفاضل الفھامۃ مرشد السالکین ومفید الناسکین الشیخ رحمۃ اللہ السندی"

اور شرح لباب کا محشی لکھتا ہے کہ نفع المناسک اسم منسک الکبیر لناشرحہ اللہ

بمبئی میں اس کتاب کا ایک نسخہ جس کا سن کتابت ۱۰۰۹ھ میری نظر سے گذرا ہے

اس کے سر ورق پر المنسک الکبیر للشیخ رحمۃ اللہ السندی المکی استکتبہ الفقیر عبد الرحیم

اللاھوری ثم المدنی الحنفی ۱۰۰۹ھ لکھا ہوا ہے اس کتاب کے دیباچہ میں مولف نے لکھا ہے

وسمیتہ بجمع المناسک ونفع الناسک

شیخ علی متقی نے نفع المناسک کے مختصر لباب المناسک کا خلاصہ فارسی میں مجالۃ الناسک

کے نام سے لکھا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے

تعجب ہے کہ مولانا عبد الحئی رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ رحمۃ اللہ کی تصنیفات

میں لباب المناسک کا نام لیا اور جس کتاب کا یہ اختصار ہے اس کا نام ہی نہیں لیا

شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ عبد القادر عیدروس نے نفع المناسک کو شیخ عبد اللہ بن

سعد اللہ کی تصنیف بتا کر غلط فہمی پیدا کر دی ہے

شیخ رحمۃ اللہ کے ذکر میں ایک سہو یہ بھی ہوا ہے کہ ان کی وفات کی تاریخ ۸ محرم

(الثمان خلون من المحرم) بتائی گئی ہے حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ان کی وفات ۱۸ محرم کو

ہوئی ہے[2]

شیخ حمید کے تذکرہ کے ضمن میں ہم نے شیخ رحمۃ اللہ اور ان کی کتاب جمع المناسک

---

[1] ملاحظہ ہو دیکھئے نفع المناسک مطبوعہ کا سر ورق اور شذرات الذہب مصر

کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لیے بھی کیا کہ فہرست مفصل ص ۱۲۵ پر پنجاب یونیورسٹی کے مخطوط جمع المناسک کا تعارف کرایا گیا ہے!

کوکب صاحب نے معجم المطبوعات کے حوالہ سے جمع المناسک کے جس مطبوعہ ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، ہمارے پاس وہی اڈیشن ہے، مگر بروکلمن کے حوالہ سے یہ جو لکھا ہے کہ کتاب کی فقط تلخیص طبع ہوئی ہے، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ پوری کتاب طبع ہوئی ہے، ہاں اس کے ساتھ شیخ احمد کشنی نوری مرشد طریقہ نقشبندیہ نے اپنی ایک کتاب "جامع المناسک" بھی چھاپ دی ہے، جو "جمع المناسک" کی تلخیص ہی کی طرح ہے، شاید اسی کو دیکھ کر بروکلمن نے یہ لکھ دیا ہو کہ جمع المناسک کی صرف تلخیص طبع ہوئی ہے،

اس سلسلہ میں چند اور باتوں کی وضاحت بھی ضروری ہے،

پہلی بات یہ ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ نے اپنے والد کے ساتھ کاٹھیاواڑ کا سفر نہیں کیا تھا، بلکہ احمد آباد آئے تھے، اور قیام کیا تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ ترک وطن (سندھ) کا محرک صرف جذبۂ تحصیل علم نہ تھا، بلکہ بعض ملکی و سیاسی حالات کی بنا پر ان کے والد نے اپنے لڑکوں، اہل و عیال اور خدام کی ایک جماعت کثیر کے ساتھ زیارت مدینہ اور وہاں سکونت اختیار کرنے کے ارادہ سے سندھ کو خیر باد کہا تھا، اور احمد آباد پہنچ کر کچھ دنوں کے لیے مقیم ہو گئے تھے، اور شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کر لی تھی، پھر جب شیخ کی توجہ سے زادِ راہ کا انتظام ہو گیا تو منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے، اور حجاز مقدس پہنچ کر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، کچھ دنوں کے بعد شیخ رحمۃ اللہ کے والد بزرگوار قاضی عبد اللہ کا انتقال ہو گیا تو شیخ عبد اللہ نے شیخ رحمت اللہ اور ان

بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لے لی۔

شیخ رحمت اللہ کی نشو و نما مدینہ منورہ میں ہوئی، اور وہ سالہا سال وہیں درس و تدریس اور عبادت میں مشغول رہے تا آنکہ [illegible] میں بعض حوادث کی بنا پر مجبور ہو کر پھر ہندوستان کا رخ کیا اور احمد آباد آکر مقیم ہو گئے۔ آخر عمر میں بیمار ہوئے، بیماری ایسی تھی کہ حس و حرکت مفقود تھی، مگر اسی حالت میں مقامات مقدسہ کا عزم بالجزم کر کے احمد آباد سے روانہ ہوئے، مکہ معظمہ پہونچنے تک کی مہلت ملی، وہاں پہونچ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔

یہ پوری تفصیل اخبار الاخیار اور زاد المتقین میں موجود ہے۔ فہرست مفصل میں جو تفصیل دی گئی ہے اس بیان سے اس کی کئی باتوں کی وضاحت اور ترمیم ہو جاتی ہے۔

ترکی حکومت کے وظائف کا جو واقعہ کوکب صاحب نے لکھا ہے اس کے بارے میں شیخ عبدالحق یہ لکھتے ہیں کہ شیخ علی متقی ان کے تقویٰ کا خیال کر کے ان کے لئے وظیفہ لیتے ہی نہیں تھے[۵]

کوکب صاحب ص۹۷ پر لکھتے ہیں کہ "صرف ملا حیدر کے کچھ احوال حیات بعض کتب تذکرہ میں ملتے ہیں۔" نا چیز کہتا ہے کہ جس طرح ملا حیدر کے کچھ حالات ملتے ہیں اسی طرح ملا محمد معین ولد ملا مبین کے حالات بھی اسی نزہۃ الخواطر میں لکھے ہوئے موجود ہیں، ملاحظہ ہو جلد ہفتم ص[illegible]، اور مولوی محمد صفدر (پسر اوسط یعنی بیچلے لڑکے) ملا مبین کے باب میں صرف اتنا مذکور ہے کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی اور مولانا ولی اللہ کے پاس علم حاصل کیا ان کی استعداد بہت اچھی تھی، عین جوانی میں بعارضۂ [illegible] انتقال کر گئے۔

---

۵ اخبار الاخیار ص[illegible]، زاد المتقین قلمی ص[illegible]

صفحہ ۳۰۳ (مقالات اردو)

ملا میں التحریر پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے یہ ابن الہمام کی مشہور کتاب
اور مصنف کے شاگرد رشید ابن امیر الحاج کی شرح مسمی التقریر و التحبیر کے ساتھ
مصر میں طبع ہو چکی ہے التحریر کے بعد التقریر سے اسی شرح کی طرف اشارہ ہے یہ بھی ممکن ہے
التحریر سے اصول بزدوی کی وہ شرح مراد ہو جو علاء الدین مغلطائی نے
لکھی ہے اور التقریر سے اکمل الدین بابرتی کی شرح اصول بزدوی مراد ہو
ملا پر صاحب بدائع کے ایک مناظرہ کا ذکر ہے جو سلطان نور الدین کے دربار
میں ہوا تھا اور صاحب بدائع نے برہم ہو کر بقول کوکب صاحب کے ڈنڈا اٹھایا تھا
اس کے بعد کوکب صاحب لکھتے ہیں کہ "اس پر سلطان نے کہا یہ تو بدتمیزی ہے"۔
کوکب صاحب نے غالباً اس واقعہ کو الجواہر المضیئۃ سے نقل کیا ہے، اس میں یہ
نہیں ہے کہ "یہ بدتمیزی ہے"۔ اس میں تو صرف ھذا افتات علی الفقیہ ہے اور اس
کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے زیادتی کی یا حد سے آگے بڑھ گئے۔
اس کے بعد کوکب صاحب لکھتے ہیں کہ سلطان نے الکاسانی کو الحلاویہ کا
والی بنا کر بھیج دیا۔
کوکب صاحب کے طرز تعبیر سے دھوکا ہوتا ہے کہ الحلاویہ کوئی ملک یا صوبہ
ہے، درصورتیکہ الحلاویہ حلب کے ایک مدرسہ کا نام ہے اس مدرسہ کے صدر
مدرس یا پرنسپل کاسانی سے پہلے رضی الدین سرخسی تھے ان کے ہم عصروں نے معاصرانہ
چشمک کی بنا پر نور الدین زنگی سے شکایت کر کے ان کو برطرف کرا دیا حسن اتفاق
سے اسی زمانہ میں کاسانی ترکی حکومت کی طرف سے سفیر بنا کر حلب بھیجے گئے تھے

اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نور الدین زنگی نے رضی الدین کی جگہ کاسانی کو مدرسہ کی
صدارت وتولیت سپرد کر دی۔

الفوائد البہیہ میں ہے

فانعزل (رضی الدین) عن التدریس
وسار الی دمشق، وکان صاحب
البدائع قد ورد فی ذالک الزمان
دمشق فکتب لہٗ نور الدین خطہ
بالمدرسۃ الحلاویۃ فتولی
التدریس بھا۔[1]

پس رضی الدین درس سے سبکدوش ہو گئے
اور دمشق چلے گئے اور صاحب بدائع اس
زمانہ میں سفر ہو کر آئے تھے نور الدین نے
ان کی بابت مدرسہ حلاویہ میں خط لکھا پس
وہ اس میں منصب تدریس پر مامور ہو گئے

مدرسہ حلاویہ کی نسبت محمد کرد علی لکھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مدرسہ تھا طلبہ کی
تعداد بہت ہی زیادہ اور اس میں وظائف اور تنخواہوں کا معیار بھی بہت اونچا تھا
۵۴۳ھ میں نور الدین شہید نے ناداروں کے لیے بہت سے حجرے بنوا دیے تھے
(خطط شام ص ۹۵) اس مدرسہ کی عمارت اب بھی باقی ہے حلب کی جامع اموی یا جامع کبیر کے پچھم
جانب ایک بازار میں اس کا شاندار قدیم پھاٹک ہے مگر اس کی معنویت ختم ہو چکی ہے میں نے
ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ میں اس کی زیارت کی ہے

یہی مضمون بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ الجواہر المضیئۃ (ص ۴۲۹ ج ۲) میں ہے
ص ۱۷۱ پر حاجی خلیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ابن الضیاء . . . . نے اس تالیف کی
شرح ضیاء المعنویہ علی المقدمۃ الغزنویہ کے نام سے لکھی" شرح کا نام کشف الظنون

---

[1] ص ۵۳ طبع مصر

بے شبہہ ایک جگہ اول ہی لکھا ہے اور دوسری جگہ ضیاء معنویہ لکھا ہے مگر صحیح نام الضیاء المعنوی شرح مقدمۃ الغزنوی ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ فرنگی محل (لکھنؤ) میں مفتی عبدالقادر صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا مگر افسوس ہے کہ وہاں کتاب کا صرف نصف اول ہے

ص۱۳۵ پر لکھتے ہیں کہ "مؤلف کی نسبت اشروسنی" "شروسنہ" بستی کی طرف ہے .... بستی کے نام میں دوسری لغت "اسروشنہ" بھی یاقوت نے بیان کی ہے مگر پہلی لغت (ہمزہ کے ضمہ اور شین منقوطہ کے ساتھ) "زیادہ مشہور الاعرف" کہا گیا ہے،

یہاں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ کبھی اسروشنہ میں ایک تاء کا اضافہ کرکے استروشنہ کہتے ہیں، چنانچہ فوائد بہیہ میں ابوجعفر الاستروشنی اور محمد بن محمود الاستروشنی ہی لکھا ہے اسی طرح جواہر مضیئہ کے انساب میں بھی الاستروشنی ہی ہے، اگرچہ سمعانی کی تصریح کے بموجب اسروشنہ ہی صحیح ہے[1]

ص۱۳۳ پر احکام الصغار مولفہ اسروشنی کا تعارف ختم کرنے سے پہلے فہرست نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلمی نسخے دوسرے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں یا نہیں اس لیے ایک مختصر سی نشاندہی کی جاتی ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ بلدیہ اسکندریہ میں ہے اور ہندوستان میں کتب خانہ شاہ پیر محمد (احمد آباد) میں ایک نسخہ میں نے دیکھا ہے دوسرا دارالعلوم امدادیہ (بمبئی) کے کتب خانہ میں ہے اس کو بھی احقر نے دیکھا ہے

---

[1] فوائد بہیہ

اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نور الدین زنگی نے رضی الدین کی جگہ کاسانی کو مدرسہ کی صدارت و تولیت سپرد کر دی۔

الفوائد البہیہ میں ہے

فانعزل (رضي الدين) عن المدرسة	پس رضی الدین درس سے سبکدوش ہو گئے
وسار الى دمشق، وكان صاحب	اور دمشق چلے گئے اور صاحب بدائع اسی
البدائع قد ورد في ذلك الزمان	زمانہ میں سفیر ہو کر آئے تھے نور الدین نے
رسولا فكتب له نور الدين خطه	ان کی بابت مدرسہ حلاویہ میں خط لکھا پس
بالمدرسة الحلاوية فتولى	وہ اس میں منصب تدریس پر مامور ہو گئے
التدريس بها[1]،	

مدرسہ حلاویہ کی نسبت محمد کرد علی لکھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مدرسہ تھا، طلبہ کی تعداد بہت ہی زیادہ، اور اس میں وظائف اور تنخواہوں کا معیار بھی بہت اونچا تھا، ۵۴۳ھ میں نور الدین شہید نے ناداروں کے لئے بہت سے حجرے بنوا دیے تھے (خطط شام، ص۹۰) اس مدرسہ کی عمارت اب بھی باقی ہے، حلب کی جامع اموی یا جامع کبیر کے پچھم جانب ایک بازار میں اس کا شاندار قدیم پھاٹک ہے مگر اس کی معنویت ختم ہو چکی ہے، میں نے ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ میں اس کی زیارت کی ہے۔

یہی مضمون بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ الجواہر المضیئة (ص ۱۲۹ ج ۲) میں ہے۔

[2]
یہ حاجی خلیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ابن الضیاء ۔ ۔ ۔ ۔ نے اس تالیف کی شرح ضیاء المعنویہ علی المقدمۃ الغزنویہ کے نام سے لکھی" شرح کا نام کشف الظنون

---

[1] ص۲۵۱ طبع مصر

میں بے شبہہ ایک جگہ یوں ہی لکھا ہے اور دوسری جگہ ضیاء معنویہ لکھا ہے مگر صحیح نام الضیاء المعنوی شرح مقدمۃ الغزنوی ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ فرنگی محل (لکھنؤ) میں مفتی عبدالقادر صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا مگر افسوس ہے کہ وہاں اس کتاب کا صرف نصف اول ہے۔

ص۱۳۵ پر لکھتے ہیں کہ "مؤلف کی نسبت اشروسنی" و "شروسنہ" بستی کی طرف ہے ....بستی کے نام میں دوسری لغت "اسروشنہ" کتاب توت نے بیان کی ہے مگر پہلی لغت (ھمزہ کے ضمہ اور شین منقوطہ کے ساتھ) "اشہر الاعرف" کہا گیا ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ کبھی اسروشنہ میں ایک تاء کا اضافہ کرکے استروشنہ کہتے ہیں، چنانچہ فوائد بہیہ میں ابو جعفر الاستروشنی اور محمد بن محمود الاستروشنی ہی لکھا ہے اسی طرح جواہر مضیہ کے انساب میں بھی الاستروشنی ہی ہے اگرچہ سمعانی کی تصریح کے بموجب اسروشنہ ہی صحیح ہے[1]

ص۳۳ پر احکام الدالہ مؤلفہ اسروشنی کا تعارف ختم کرنے سے پہلے فہرست نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلمی نسخے دوسرے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں یا نہیں اس لئے ایک مختصر سی نشاندہی کی جاتی ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ بلدیہ اسکندریہ میں ہے، اور ہندوستان میں کتب خانہ شاہ پیر محمد (احمد آباد) میں ایک نسخہ میں نے دیکھا ہے، دوسرا دارالعلوم امدادیہ (ممبئی) کے کتب خانہ میں ہے، اس کو بھی احقر نے دیکھا ہے۔

---

[1] فوائد بہیہ

ص۱۵۱ پر لکھتے ہیں کہ: بہر حال مذکورہ معلومات کی بنا پر مؤلف کا سال وفات دسویں صدی ہجری کے اندر محدود کرنا بے اصل بات ہے۔

فہرست نگار کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے' جعفر بو بکانی کی تالیفات میں فہرست نگار نے مجالۃ الطالبین کا ذکر کیا ہے' مگر یہ کتاب فہرست نگار کی نظر سے نہیں گذری ہے' میں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں دیکھا ہے' اس میں مؤلف نے تصریح کی ہے کہ وہ س۹۹۲ھ میں مجالۃ الطالبین کی تالیف سے فارغ ہوا'

فہرست نگار کے پاس جعفر کے س۹۷۹ھ تک زندہ رہنے کا تحریری ثبوت تھا' اس نئے حوالہ سے اس کی زندگی میں تیرہ۱۳ سال کا مزید اضافہ ہوا'

یہاں یہ بتا دینا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے کہ مجالۃ الطالبین شیخ محمد طاہر پٹنی کی تذکرۃ الموضوعات کا مختصر ہے' میں نے سرسری طور پر اس کا مطالعہ کیا ہے'

ص۱۲۶ میں ادانی شغالی پر سوالیہ نشان ہے' یہ درحقیقت ادانی تعالی ہے' کاتب نے تعالی کو شغالی بنا ڈالا' یہ اسی طرح ہے جیسے قال تعالی،

یہ محرف لفظ دوبارہ اسی تحریف کے ساتھ ص۱۹۵ پر وارد ہوا ہے'

ص۲۴۵ پر طبرزد الکندی کے بجائے ابن طبرزد الکندی صحیح ہے'

ص۲۴۶ پر حافظ مزلی کے بجائے حافظ مزی صحیح ہے'

ص۲۴۶ پر علامہ کلاباذی کے حق میں حافظ ذہبی کا بھرپور ریمارک نقل نہیں کیا گیا' ذہبی نے اس تقریب سے کہ وہ ان کے رفیق درس در سلسلۂ حدیث تھے' اور اسی حیثیت سے ذہبی نے ان سے فائدہ اٹھایا تھا' ان الفاظ میں [illegible]

کا ذکر تذکرۃ الحفاظ میں کیا ہے

سمعت من الشیخ العلامۃ الفرضی المحدث الصالح شمس الدین

ابی العلاء محمود بن ابی بکر الحنفی وکان احد من عنی بھذا الشان

ورحل وکتب والف، سمعت منہ ....

....

.... متقنا للکتابۃ [۱]

کوکب صاحب کی نقل سے کلاباذی کا صرف عارف حدیث ہونا معلوم ہوتا ہے اور ہمارے حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پختہ کار عالم تھا اور انھوں نے فن حدیث کا خاص اہتمام کیا تھا، ور انھوں نے اس کے لئے ملک ملک کی خاک چھانی تھی حدیثیں سن کر ان کو لکھا تھا، اور اس فن میں وہ صاحب تالیف ہیں، اور ذہبی جیسے بلند پایہ محدث کا اعتراف ہے کہ اس نے بھی کلاباذی سے حدیثیں سنی ہیں،

ذہبی نے اس سے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت المعجم المختص میں دیا ہے، اس میں انھوں نے ان کے حق میں یہ الفاظ لکھے ہیں،

الحافظ الامام المحدث المتقن۔

اور مشتبہ النسبۃ میں بھی الحافظ، اور امام و مصنف جیسے الفاظ ان کے حق میں لکھے ہیں [۲]

---

[۱] [illegible] دیکھئے مشتبہ النسبۃ ص [illegible]

مطبوعاتِ جدیدہ

حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق: از مولانا محمد تقی عثمانی، بڑی تقطیع کاغذ چھپائی کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۲ مجلد قیمت اٹھارہ روپے پتہ: الجمعیۃ بکڈپو قاسم جان اسٹریٹ، دہلی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، مولانا محمد تقی عثمانی نے بھی اپنے رسالہ البلاغ کے کئی نمبروں میں اس کا جواب تحریر کیا تھا، یہ کتاب اسی کا مجموعہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں سیدنا حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق خلافت و ملوکیت کے مندرجات پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے "خلافت و ملوکیت" ہماری نظر سے نہیں گذری، اس جوابی تصنیف میں اس کی جن قابلِ اعتراض باتوں کا جواب دیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں، حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں سیاست دین کے تابع نہ تھی۔ وہ اس کے تقاضے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، انھوں نے قانون کی بالاتری ختم کر دی تھی، اپنے گورنروں کی زیادتیوں پر قانون کے مطابق کارروائی نہیں کرتے تھے، آزادیٔ رائے کا خاتمہ کر دیا تھا، وہ خود اور ان کے امراء حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کرتے تھے، انھوں نے یزید کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ولی عہد نامزد کیا اور اس کے لیے بیعت لینے میں جبر و اکراہ، خوف و طمع اور کھلم کھلا رشوت سے کام لیا وغیرہ، حضرت معاویہؓ جلیل القدر صحابی، کاتب وحی اور اسلام کے بڑے مدبروں میں تھے گو وہ معصوم نہ تھے تاہم دوسرے

صحابہ کی طرح عادل تھے مصنف کے خیال میں مولانا کے اعتراضات کو صحیح تسلیم کرنے کا لازمی منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ فسق و فجور جیسے بڑے گناہوں کے نہ صرف مرتکب تھے بلکہ انھوں نے ان کو اپنی باقاعدہ اور مستقل پالیسی بنا لیا تھا جو ظاہر ہے کہ عدالت کے منافی ہے، اس سلسلہ میں عدالت صحابہ پر مفید اور معتدل بحث کی گئی ہے انھوں نے مولانا مودودی کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ تاریخی روایات کے معاملہ میں اگر حدیثوں ہی کی طرح جرح و تعدیل کے معیار پر تحقیق و تنقید شروع کی گئی تو تاریخ اسلام کا کم از کم ۹/۱۰ حصہ ناقابل قبول قرار پائے گا، علاوہ ازیں حدیث کے رد و قبول میں بھی احکام و عبادات سے متعلق روایات میں زیادہ کاوش کی جاتی ہے اور فضائل و ترغیبات میں کمتر درجہ کی روایتیں بھی قبول کی جاتی ہیں، اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں جن تاریخی روایات کا معاملہ ہے ان کی زد عقائد پر پڑتی ہے اور عقائد کی اہمیت احکام و عبادات سے بھی زیادہ ہے، اس لئے ان پر بھی جرح و تعدیل کے ان ہی اصولوں سے کام لیا جائے گا، آخر میں حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت پر تبصرہ کرکے اس کی صحیح نوعیت واضح کی گئی ہے، وہ گو ان کی خلافت کو خلافت راشدہ سے کمتر سمجھتے ہیں، لیکن مولانا مودودی نے اس کو جس طرح ظلم و تعدی اور فسق و فجور سے ملوث قرار دیا ہے، اس کی مدلل تردید کی ہے، مصنف اپنے والد مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی طرح تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، اور پاکستان کے سنجیدہ اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں، وہ مولانا مودودی کے جواب میں غصہ اور جھنجھلاہٹ کے اظہار اور ذاتی طعن و تشنیع کے بجائے علمی انداز میں بحث کرتے ہیں، ان کے اخذ کردہ بعض نتائج سے اختلاف کی گنجائش ہے، اور کہیں کہیں ان کے خیالات میں الجھاؤ بھی ہے، مثلاً مسلمان کے کافر کے وارث ہونے یا نہ ہونے پر گفتگو کے ضمن میں فتح الباری کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں کافر کے بجائے اہل کتاب کا ذکر ہے، ظاہر

۱۱ ... نمبر ۵

مئی سنہ ۱۹۷۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

((مرتبہ))

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

شذرات

ایران میں غیر معمولی انقلاب آیا، وہاں بادشاہت ختم ہوگئی، خیال ہے کہ اب اسلامی جمہوریت قائم ہوگی، دنیا کے سیاسی پیشواؤں کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں، کہ یہ انسانی فلاح وبہبود کیلئے کس طرح موثر اور کار آمد ثابت ہوتی ہے،

اس انقلاب کے لانے میں وہاں کے مذہبی پیشوا آیت اللہ خمینی کا بہت بڑا کارنامہ ہے، وہ پندرہ برس پہلے جلاوطن کر دیئے گئے تھے، فرانس میں مقیم رہے، مگر جب شاہ ایران کے خلاف بغاوت پھیلی تو انھوں نے فرانس ہی میں بیٹھ کر جو چاہا وہی ہوا، شاہ کو تاج وتخت چھوڑنا پڑا، ان کا شاہانہ دبدبہ کچھ کام نہ آسکا، امریکہ جیسا دولت مند ملک بھی ان کے لئے بے اثر رہا، ان کی مسلح فوج ان کی تائید میں تھی، مگر وہ تمام حربی اسلحہ جن کی دھوم انھوں نے دنیا میں مچا رکھی تھی، عوام کے مشتعل جذبات کے آگے دھرے کے دھرے رہ گئے، آیت اللہ خمینی فرانس سے ایران آئے تو ان کا استقبال اس طرح ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی ساری شاندار روایات کو اپنے دوش پر ساتھ لائے ہیں، اور وہ مغربی جمہوریت اور روسی اشتمالیت کے مقابلہ میں ایک ایسی اسلامی حکومت قائم کریں گے، جو موجودہ سیاسی نظام سے بیزار دنیا کے لیے ایک مثال ہوگی،

اس انقلاب کے بعد اس کے مخالفوں کے ساتھ ایران میں جو سلوک ہو رہا ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے بجائے یورپی سیاست کا اہرمن کام کر رہا ہے، جب ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو بقول مولانا شبلی جباران قریش سامنے تھے، جن میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں

ہیں پیش تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھتی تھی، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، رحمت عالم ﷺ نے اُن کی طرف دیکھا اور پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں، وہ لوگ اگرچہ ظالم تھے اور شقی تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اُٹھے، تو شریف بھائی ہے، پھر ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"

اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے بجائے ایران فرانس کے ۱۷۸۹ء کے مشہور انقلاب کی روایت کو دُہرا رہا ہے جہاں ایک انقلاب پسند فرقہ جیکوبن نے آئین اور دستور کا سہارا لینے کے بجائے تحفظ امن عامہ کے نام پر دہشت پھیلائی، اقتدار حاصل کرکے ایک انقلابی عدالت قائم کی، جس کے سامنے عورتیں اور مرد ملک کے خلاف جرائم کے ارتکاب کرنے کے جرم میں پیش ہوتے، ایک سرسری تحقیقات کے بعد ان کو گلوٹین یعنی قتل کر دیا جاتا، بادشاہ لوئی شانزدہم کے ساتھ اسکی ملکہ میری انٹی نوائنٹ بھی دار پر چڑھائی گئی، جو لوگ جیکوبن کی مخالفت کرتے، غدار سمجھ کر مار دیے جاتے، کوئی ایک دوسرے سے کی ہمسری پسند نہیں کرتا، بڑے بڑے ارباب نظر و فکر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، پھر انقلاب میں حصہ لینے والے اعتدال پسند لوگ بھی بدخواہ قرار دئے گئے جو ایک ایک کرکے یا تو قید خانہ بھیج دیئے گئے، یا سولی کی نذر ہوگئے، پھر جب باہمی اختلاف پیدا ہوگیا تو افراتفری میں جو لوگ برسر اقتدار آئے، انھوں نے مسیحیت کو ختم کرکے عقل کی پرستش کا حکم دیا،

ایران میں فرانس ہی کے مشہور انقلاب کا نقشہ اس وقت سامنے ہے، شاہ ایران کے اکابر حامی لقمۂ اجل بنائے جارہے ہیں، وہاں ایک اسلامی انقلابی عدالت قائم ہوئی ہے جس کے سامنے صبح کو مجرم پیش کیے جاتے ہیں، اور شام کو غداری کے جرم میں ان کو گولی ماردی جاتی ہے، کسی کی ہمسری یا اعتدال پسندی برداشت نہیں کی جارہی ہے آیت اللہ خمینی اب تک بے تاج کے

بدعقیدہ بنے لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے، مگر ان کے خلاف بھی آواز بلند ہو رہی ہے اور ان کے حامیوں پر گولیاں چلنے لگی ہیں،

ڈر ہے کہ اس باہمی اختلاف آویزش سے کہیں مذہب سے بیزار ہو کر اسلام کے مخالفین برسر اقتدار نہ آجائیں، اور وہاں بھی فرانس کی طرح عقل پرستی کے ساتھ الحاد پرستی نہ شروع ہو جائے، اگر خدانخواستہ وہاں اسلام کا پرچم سرنگوں ہوا، تو اس کی تلافی ایک مدت مدید تک نہ ہوسکے گی، اور عام خیال ہو جائے گا، کہ اسلام زمانہ اور سیاست کا ساتھ نہیں دے سکتا،

اسلام امن کا پیام لے کر آیا، اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث ہوئے، مسلمانوں کی زندگی کا مقصد دنیا میں رحمت کی خوشخبری اور بشارت دے کر انسانیت کو سنوارنا تھا، وہ رگ باطل کے لئے نشتر تھے، مگر خود ان کی رگ باطل میں نشتر دینے کی ضرورت ہے، وہ شرار بولہبی کو مٹانے آئے تھے، مگر وہ خود شرار بولہبی سے مٹ رہے ہیں، وہ کفر پر ہنسنے آئے تھے، مگر کفر خود ان پر خندہ زن ہے، اسلامی ممالک میں حکومت کے ساتھ اب دولت وثروت کی فراوانی بھی ہے، مگر اس نعمت خداوندی کے باوجود کہیں ایسی اسلامی حمیت وغیرت اور باہمی موانست و یکانگت نہیں جن پر دنیا کے مسلمان فخر کرسکیں، ان کے بجائے وہاں یورپ کی ہر چیز سے شیفتگی، مذہب سے بیگانگی الحاد سے وابستگی، دولت کے بیجا استعمال سے عیش پرستی، کردار فروشی، ضمیر فروشی، اور عزت ناموس کی پامالی ہے کہیں ابولہب، کہیں عبد اللہ بن ابی، کہیں علقمی کہیں جعفر کہیں صادق کی روح کارفرما ہے، اور عام مسلمان اپنی زبان حال سے کہہ رہے ہیں،

ع :- کچھ بھی پیغام محمد کا ہمیں پاس نہیں

......

مقالات

قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی

احوال و آثار

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی۔ ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علیگڑھ

ماضی قریب میں (علماً اور رسماً کے لیے آج بھی) عربی مدارس کے اعلیٰ نصاب میں معقولات کی جو کتابیں داخل درس رہی ہیں، اُن میں علم ہیئت کی مشہور کتاب "شرح چغمینی" بھی ہے، متاخر مغل بادشاہوں کے عہد میں تو ریاضی و ہیئت کے منتہی طلبہ شرح تذکرہ اور "تحریر المجسطی" بھی پڑھا کرتے تھے، معقولات کی یہ کتابیں علم و دانش کا خزانہ تھیں، جو اس زمانہ میں ضرور پڑھی جاتی تھیں[1]، برصغیر کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ان کے مخطوطے کافی

---

[1] مثلاً اجتماع کے دنوں کی توجیہ کے لیے محقق طوسی نے "تذکرہ فی الہیئۃ" میں جو مفروضہ پیش کیا ہے ملا محمود جونپوری اُس پر اعتراض کرتے ہیں، "وما ذکر فی ... من وجود الاجرام لغیبہا بلک ... بالتساوی فی تعدد النقص ... علیہ" (الشمس البازغہ ص ۱۴۱)

اسی طرح اس لاینحل مسئلہ کے حل کرنے کے لئے کہ کواکب متحیرہ میں ہر ایک کی تدویر کے مراکز ایک موہوم فلک (معدل المسیر) کے مرکز کے گرد کیوں حرکت کرتے ہیں متاخرین نے افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کیا، فاضل جونپوری نے اس کی تفصیل کرنے کے لئے تذکرہ سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کا یہ حصہ ... "وقد زاد المتاخرون لذلک افلاکا ... فی تصویرہا ... علیہ ... الی ..." (ایضاً ص ۱۴۲)

تعداد میں ملتے ہیں۔ جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور موخرالذکر (تحریر المجسطی) کی درسی حیثیت کا ثبوت[۱] اس بات سے ملتا ہے، کہ مغل تاجدار محمد شاہ (۱۷۱۹ سے ۱۷۴۸ء)

---

[۱] "تذکرہ" کی قدیم ترین شرح قطب الدین شیرازی نے لکھی تھی، مگر ہندوستان کی کسی لائبریری میں اس کا پتہ نہیں چلتا، اس کی شروح میں البتہ صرف ان چار فاضلوں کی شروح مشہور ہیں، نظام اعرج، میر سید شریف، خفری اور برجندی کی شروح تذکرہ اور چاروں کے مخطوطے ہندوستان کی لائبریریوں میں عموماً ملتے ہیں، مثلاً آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تذکرہ کے متن کا ایک نسخہ ہے (ذخیرہ سبحان اللہ ۱۰۹) نظام اعرج کی شرح توضیح التذکرہ کے دو نسخے ہیں (سبحان اللہ ۱۰ عبدالحی ۱۲۲)، میر سید شریف کی شرح تذکرہ کے چار نسخے ہیں، (یونیورسٹی کلیکشن ۱۳ عبدالحی ۱۲۲، ۱۲۳) برجندی کی "شرح تذکرہ" کے ۲ نسخے ہیں (سبحان اللہ ۹ عبدالحی ۱۲۴) اور احمد خضری کی "التکملۃ فی شرح التذکرہ" کے ۲ نسخے ہیں، (عبدالحی ۱۲۲ عبدالسلام ۲۸) رضا لائبریری رامپور میں نظام اعرج کی شرح کا ایک (فہرست کتب عربی قدیم ۲۲) میر سید شریف کی شرح کے دو (۲۲۲، ۲۲۳) برجندی کی شرح کا ایک (۲۲۲) خضری کی شروح کا ایک (۲۲۲)، اسی طرح اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ میں نظام اعرج کی شرح کے دو (۲۲۲، ۲۲۳) میر سید شریف کی شرح کے ۲ دو (۲۲۴، ۲۲۵) خضری کی شرح کا ایک (۲۲۳) نسخہ ہے، اسی طرح کتب خانہ آصفیہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں برجندی کی شرح کا ایک نسخہ ہے (فہرست کتب صفحہ ۸۹، نمبر ۵۵) اور احمد خفری کی "التکملۃ فی شرح التذکرہ" کا ایک نسخہ ہے، (فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد سوم ۳۲۲) اور لائبریریوں میں بھی ہونگے،

[۲] "شمس بازغہ" فلسفہ کی کتاب ہے، لیکن مصنف علیہ الرحمۃ نے اس کے الفن الثانی فی السماء والعالم کی دوسری فصل میں افلاک کا حرکات وہئیات کا اجمالی بیان کر کے اس کی مزید تفصیل کے لیے المجسطی کا حوالہ دیا ہے، "اثبتوا لکل مدۃ افلاک یتحرک کل حرکۃ متشابھۃ ویلزم من الاجتماع ذالک الاختلاف و ینتظم علی ما تیکفل بہ صناعۃ المجسطی"۔ شمس بازغہ ص ۱۳۲)

کے درباری طبیب معتمد الملوک علوی خاں (میر محمد ہاشم[1]) اور رصد گاہ محمد شاہی دہلی کے معاون سربراہ مرزا خیر اللہ مہندس[2] نے اس کتاب کی شرحیں لکھی تھیں۔ یہ اس دور کی باتیں ہیں، جب کہ ان علوم کو قوم بنظر اہتمام دیکھتی تھی، اور ان کے واقف کاروں کو سماج میں عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، مگر اب جب کہ ماضی سے نئی نسل کا رشتہ بھولی بسری داستان بنتا جارہا ہے، یہ نام اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہونے لگے ہیں، اس لیے اسلاف کی جگر کاویوں سے فی الجملہ واقفیت کے لیے ان کی علمی کاوشوں کا تذکرہ وقت کی اہم ضرورت ہے،

نظر بریں بفحوائے مصرعہ مشہور:۔

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

"شرح چغمنی" اور اس کے فاضل مصنف کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔ وباللہ التوفیق

نام و نسب | قاضی زادہ کا نام موسیٰ اور لقب صلاح الدین تھا۔ پدر بزرگوار کا نام محمد اور جد امجد کا محمود تھا، جو روم (ترکی) کے شہر بروصہ کے قاضی تھے، انھیں کی نسبت سے ہمارے رئیس التذکرہ "قاضی زادہ" کہلائے۔

خاندان | قاضی زادہ کے مورث اعلیٰ قاضی محمود ترکی کے ایک غیر معروف مقام سلطان اولی میں پیدا ہوئے، دستور کے مطابق اپنے زمانہ کے علما و مشاہیر سے تفسیر، حدیث اور دوسرے

---

[1] میر محمد ہاشم کی شرح تحریر المجسطی (رضا لائبریری رامپور، فہرست کتب عربی قدیم فن ہیئت ۳۲۵)

[2] مرزا خیر اللہ مہندس کی شرح تحریر المجسطی تقریب التحریر کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں (فہرست کتب فارسی قدیم فن ہیئت)، مرزا خیر اللہ نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر المجسطی کو نقل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو رضا لائبریری رامپور کی فہرست کتب عربی قدیم فن ہیئت ۳۲۱ء المجسطی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ راجہ جے سنگھ سوائی کے ایما سے جس نے دہلی کی مشہور رصد گاہ جنتر منتر کو تعمیر کرایا تھا جگن ناتھ پنڈت نے "سمراٹ سدھانت" کے نام سے اس کتاب المجسطی کا سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا،

علوم شرعیہ وادبیہ کو حاصل کیا، جلد ہی اُن کے علم وفضل کی شہرت پھیل گئی، جو اس زمانہ کے عثمانی فرمانروا سلطان مراد اول (۷۶۱ - ۷۹۱ھ) کے کانوں تک بھی پہونچی اور اس نے انھیں شہر بروصہ کا قاضی مقرر کر دیا، وہ متقی، پرہیزگار، عالم صالح، متشرع و متورع تھے، عرصہ تک عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی اور دیانتداری سے پورا کرتے رہے، اپنے علم وفضل اور نیکو سیرتی کی بنا پر عوام میں ہر دلعزیز تھے اور "قوجہ آفندی" کہلاتے تھے، خود سلطان بایزید اُن کے علم وفضل، دین و دیانت اور حسن تدبر سے متاثر تھا۔ چنانچہ جب اُس نے اپنے بیٹے بایزید کی شادی امیر گرمیان (Germian) کی صاحبزادی سے کرنا چاہی تو اس کے لیے وجوہ و اعیان ملک کی ایک جماعت کو گرمیان بھیجا، تو اس جماعت کا رئیس و پیشوا قاضی محمود ہی کو مقرر کیا[1]، یہ کوئی معمولی شادی نہیں تھی، بلکہ سیاسی مصالح بھی اس میں کارفرما تھے، کیونکہ امیر گرمیان نے بیٹی کے جہیز کے نام سے کئی شہر بھی دیئے تھے،

قاضی محمود کے سال وفات کی کہیں صراحت نہیں ملتی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے کا طاشکبری زادہ نے ذکر کیا ہے، ان کا نام محمد تھا، اور وہ بھی بڑے عالم وفاضل تھے، مگر ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے[2]۔

لڑکا ہمارا رئیس التذکرہ ہے، جس کا نام موسیٰ پاشا تھا[3]،

ولادت | قاضی زادہ کے سال ولادت کی تو کہیں تصریح ملتی نہیں، لیکن غالباً وہ آٹھویں صدی ہجری کے ربع آخر کی ابتدا میں پیدا ہوئے (شاید ۷۷۶ھ کے قریب)،

اوپر مراد اول کے جانشین بایزید کی امیر گرمیان کی صاحبزادی سے شادی کا ذکر

---

[1] الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ برحاشیہ تاریخ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۰۶ - ۱۰

[2] ایضاً ص ۱۰۷ [3] ایضاً ص ۱۱

نذر چکا ہے، جس کی تکمیل کے لیے بادشاہ نے ہمارے رئیس التذکرہ کے دادا کو سربراہ
جماعت بنا کر بھیجا تھا، یہ شادی سنہ ۷۳۱ھ (مطابق ۱۳۳۰ء) میں ہوئی تھی، اور چونکہ طاشکبری
زادہ نے اس کا ذکر قاضی محمود کے بوڑھے ہو جانے کے ذکر کے فوراً بعد کیا ہے، اس لیے اندازہ
ہوتا ہے، کہ ۷۶۰ھ کے قریب وہ بوڑھے ہو چکے ہونگے، لہذا اُن کے صاحبزادہ محمد (اگر اُسوقت
حیات ہوں) جوان ہونگے اور چونکہ مولی محمد کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا، اور انھوں نے
صرف دو ہی بچے چھوڑے تھے، اس لیے قاضی زادہ ۷۶۰ھ میں بچے ہونگے۔

بنا بریں اگر قاضی زادہ کا سال ولادت قرن ہشتم کی آخری چوتھائی کی ابتدا کے
قریب فرض کیا جائے تو غالباً یہ مفروضہ حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا۔

تعلیم | بدقسمتی سے تاریخ نے قاضی زادہ کی زندگی کی دوسری جزئیات کی طرح ان کے حصولِ
علم کی تفصیل یا اُنکے اس تذکرہ کے نام بھی محفوظ نہیں رکھے، طاشکبری زادہ نے صرف اتنا لکھا ہے
کہ انھوں نے پہلے اپنے وطن کے علما سے تعلیم حاصل کی، پھر عجم (ایران) گئے، وہاں جا کر علمائے
خراسان سے پڑھا، اور آخر میں ماوراءالنہر جا کر مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی، اساتذہ میں میر
سید شریف کے سوا ان کے کسی اُستاد کے نام کا پتہ نہیں چلتا، اور ان سے بھی تلمذ برائے نام ہی تھا،
تفصیل آگے آرہی ہے۔

بہرحال انھوں نے پہلے اپنے وطن ہی میں تعلیم حاصل کی۔

روم میں علم و ادب کے مرکز کی تاسیس | دولت عثمانیہ، جس کی ۶۹۹ھ (مطابق ۱۱۹۰ء) میں سلطان
عثمان خان نے بنیاد ڈالی تھی، جلد ہی اپنے وقت کی عظیم سلطنت بن گئی، اور مغربی ایشیا کے
علاوہ مشرقی یورپ کے بڑے حصہ پر بھی ترکوں کی عظمت و شوکت کا پرچم لہرانے لگا، ۷۶۰ھ

سلہ Encyclopaedia of Islam (Brill,
Leyiden, 1936 Vol. III, P 727

(مطابق ۱۴۵۳ء[1]) میں سلطان محمد فاتح نے مشرقی رومن امپائر کے پایۂ تخت قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ جس نے دنیا، بالخصوص یورپ کی تاریخ کو ایک نئے رخ میں موڑ دیا، کیونکہ اسی وقت سے تاریخ کے اُس دور کا آغاز ہوتا ہے، جو "نشاۃ ثانیہ" کہلاتا ہے۔ "باب عالی" کی جبہ سائی دول یورپ کے سفراء کے لیے وجہ عز و افتخار بن گئی۔ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم نے مصر فتح کر کے آخری عباسی خلیفہ سے منصب خلافت حاصل کر لیا۔ اس طرح ترک سلاطین کو دنیائے اسلام میں اکثریت کی دینی سیادت بھی حاصل ہو گئی، اور یہ شرف انھیں آیندہ کوئی چار سو سال تک حاصل رہا، تا آنکہ کمال اتاترک کی تجدد پرستی نے ۱۹۲۳ء میں نظام سلطنت کے ساتھ خلافت کو بھی ختم کر دیا۔

ترکی کے اس عروج و زوال کی تفصیل سیاسی تاریخ کے مورخین کا منصب ہے۔ لیکن ترکان احرار صرف تلوار ہی کے دھنی نہیں تھے، علم و ادب کی ترقی میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ روم کے پہلے سلطان (عثمان خان ۶۹۹ - ۷۲۶)، نے اس ملک کے پہلے عالم (مولیٰ ادہ بالی) کی صاحبزادی سے عقد کیا[2]، اور اس طرح یہ بتا دیا کہ علماء و مشائخ سلاطین و اُمراء کے ہم کفو، و ہم مرتبہ ہیں، اُن کے جانشین سلطان اورخان (۷۲۶ - ۷۶۱ھ) نے شہر ازنیق میں ترکی کا پہلا مدرسہ قائم کیا[3]۔ سلطان محمد فاتح (۸۵۵ - ۸۸۶ھ) نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تو وہاں کے آٹھ بڑے گرجا گھروں کو مدارس میں تبدیل کر دیا[4]۔ ان "مدارس ثمانیہ" کی صدارت سب سے بڑا اعزاز سمجھی جاتی تھی، جس کا ایک ترک عالم تصور کر سکتا تھا۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کیا، بے شک یہ ان کا بہت عظیم کارنامہ ہے، لیکن علم و حکمت کی تاریخ میں اس سے بھی عظیم تر کارنامہ یہ ہے کہ ان کے ایماء سے مولیٰ خواجہ زادہ اور

---

[1] [illegible] [2] الشقائق ص ۵ [3] الشقائق ص ۸ [4] الشقائق ص ۱۰۵

مولیٰ علاء الدین طوسی نے تہافت الفلاسفہ اور کتاب الذخیرہ میں امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد کے "تہافت التہافت" یا متکلمین اور حکما کے متضاد موقفوں کے درمیان محاکمہ کیا۔[1] ترکی معاشرہ میں طبقۂ علماء کو جس غیر معمولی عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ سلطان بایزید کے وزیراعظم ابراہیم پاشا کے یہاں امیر الامراء احمد بیگ (جن سے بلند تر کوئی امیر نہیں بیٹھ سکتا تھا) سے بھی بلند تر مقام پر مولیٰ مصلح الدین قوقانی بیٹھا کرتے تھے، حالانکہ موخر الذکر کا روزینہ صرف تیس درہم تھا۔[2]

ترک علماء کی علم دوستی اور ترک سلاطین کی علماء نوازی نے جو اسلام کی ثقافتی تاریخ کا ایک روشن و درخشاں باب ہے بغداد اور قاہرہ کی طرح قسطنطنیہ کو بھی قبۃ الاسلام بنا دیا۔ مگر اس کی تفصیل کا استقصا جس کی دلکشی

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پر عمل کرنے کی دعوت دیتی ہے ہمیں موضوعِ پیش نظر سے دور لے جائے گی جو صرف قاضی زادہ کے بچپن میں روم کے علمی احوال کے بیان سے متعلق ہے، روم (ترکی) میں اسلامی علوم و فنون کی طویل تاریخ پانچ ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے:-

پہلا دور:- سلطان عثمان خاں کے آغاز سلطنت سے مراد ثانی کی وفات تک (۶۹۹-۸۵۵ھ)

دوسرا دور: محمد فاتح اور بایزید ثانی کا زمانہ (۸۵۵-۹۱۸ھ)

---

[1] الشقائق ص ۱۰۷، [2] الشقائق صفحہ ۲۱۴

تیسرا دور: سلیم اول اور سلیمان اول کا زمانہ (۹۱۸-۹۷۴ھ)

چوتھا دور: سلیم ثانی کے عہد سے محمود ثانی کے زمانہ تک (۹۷۴-۱۲۵۵ھ)

پانچواں دور: عبد المجید اول بالخصوص ان کے خط شریف گلخانہ کے اعلان کے بعد

ان میں دوسرا دور (بالخصوص محمد فاتح کا زمانہ) ترکی میں اسلامی علوم کی تاریخ کا عہد زریں ہے۔ روم میں اس زمانہ سے زیادہ علمائے تحریر کی اتنی بڑی جماعت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ مثلاً مولیٰ خسرو بن فراموز (جنھیں سلطان اپنے زمانہ کا "ابوحنیفہ" کہا کرتا تھا[1] اور جو فقہ میں "الغرر" اور اس کی شرح "الدرر" اور اصول فقہ میں "مرقاۃ الوصول" اور اس کی شرح "مرآۃ الاصول" کے مصنف ہیں) مولیٰ علاء الدین طوسی اور مولیٰ خواجہ زادہ جنھوں نے تہافت الفلاسفہ اور تہافت التہافت کے مابین محاکمے لکھے[2] احمد بن موسی الخیالی جن کا شرح عقائد نفتازانی پر حاشیہ کچھ عرصہ پہلے تک عربی مدارس میں علم کلام کے اعلیٰ نصاب میں مقرر تھا اور جس کے ذریعہ بلاد عجم میں طلبہ کی ذہانت کا امتحان لیا جاتا تھا[3] مصلح الدین قسطلانی، خطیب زادہ، علاء الدین عربی، مولیٰ عبد الکریم، حسن سامسونی، ابن المحاج حسن، علامہ قوشجی، مولیٰ مصنفک، سراج الدین حلبی، حمید الدین حسینی، صلاح الدین حسن چلبی، شمس الدین، خواجہ احمد وغیرہم۔

پہلا دور اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ اس عہد زریں کا پیش خیمہ ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ہمارے رئیس التذکرہ کی تعلیمی زندگی کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ اس پہلے دور کی ابتدا سلطان عثمان خاں کے عہد حکومت سے ہوتی ہے،

---

[1] الشقائق ص ۱۲۶ [2] الشقائق ص ۱۰۷ [3] الشقائق ص ۱۵۵-۱۵۶

اس سے پہلے اس علاقہ میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا جن لوگوں کو اس کا شوق ہوتا وہ باہر (شام، مصر یا ایران میں) جاکر کسب کمال کرتے، اور پھر وطن آکر اس فیض کو جاری کرتے۔ سلطان عثمان خاں کے عہد کے علماء میں سرفہرست مولیٰ ادہ بالی کا نام ہے جو قرامانیہ میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے اعلیٰ تعلیم بالخصوص تفسیر، حدیث اور اصول (شام جاکر حاصل کی، پھر وطن واپس آئے، جہاں مسافروں کے لئے ایک زاویہ تعمیر کرایا، سلطان عثمان خاں کے ساتھ ان کی صاحبزادی کے عقد ازدواج[1] کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی قران سعدین کے نتیجہ میں سلطان اورخاں پیدا ہوئے سلطان[2] ان سے نہ صرف مسائل شرعیہ ہی میں رجوع کیا کرتا، امور سلطنت میں بھی مشورہ لیا کرتا تھا، ۷۲۶ھ میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی[3] شاگردوں میں مولیٰ طور سون زیادہ مشہور رہے جو ان کے داماد بھی تھے، اور ان کی وفات پر ان کے جانشین بھی ہوئے[4] اس عہد کے تیسرے مشہور عالم خطاب بن ابی القاسم تھے، وہ رہنے والے تو قرہ حصار کے تھے، مگر اعلیٰ تعلیم انھوں نے وقت کے عام دستور کے مطابق شام جاکر حاصل کی، جہاں سے تفسیر، حدیث اور فقہ میں تبحر حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے اور وفات تک درس و تدریس میں مشغول رہے تصانیف میں نسفی کے منظومۂ خلافیات کی شرح یادگار ہے[5]

سلطان عثمان خاں کے جانشین اورخاں (۷۲۶۔ ۷۶۱ھ) ہوئے ان کے عہد کے علماء میں مولیٰ داؤد قیصری، مولیٰ تاج الدین کردری، اور مولیٰ علاء الدین اسود زیادہ مشہور رہے، اول الذکر بھی مولیٰ ادہ بالی کی طرح قرامانیہ ہی کے رہنے

---

[1] اشتقاق ص ۶ [2] اشتقاق ص ۶ [3] اشتقاق ص ۶

واسطے تھے مگر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر تشریف لے گئے تھے جہاں تفسیر، حدیث اور اصول فقہ نیز علوم عقلیہ میں تبحر حاصل کیا۔ تصوف کے اسرار و دقائق بھی حاصل کیے۔ وطن واپس آئے تو سلطان اورخان نے شہر ازنیق میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور انھیں وہاں کا صدر مقرر کیا۔ طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:۔

وبنی السلطان اورخان مدرسۃ فی بلدۃ	سلطان اورخان نے شہر ازنیق میں ایک مدرسہ
ازنیق وھی علی ماسمعتہ من الثقات اول	تعمیر کرایا اور جیسا کہ میں نے ثقات سے سنا ہے،
مدرسۃ بنیت فی الدولۃ العثمانیۃ[1]	یہ پہلا مدرسہ ہے جو دولت عثمانی میں بنایا گیا،

تصانیف میں شیخ ابن عربی کی "فصوص الحکم" پر ان کی شرح تصوف کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، اس کے مقدمہ سے علوم منقولہ میں بھی ان کی دستگاہ عالی کا پتہ چلتا ہے،

مولیٰ داؤد قیصری کی وفات پر سلطان نے مولیٰ تاج الدین کردری کو اس مدرسہ کا صدر مقرر کیا، وہ سراج الدین ارموی کے شاگرد تھے جو "مطالع الانوار" کے مصنف تھے، حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد ترکی آئے، جہاں مولیٰ اده بالی نے اپنی دوسری صاحبزادی ان کے عقد میں دیدی۔[2]

مولیٰ تاج الدین کردری کی وفات پر سلطان نے اس مدرسہ کی صدارت مولیٰ علاء الدین اسود کو تفویض کی۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بلاد عجم (ایران) گئے تھے، واپس آنے پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، دوران درس ہی میں فقہ کے مشہور متن "وقایہ" کی شرح لکھی "وقایہ" کے علاوہ "المغنی" کی بھی شرح لکھی[3]، شاگردوں میں مولیٰ

---

[1] الشقائق ص ۸ [2] الشقائق ص ۹ [3] الشقائق ص ۱۰

خلیل جندری زیادہ مشہور رہے جنھیں اورخان نے قاضی لشکر مقرر کیا تھا وہ ان کا غیر معمولی ادب و احترام کیا کرتا[1]

اسی عہد کے ایک اور قابل ذکر عالم مولی الحسن قیصری تھے پہلے انھوں نے مولی مجدالدین قیصری سے تعلیم حاصل کی پھر زمانہ کے دستور کے مطابق شام گئے جہاں تفسیر وحدیث میں کمال حاصل کیا۔ وطن واپس آکر درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری کیا اور فقہ اور فرائض میں دو منظومے لکھے نیز عروض کے ایک رسالہ کی شرح لکھی[2]

اورخان کے جانشین مراد اول (۷۶۱-۷۹۱ھ) کے عہد کے مشاہیر علماء میں سرفہرست تو ہمارے رئیس التذکرہ کے جد امجد قاضی محمود ہیں جن کے علم وفضل اور دین و دیانت سے متاثر ہو کر سلطان نے بروصہ کا قاضی مقرر کیا تھا تفصیلی تذکرہ اوپر گذر چکا ہے دوسرے علماء میں مولی جمال الدین آقسرائی اور برہان الدین احمد مشہور ہیں:۔

مولی جمال الدین آقسرائی امام رازی کی چوتھی پشت میں تھے بلاد قرامان میں مدرسہ سلسلہ کے صدر تھے جس کی صدارت کے لیے "صحاح جوہری" کا حافظ ہونا شرط تھا ان کے علم وفضل کے بارے میں طاشکبری زادہ نے لکھا ہے:۔

عارفا بالعلوم العربیۃ والشرعیۃ والعقلیۃ قد درس فافاد وصنف فاجاد"[3]	علوم عربیہ وشرعیہ اور معقولات میں دستگاہ عالی رکھتے تھے بہت سے شاگردوں کو تعلیم دی اور مستفید کیا نیز بہت سی کتابیں بڑے اچھے انداز میں تصنیف کیں

---

[1] الشقائق ص ۱۱ [2] الشقائق ص ۱۲ [3] الشقائق ص ۲۰

تصانیف میں "تفسیر کشاف" کا حاشیہ اور "الایضاح (فی المعانی) نیز "انموذج (فی الطب) کی شرح مشہور رہیں کثیر الافادہ مدرس تھے اور ان کے فیض تلمذ نے اکثر شاگردوں کو اپنے عہد کا باکمال عالم بنا دیا جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے،

وانتفع بہ کثیر من الفضلاء	ان سے بے شمار فضلاء اور علماء کی ایک جماعت
وتخرج عندہ جم من العلماء[1]	نے استفادہ کر کے کمال حاصل کیا'

طلبہ کی کثرت کی وجہ سے انھیں تین جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، ثانین جو ان کی سواری کے ہمراہ پڑھتے ہوئے چلتے تھے، روافین جو حجروں میں رہتے تھے اور وہ انھیں مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے تعلیم دیتے تھے اور اعلی جو اندرون مدرسہ مقیم رہتے تھے، شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور مولیٰ شمس الدین فناوی تھے[2] میر سید شریف بھی ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر ان سے پڑھنے پہونچے مگر ان کے پہونچنے سے پہلے ہی ان (آقسرائی) کا انتقال ہو چکا تھا، یہیں شمس الدین فناوی سے میر سید شریف کی ملاقات ہوئی،[3]

مولیٰ برہان الدین احمد از رنجان کے قاضی تھے، انھوں نے علامہ تفتازانی کی "التلویح علی التوضیح" پر "التصریح" کے نام سے حاشیہ لکھا تھا، جسے نے جلدی ہی علما میں قبول عام حاصل کر لیا[4]

سلطان مراد اول کو میدان جنگ میں ایک متعصب عیسائی نے دھوکے سے ہلاک کر دیا، ان کے جانشین سلطان بایزید (۷۹۱-۸۰۶) ہوئے جو اپنی شوکت

---

[1] الشقائق ص ۲۰ [2] الشقائق ص ۲۴ [3] الشقائق ص ۲۱ [4] الشقائق ص ۲۲

داہبت کی بنا پر" ملید رحم" کہلاتے ہیں ان کا عہد بھی علماء نحاریر کے ظہور و نبوغ
کے لئے مشہور ہے، ان میں گل سرسبد مولی شمس الدین فناوی تھے، دوسرے مشہور
علماء میں مولی حافظ الدین کردری الحاج پاشا اور محی الدین کافیجی تھے،

مولی شمس الدین فناوی پہلے مولی علاء الدین اسود سے پڑھنے گئے مگر
موافقت نہ ہوسکی، لہٰذا مولی جمال الدین آقسرائی کی خدمت میں زانوئے تلمذ
کیا، لیکن ابھی فاتحۂ فراغ نہ پڑھنے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا، اسی زمانہ
میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوا میر سید شریف مولی جمال الدین کے علم و فضل کا شہرہ
سن کر ان سے استفادے کی غرض سے آئے تھے، مگر ملاقات نہ ہوسکی، بہرحال
مولی شمس الدین میر سید شریف کے ہمراہ مصر گئے جہاں مولی اکمل الدین
بابرتی سے فقہ اور مولانا محمد ابن مبارکشاہ منطقی سے معقولات پڑھی، بعدہ روم
واپس آئے، جہاں سلطان نے انھیں شہر بروصہ کا قاضی مقرر کیا، بارگاہ
سلطانی میں اتنا رسوخ تھا کہ عملاً وزیر تھے، قدرت نے دولت علم کے ساتھ
ظاہری دولت و ثروت سے بھی نوازا تھا، ایک لاکھ پچاس ہزار دینار تو
نقد ہی تھے، ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں دس ہزار جلدیں تھیں
تصانیف میں "فصول البدائع فی اصول الشرائع" سب سے زیادہ مشہور ہے، جسے
"المنار" "اصول بزدوی" "محصول امام رازی" اور "مختصر ابن حاجب" کی مدد سے
مرتب کیا تھا، میر سید شریف کی "شرح المواقف" پر بھی مواخذات کیے تھے[1] شاگردوں
میں دو بیٹوں مولی محمد شاہ اور مولی یوسف بالی کے علاوہ محی الدین کافیجی خاص

---

[1] الشقائق ص ۲۶

طور سے مشہور رہیں، مولی محی شاہ فناوی شہر بروصہ کے مدرسۂ سلطانیہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے، ان کی وفات پر ان کے بھائی مولی یوسف بالی اس منصب پر فائز ہوئے۔[1] محی الدین کافیجی جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں دستگاہ عالی رکھتے تھے[2] وہ حافظ جلال الدین سیوطی کے استاد تھے، جو ان کے علم وفضل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

مولی الحاج پاشا نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی "طوالع الانوار" کی شرح لکھی تھی، انھوں نے میر سید شریف سے پہلے قطب الدین رازی کی "شرح مطالع" پر حاشیہ لکھا تھا، جس پر بعد میں میر سید شریف نے مواخذات کیے تھے۔[3]

حافظ الدین کردری باہر سے آئے تھے، مقامی علماء میں مولی شمس الدین فناوی سے مناظرہ ہوا اور لوگوں کو اندازہ ہوا کہ مولی فناوی فروع میں اور وہ اصول میں ید طولی رکھتے ہیں، تصانیف میں "فتاوے بزازیہ" اور "مناقب امام ابی حنیفہ" مشہور رہیں۔[4] موخر الذکر کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے۔

لیکن باہر سے آنے والے علماء میں شیخ محمد ابن الجزری (۷۵۱-۸۳۳ھ) اور مجد الدین فیروز آبادی (۷۲۹-۸۱۰ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو اسلام کی ثقافتی تاریخ کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں، اول الذکر قرأت کے مستند عالم تھے[5] اور ثانی الذکر لغت کے، جس کے اندر انھوں نے "محکم ابن سیدہ" اور "عباب صغانی" کی مدد سے "اللامع المعلم العجاب بین المحکم والعباب" ساٹھ جلدوں میں لکھی

۱؎ الشقائق ص ۳۶، ۲؎ ۳۰، ۳؎ ایضاً ص ۶۰، ۴؎ ایضاً ص ۵۰، ۵؎ الشقائق ص ۳۲، ۶؎ الشقائق ص ۹

تھی بعد میں اسے دو جلدوں میں مختصر کر کے "القاموس" کے نام سے شائع کیا اس کے علاوہ قرآن کریم کی ایک تفسیر اور صحیح بخاری نیز مشارق الانوار صغانی" کی شرح لکھیں۔[1]

اس عہد کے دیگر علماء مشاہیر میں شیخ بدرالدین محمد بن اسمٰعیل شہاب الدین سیواسی (صاحب عیون التفاسیر) مولیٰ علاء الدین اسود کے صاحبزادے حسن پاشا مولیٰ صفر شاہ قطب الدین ازنیقی، بہاء الدین عمر ابراہیم بن محمد حنفی نجم الدین حنفی، یار علی شیرازی، عبد الواحد مولیٰ علاء الدین رومی شیخ رمضان، مو سے احمدی ہیں،

مزید تفصیل غیر ضروری ہے کیونکہ ہمیں صرف قاضی زادہ کے قیام وطن کے زمانہ ہی کے روم کے علمی ماحول کو بیان کرنا تھا جو ۷۹۰ھ کے بعد ختم ہو گیا کیونکہ وہ اسی زمانہ میں حصول علم کے لیے باہر تشریف لے گئے اور پھر پردیس ہی کے ہو گیے۔

بہر حال یہ تھا روم کا علمی ماحول قاضی زادہ کے قیام وطن کے زمانہ میں، اور یہاں انھوں نے ابتدا میں تعلیم حاصل کی جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے

وهو حصل فی بلادہ بعضا من العلوم[2] انھوں نے اپنے وطن میں بعض علوم حاصل کیے

کیا پڑھا کس سے پڑھا اور کب اور کہاں پڑھا، ؟ بدقسمتی سے تاریخ نے یہ تفصیلات محفوظ نہیں رکھیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تحصیل علم کیلئے سفر اسلامی ثقافت کی غیر متبدل

---

[1] الشقائق ص ۳۳ [2] الشقائق ص ۱۷

روایت رہا ہے پھر ایران میں علم و ادب کی جو نشاۃ ثانیہ ہو رہی تھی اس کی شہرت تمام عالم اسلام میں پھیلی ہوئی تھی قاضی زادہ نے بھی اس شہرت کو سنا اور اس سے متاثر ہو کر ایران کے سفر کا عزم صمیم کر لیا چنانچہ طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:-

ولما سمع صیت العلوم فی بلاد العجم عزم ان یذھب الیھا فیحصل العلوم[1]	جب انھوں نے ایران کے اندر علم و حکمت کی شہرت سنی تو حصول علم کے لئے ایران جانے کا ارادہ کر لیا

مگر انھوں نے اس ارادے سے گھر والوں کو مطلع نہیں کیا مبادا وہ انہیں روک لیں لیکن کسی طرح اس کی سن گن ان کی بہن کو مل گئی یہ تو وہ جانتی تھی کہ لیلائے علم کے اس دیوانہ کے پاؤں میں کسی کی محبت بھی زنجیر نہیں بن سکتی مگر خواہرانہ جذبۂ محبت سے مجبور تھی سب سے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں سفر میں تنگدستی کا شکار نہ ہو جائیں اس لئے چپکے سے ان کے سامان سفر میں جو کتابوں پر مشتمل ہے اپنے زیورات رکھ دئے[2]

ایران میں علم و ادب کی نشاۃ ثانیہ | بغداد پر تاتاری سفاکوں کا حملہ اور اس کا سقوط ۶۵۶ھ اسلام کی سیاسی تاریخ کے ساتھ اس کی ثقافتی تاریخ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے تاتاریوں کی چیرہ دستی سے قصر خلافت ہی منہدم نہیں ہوا عراق و خراسان میں بھی خون کی ندیاں بہہ گئیں ستم رسیدوں میں اہل سیف اور اہل قلم کی کوئی تفریق نہ رہی امرائے لشکر ہی تلوار کے گھاٹ نہیں ا

---

[1] الشقائق ص ۱۷ [2] الشقائق ص ۱۷

علمار و مشائخ پر بھی قیامت صغریٰ گذر گئی۔ شیخ سعدی نے یہ کہہ کر کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی تھی کہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین		بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

واقعہ یہ ہے کہ اس صدمہ سے مشرق وسطیٰ کی ثقافتی عظمت و رونق ہی ختم ہو گئی۔

لیکن اس دین متین میں صرصر حوادث کے تھپیڑے کھا کھا کر بھی زندہ رہنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے اور جلد ہی بقول اقبال

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ابھی ساتویں صدی ہجری ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دشمنانِ دین و ملت کی اولاد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور آٹھویں صدی کے آغاز نے ایلخانی تخت پر غازان (۶۹۴ھ-۷۰۳ھ) کو متمکن پایا جو امیر نوروز کی ترغیب سے مشرف باسلام ہو چکا تھا اس کے بعد اس کا بھائی اولجائتو سلطان اور موخر الذکر کی وفات پر اس کا بیٹا ابو سعید (۷۱۶-۷۳۶ھ) تخت نشین ہوئے، اسلام کے اثر اور مسلمان وزرا کی صحبت نے تاتاریوں کی ثقافت بیزاری کی بہت کچھ تعدیل کر دی تھی، خود دشمن اسلام ہلاکو نے محقق طوسی کی تربیت کی اور ان کی سربراہی میں مراغہ کی رصدگاہ قائم کی[1] اس کے عہد کے دیگر علما میں قطب الدین شیرازی، نجم الدین دبیران قزوینی (مصنف شمسیہ و حکمۃ العین)، مؤید الدین عرضی دمشقی، فخر الدین مراغی، محی الدین اخلاطی،

---

[1] حبیب السیر۔ جلد سوم جزو اول صفحہ ۵۹

محی الدین مغربی وغیرہم تھے؎۱ ہلاکو کے بیٹے اباقآن کا عہد حکومت مولانا رومؒ
شیخ صدر الدین قونوی، اوحدالدین کرمانی وغیرہم کے ظہور ونبوغ کا زمانہ
ہے؎۲ اباقآن کے بعد احمد تگودار اور پھر ارغون بادشاہ ہوئے، ان کے زمانہ
میں رضی الدین شاطبی، قاضی ناصر الدین بیضاوی (مصنف تفسیر انوار التنزیل،
طوالع الانوار منہاج الاصول) جمال الدین محمد بن سلیمان مقدسی، نجم الدین زرکوب
مشاہیر فضلاء عہد میں سے تھے؎۳

لیکن ایلخانی عہد میں اسلامی ثقافت کی تجدید ونشاۃ ثانیہ غازان نے کی،
اس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، اور رصدگاہ مراغہ کی مرمت
کرائی؎۴ اس کے جانشین اولجائتو سلطان نے بھی علمی سرپرستی کی روایات کو جاری
رکھا، علم وحکمت کی نشر واشاعت سے اسے یہ شغف تھا کہ اپنے ہمراہ سفر میں بھی
ایک مدرسہ رکھا کرتا جو خیموں میں لگا کرتا تھا؎۵ اس کے عہد کے مشاہیر علماء
میں شیخ جمال الدین حلی، شیخ عبد الرحمن خراسانی، مولانا قطب الدین محمود، شہاب الدین
عبد اللہ شیرازی (مصنف تاریخ وصاف) ابو سلیمان فخر الدین داؤد بناکتی،
(مصنف تاریخ بناکتی) محمد بن اسعد بن عبد اللہ الحنفی خاص طور سے قابل ذکر ہیں؎۶
اولجائتو سلطان کے جانشین ابو سعید کا زمانہ قاضی عضد الدین ایجی کے لیے
مشہور ہے، ان کا سلسلۂ تلمذ قاضی ناصر الدین بیضاوی کے توسط سے امام غزالی
تک پہونچتا ہے؎۷ حسب تصریح حمد اللہ مستوفی بعض لوگ انھیں قرن ہشتم کا مجدد ملت

؎۱ حبیب السیر صفحہ ۶۱-۶۲ ؎۲ حبیب السیر صفحہ ۶۶-۶۷ ؎۳ حبیب السیر صفحہ ۷۰-۷۷ ؎۴
حبیب السیر جزاول صفحہ ۱۰۶-۱۰۸ ؎۵ حبیب السیر صفحہ ۱۱۲ ؎۶ حبیب السیر صفحہ ۱۱۰-۱۱۱
؎۷ مراۃ الجنان الجزء الرابع ص ۲۲۰

قرار دیتے ہیں[1] خواجہ حافظ انھیں ابو اسحٰق (جو ابو سعید کے بعد شیراز کا بادشاہ ہوگیا تھا) کے دربار کے پانچ رتنوں میں سے ایک رتن بتاتے ہیں۔

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در بیش　　بنائے کار "مواقف" بنام شاہ نہاد

ہندوستان سے محمد تغلق نے مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا تھا کہ کسی طرح قاضی عضد کو ہندوستان لے آئیں[2] مگر ابو اسحٰق نے قاضی عضد سے کہا کہ سوائے بیوی کے میرے پاس جو کچھ ہے آپ کے لیے حاضر ہے حتی کہ تخت سلطنت بھی[3] مگر آپ یہاں سے تشریف نہ لے جائیں۔ لہذا وہ نہیں رہ گئے[4] انھوں نے "المواقف فی الکلام" کو بھی ابو اسحٰق ہی کے نام معنون کیا حالانکہ محمد تغلق نے چاہا تھا کہ کم از کم وہ اس کتاب ہی کو اس کے نام معنون کر دیں[5] تصانیف میں "المواقف" کے علاوہ "عقائد عضدی" "شرح مختصر ابن حاجب (اصول فقہ میں) اور "الفوائد الغیاثیہ" (بلاغت میں) مشہور ہیں۔ قاضی عضد نے ۷۵۶ھ میں وفات پائی۔ بے شمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا مگر شہرت علامہ سعد الدین تفتازانی ہی کو نصیب ہوئی[6] دوسرے مستفیدین میں قطب الدین رازی کا نام سرفہرست ہے[7] ان کا سلسلۂ تلمذ بقول قاضی نور اللہ شوستری (مجالس المومنین میں) علامہ حلّی کے توسط سے[8] اور بقول امام الدین ریاضی (تذکرہ باغستان میں) قطب الدین شیرازی کی وساطت سے محقق طوسی تک پہونچتا ہے[9] جو پانچ واسطوں سے شیخ بو علی سینا کے شاگرد تھے[10] قطب الدین رازی

[1] تاریخ گزیدہ ص ۸۰۸ [2] اخبار الاخیار ص ۱۵۰ [3] سبحۃ المرجان ص ۳۷ [4] شرح مواقف ص ۲۰ [5] شذرات الذھب جزء سادس ص ۳۲۱ [6] ایضاً ص ۱۸۶ [7] مجالس المومنین ص ۳۳۲ [8] تذکرہ باغستان ورق ۷۳ ب و ۷۴ الف [9] مجالس المومنین ص ۳۴۹

کے خاص شاگرد محمود ابن مبارک شاہ منطقی تھے۔ موخر الذکر کے شاگرد میر سید شریف جرجانی تھے[1] میر سید شریف نے "المواقف" بھی انھیں سے پڑھی تھی[2] اس طرح ان کی ذات میں فلسفہ وحکمت اور اشعری علم کلام دونوں کے سلسلے آکر مل گئے۔

ویسے شیعی علم کلام، تصوف، حکمت مشائیہ اور فلسفہ اشراق چاروں کے سلسلے محقق طوسی کے یہاں آکر مل چکے تھے[3] حالانکہ ابن خلدون کا خیال ہے کہ فلسفہ اور کلام دونوں کے فکری دھارے سب سے پہلے قاضی ناصر الدین بیضاوی کے یہاں آکر ملے تھے[4]

ابو اسحٰق کے قتل کے بعد فارس کی حکومت امیر مبارز الدین کے ہاتھ آئی، جس نے ۷۶۵ھ تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع اس کا جانشین ہوا۔ شاہ شجاع زیور علم و ادب سے آراستہ تھا اور علما اور فضلا کا قدر دان۔ اس کا دربار مجمع افاضل عصر بن گیا تھا چنانچہ صاحب "روضۃ الصفا" لکھتے ہیں:

"در مبادی حال و اوائل اشتغال بہ نیل مشکلاتے کہ اذہان منتہیان از درک آں قاصر بودند متہدی گشت و از ارتقائے رودۂ علوم سنیہ و معارف یقینیہ بدرجۂ رسید کہ پیوستہ فضلائے دانشور و علمائے فضل گستر بمجلس ہمایونش راہ می یافتند از لطائف خاطر قدسی صفاتش محظوظ و بہرہ مند گشتہ زبان استعجاب و استغراب می کشادند۔" (روضۃ الصفا جلد چہارم ص ۱۹۱)

ان علمائے فضل گستر میں اہم شخصیت مولانا قوام الدین عبداللہ فقیہ کی تھی

---

[1] الشقائق النعمانیہ ص ۱۶۷ [2] الضوء اللامع: الجزء الخامس ص ۳۲۹ [3] نذر عرشی تجرید محقق طوسی ص ۲۲۔۲۵ [4] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۹

جن سے بادشاہ نے قاضی عضد کی شرح مختصر ابن حاجب کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا[1]

مگر شاہ شجاع کے عہد کے علماء میں سب سے زیادہ قبول عام و بقائے دوام کا شرف قسام ازل نے میر سید شریف کو بخشا تھا۔ وہ مصر سے تعلیم مکمل کرکے (جہاں انھوں نے مولیٰ شمس الدین فناری اور دیگر فضلائے روم کے ہمراہ فقہیات شیخ اکمل الدین بابرتی سے اور معقولات بالخصوص شرح مطالع و شرح حکمۃ العین مولانا محمد ابن مبارکشاہ منطقی سے پڑھے تھے) ۷۷۹ھ میں شیراز آئے اور پہلی ہی ملاقات میں بادشاہ کو متاثر کرکے علمائے عہد کے گل سرسبد بن گئے[2] مگر دس سال بعد جب ۷۸۹ھ میں تیمور نے شیراز پر حملہ کیا تو زر و جواہر اور دیگر نوادر کی طرح انھیں بھی سمرقند لے گیا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

آٹھویں صدی ہجری کا یہ ایران تھا جس کے اندر قاضی زادہ پہونچے اور علمائے خراسان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا:

فارتحل الی بلاد العجم و	پس وہ سفر کرکے ایران پہونچے اور
قرأ علی مشائخ خراسان[3]	وہاں فضلائے خراسان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا

مگر غالباً تیمور یہاں سے بھی دوسرے ممالک مفتوحہ کی طرح مختلف علوم و فنون کے باکمالوں کو اپنے پایۂ تخت لے گیا تھا اور اس لیے قاضی زادہ کو کوئی ایسا فاضل استاد نہ مل سکا جو ان کی علمی تشنگی کو آسودہ کرسکتا اس لیے اب وہ ماوراء النہر کے لیے روانہ ہوئے جہاں تیمور نے اقطاع عالم کے باکمالوں کو جمع کر رکھا تھا۔ (باقی)

---

[1] حبیب السیر جلد سوم جزء دوم ص ۱۳۰ [2] حبیب السیر جلد سوم جزء سوم ص ۹۵ [3] الشقائق ص

امیر خسرو اور افضل الفوائد

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

افضل الفوائد میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زبانی ان کے مرشد سے متعلق جو بعض باتیں ہیں وہ ان ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں، یہ اور دوسرے ملفوظات میں نہیں ملیں گی، مثلاً

ایک موقع پر فرمایا کہ ایک بار شیخ الاسلام فرید الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز بیٹھے تھے کہ سات درویش آئے، ان میں ہر ایک کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا، ان کے سامنے میوہ کے ساتھ کھانا رکھا گیا، ہر ایک نے اقرار کیا کہ ہم لوگ بیس سال سے ایک مرد خدا کی طلب کر رہے تھے، کسی کو نہیں پایا، مگر خواجہ جی کو پالیا (ص ۱۶)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین کو انگور بہت پسند تھا، ایک بار حالت تفکر میں تھے کہ نفس کا تقاضا ہوا کہ انگور کھالیں، اسی وقت قسم کھالی کہ جب تک میں زندہ ہوں، اپنے نفس کی اس آرزو کو پورا نہ کروں گا، مولانا بدر الدین شیخ الاسلام کی صحبت میں رات دن رہتے تھے،

انھوں نے بھی قسم کھالی کہ شیخ کی زندگی میں انگور نہ کھائیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے نفس پر غالب آجائیں (ص ۹۷)

ایک مجلس کے ذکر میں ہے کہ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین کا معمول تھا کہ جب وہ عالم تحیر میں ہوتے تو ایک روز میں ہزار سجدے کرتے پھر اٹھتے یہاں تک کہ انکی چشم مبارک سے خون رواں ہو جاتا اس وقت عالم صحو میں آتے (ص ۹۹)

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ مولانا بدر الدین اسحٰق نے بتایا کہ وہ ایک بار شیخ الاسلام فرید الحق والدین کے ساتھ سفر میں تھے، وہ ایک دریا کے کنارے پہونچے، وہاں کوئی کشتی نہ تھی، شیخ الاسلام نے میری طرف نظر کی اور بولے کہ میرے اور اپنے جوتے ہاتھ میں لو اور آؤ پانی کے اندر داخل ہوجاؤ اپنی آنکھوں کو سامنے رکھو، میں نے ایسا ہی کیا، مجھ پر ایسی دہشت طاری تھی کہ میں کچھ بول نہیں سکتا تھا، ہم لوگ اپنی منزل پر پہونچ گئے، تو میں نے پوچھا یہ کیسے ہوا، فرمایا کہ سورہ مزمل پڑھ کر پانی پر پھونک دیا، پھر اس کے اندر راہ مل گئی (ص ۱۰۵)

نفل نمازوں کی برکتیں تو بہت ہی جزوی تفصیلات کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے شیخ الاسلام فرید الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز سے سنا کہ جو شخص ہر مہینہ یہ نماز پڑھے تو اس کا درجہ بہشت میں اعلیٰ ہو، وہ نماز یہ ہے کہ چار رکعت کی نماز ایک سلام میں پڑھے، ہر رکعت میں الحمد اللہ ایک بار پھر جو سورہ یاد ہو پڑھے پھر اٹھارہ بار سبحان اللہ ثمین

بار سبحان ربی العظیم اور دس بار سبحان اللہ کہہ کر سر اٹھائے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہے، دس بار سبحان اللہ اور الحمد للہ آخر تک کہے، حالت قومہ اور تحیت سجود میں دس بار سبحان اللہ کہے، اس کے بعد سجدہ میں جائے سبحان ربی الاعلیٰ تین بار اور دس بار سبحان اللہ پڑھے، پہلے سجدہ سے سر اٹھائے تو گیارہ بار سبحان اللہ کہے، دوسرے سجدہ میں اسی طرح دس بار سبحان اللہ کہے، اسی ترتیب کے ساتھ پوری نماز ادا کرے (ص ۲۱)

افضل الفوائد میں جس وضاحت اور جزوی تفصیلات کے ساتھ حضرت فریدالدین گنج شکر کی رحلت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ کسی اور مجموعۂ ملفوظات میں نہیں، ناظرین ملاحظہ کریں۔

ایک سال ۵ محرم کو خواجہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین کا عرس تھا مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا برہان الدین غریب، شیخ عثمان سیاح، شیخ حسین نبیرہ، شیخ قطب الدین بختیار اودھی مولانا زرادی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا نصیر الدین کتابی، حسن علا سجزی اور دوسرے عزیز خدمت میں حاضر تھے، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے شیخ فرید کی بزرگی اور اخلاق پسندیدہ کی باتیں شروع کیں تو رونے لگے، تمام حاضرین پر بھی اثر پڑا اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ حضرت خواجہ فرید نے ۵ محرم کو وفات پائی جس رات کو خواجہ کبیر کی رحلت ہوئی، بندہ کو یہ کہہ کر یاد کیا کہ مولانا نظام الدین نہیں ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ جب ان کی وفات کی ساعت قریب آئی تو وہ اٹھے، کھڑے ہوئے صبح سے چاشت تک پانچ بار قرآن

گیا اس کے بعد ذکر میں مشغول ہوئے اتنا ذکر کیا کہ جسم سے خون رواں ہو گیا،
قطرہ زمین پر گرتا اس سے اللہ کا نقش ظاہر ہوتا یہ رباعی پڑھ کر سجدہ کیا اور
سر اٹھالیا'

اے خوش تو ز پیرہن می شنوم شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
ہیچ نباشد کہ کسے بہ نشا نم تا نام تو می گوید و من می شنوم

اس کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، لوگ شیخ کے گرد جمع ہوئے تو ان
کی طرف مخاطب کر کے کہا کہ وہ سب باہر بیٹھ جائیں جب میں بلاؤں تو آئیں سب
باہر بیٹھ گئے' کچھ دیر کے بعد آواز آئی کہ یہی وقت ہے کہ دوست دوست سے ملے'
یہ سن کر سب اندر چلے آئے' تو خواجہ کو دیکھا کہ وہ کسی اور ہی عالم میں ہیں عشاء کی
نماز کا وقت ہوا تو چار بار نماز پڑھی' اس کے بعد سر بسجود ہو گئے اور اپنی روح
حق کے حوالے کر دی پھر آواز بلند ہوئی، جو وہاں کے تمام لوگوں نے سنی کہ ایک
امانت روئے زمین پر تھی، اب وہی امانت خدا کے سپرد ہو گئی' جب یہ باتیں ختم
کیں تو پوری مجلس سے ہائے کا نعرہ بلند ہوا، اور ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ
کسی وقت ایسی نہیں ہوئی تھی (ص ۱۲۲-۱۲۱)

اعتراض تھا کہ افضل الفوائد میں وضاحت اور جزوی تفصیلات کے ساتھ
باتیں نہیں کہی گئی ہیں، اوپر حضرت فرید گنج شکرؒ کی رحلت وضاحت اور جزوی
تفصیلات سے بیان کی گئی ہے تو اعتراض ہے کہ اس میں بعض باتوں کے الحاقی
ہونے کا شبہ ہے، کیونکہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ
نے اپنی ان مجلسوں میں بیان نہیں کیں' جو ملفوظات کی دوسری کتابوں میں

ملتی ہیں۔ (ص ۸۶)

اور اگر اس کی نشاندہی کر دی جائے کہ فوائد الفواد میں بھی ایسی باتیں ہیں جو دوسروں کی نظروں میں مبالغہ آمیز معلوم ہوں تو کیا افضل الفوائد کو مستند تسلیم کر لیا جائے گا پھر فوائد الفواد سے ایسی کچھ باتوں کی مثالیں یہ ہیں:۔

فرمایا کہ قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کعبۂ مبارک کا طوا[ف] کر رہے تھے، تو انھوں نے ایک بزرگ کو طواف میں دیکھا، وہ ان کے پیچھے ہو گ[ئے] جہاں وہ قدم رکھتے تھے تو اسی جگہ وہ بھی اپنا قدم رکھتے تھے، ان پیر روشن[...] یعنی بزرگ نے یہ دیکھ کر کہا کہ میری ظاہری متابعت کرتے ہو، میری و[...] متابعت کرو جو میں کرتا ہوں، قاضی حمید الدین علیہ الرحمۃ نے پوچھا آپ کیا ک[...] ہیں، پیر صاحب نے فرمایا کہ میں ہر روز سات سو بار قرآن ختم کرتا ہوں، [...] حمید الدین کو سخت تعجب ہوا اور وہ سوچنے لگے کہ قرآن کے معانی کو خیال [...] لاتے ہوں گے اور خیال ہی میں پڑھتے ہوں گے، لیکن پیر صاحب نے کہا لفظ [...] پڑھتا ہوں، خیال میں نہیں پڑھتا ہوں، جب خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے یہ حکا[یت] ختم کی تو اعز الدین علی شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ جو خاص مریدوں میں ایک تھے، و[...] موجود تھے، انھوں نے کہا یہ تو کرامت ہی ہے، خواجہ نے فرمایا کہ ہاں کرا[مت] ہے، جو معاملہ عقل میں نہ آئے وہ کرامت ہی ہوتی ہے (فوائد الفواد ص [...]

فرمایا ایک بادشاہ بہت ہی صلاحیت والا اور صاحب کشف تھا، [...] تخت پر بیٹھا تھا، اس کی نظر اپنے اصطبل کی طرف بھی جاتی تھی، اس کی ملکہ[...]

،کے پہلو میں تخت پر بیٹھی تھی اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور دیر تک
،کی طرف آنکھ لگائے رکھی پھر اپنے اصطبل کی طرف دیکھا پھر ادھر کی طرف نظر
دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا اس کے بعد اپنی ملکہ کو دیکھا اور رونے
ملکہ نے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ آپ نے دیر تک آسمان کو دیکھا پھر اصطبل کی طرف
نظر کی اور پھر آسمان کو دیکھا پھر میری جانب دیکھ کر رونے لگے؟ بادشاہ نے
ہا کہ اس سوال کو چھوڑ دو یہ کہنے کے لائق نہیں ہے ملکہ نے اصرار کیا کہ ضرور بتا ئیے
بادشاہ نے کہا اب تم اصرار کرتی ہو تو کہتا ہوں، اس کے بعد بولا کہ تو سنو اس
وقت میری نظر لوح محفوظ پر گئی، دیکھتا ہوں کہ میرا نام زندوں کی فہرست سے
نکال دیا گیا ہے میں سمجھ گیا کہ میرے جانے کا وقت آگیا، دوسری بار دیکھا اور
خیال آیا کہ میری جگہ کون ہوگا تو ایک حبشی نظر آیا جو اس اصطبل میں ہے وہ
میری جگہ ہوگا اور تو اس کے نکاح میں آئے گی (فوائد الفواد ص ۲۸۳ - ۲۸۲)
اور یہی ہوا۔

فرمایا کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنی کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک
جوان تھا اسے قزوینی کہتے تھے، اس کے گھر میں مردانِ غیب جمع ہوا کرتے تھے،
نماز کے وقت لوگ صف در صف کھڑے ہوتے، مردان غیب میں ایک شخص
امامت کرتا، جماعت بلند قرأت، تسبیحات اور جو کچھ نماز میں ہوتا سنتی لیکن
اسے نہ دیکھتی، بس وہ قزوینی ہی دیکھتا، شیخ شہاب الدین نے فرمایا کہ ان ہی
مردانِ غیب میں ایک نے قزوینی کے ہاتھ ایک مہرہ میرے پاس بھیجا تھا اور
وہ مہرہ ابھی تک میرے پاس ہے...... اس کے بعد فرمایا کہ مردان غیب

پہلے آواز دیتے ہیں، اور اپنی آواز سناتے ہیں، اس کے بعد ملاقات کرتے ہیں، پھر اڑا لے جاتے ہیں، آخر میں زبان مبارک سے فرمایا کہ یہ راحت کا کیسا مقام ہے، جہاں وہ کسی کو لے جاتے ہیں' (ص ۲۵)

فوائد الفواد میں جو یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ سورہ یٰسین پڑھ کر امام ناصری مر کر اور دفن ہو جانے کے بعد قبر سے باہر زندہ نکل آئے، اس کی تفصیل تو افضل الفوائد کی روایتوں سے زیادہ حیرت انگیز ہے (ص ۶۰)

ایک اعتراض یہ ہے کہ افضل الفوائد میں بہت سے مضامین وہ ہیں جو دوسری کتابوں میں تقریباً اسی انداز سے بیان ہوئے ہیں (ص ۸۴) لیکن اس سے پہلے یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ افضل الفوائد اور فوائد الفواد دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق نظر آئے گا (ص یعنی افضل الفوائد میں وہ باتیں نہیں ہیں جو فوائد الفواد میں ہیں، اور پھر بھی کہ وہی باتیں دہرادی گئی ہیں، اس دلیل کی تائید میں فوائد الفواد سے دو مثالیں دی گئی ہیں، ایک تو شمس الدین ایلتتمش کی سیرت سے متعلق ہے، جس ذکر پہلے آچکا ہے، اور اس میں یہ دکھایا جاچکا ہے کہ اگر اس روایت عبارت فوائد الفواد سے سرقہ کی جاتی تو اس کے الفاظ بالکل ملے جلے دوسری روایت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے متعلق ہے، ہم یہاں پر افضل اور فوائد الفواد دونوں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں،

افضل الفوائد	فوائد الفواد
ہم دریں محل ابن حکایت فرمود کہ	آن نگاہ ہم از نسبت صدق وو

جہودے دیگر ہمسایہ خواجہ بایزید
بود او را گفتند کہ مسلمان چرا نمی
شوی او جواب داد کہ اگر مسلمانی
انیست کہ بایزید می کند من
نمی توانم کرد و اگر انیست کہ
شما می کنید ازیں ننگ دارم
(ص ۲۵)

در اسلام و اسلامیان حکایت فرمود
کہ جہودی در جوار خانۂ بایزید بسطامی
قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت،
چون خواجہ بایزید نقل کرد آن
جہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمی
شوی؟ جہود گفت چہ مسلمان شوم
اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت
آن اسلام از من نیاید و اگر انیست کہ شما
دارید مرا ازیں اسلام عار می آید
(ص ۳۰۸)

یہ روایت جیسا کہ معترض کا بھی بیان ہے کہ خواجہ فریدالدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیاء میں اس طرح ہے:

"گبرے را گفتند کہ مسلمان شو گفت اگر مسلمان است کہ بایزید می کند من طاقت ندارم، و نتوانم کرد، اگر انیست کہ شما می کنید بدین ہیچ اعتبار ندارم"

اگر کوئی عیب جو ناقد یہ کہے کہ فوائد الفواد کی روایت بھی جعلی ہے، کیونکہ تذکرۃ الاولیاء کی روایت کچھ اور ہی ہے تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے گا؟ پھر فوائد الفواد اور افضل الفوائد میں مذکورۂ بالا روایت کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی کیا جائے کہ دونوں میں یہ روایت کس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے تو فوائد الفواد سے یہ روایت مستعار لینے کا شبہہ ہی نہیں پیدا ہوگا۔ فوائد الفواد میں یہ بات حضرت

مرغ کے زمانہ کے عراق کے ایک بادشاہ کی فراست اور دانائی کے ذکر کے بعد کی گئی ہے لیکن افضل الفوائد میں یہ روایت حقوق ہمسایہ میں بیان کی گئی ہے اگر یہ وضاحت اور جزدی تفصیلات ناظرین کے لیے گراں نہ ہوں تو اس کا سیاق وسباق ملاحظہ ہو۔

حقوقِ ہمسایہ پر گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ کو ہمسایہ سے متعلق اتنی نصیحتیں کیں کہ گمان ہونے لگا کہ کہیں ہمسایہ کو مال میں بھی وراثت کا حق نہ ہو جائے، اس کے بعد حضرت خواجہ نے فرمایا کہ تذکرۃ الاولیا میں لکھا ہوا دیکھا کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کے ہمسایہ میں ایک یہودی رہتا تھا وہ کسی سفر پر چلا گیا اس کی بیوی کو حمل تھا بچہ پیدا ہوا تو اس عورت کے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اس سے اپنا چراغ جلائے بچہ تاریکی میں رویا کرتا تھا جب یہ خبر حضرت بایزید بسطامیؒ کو ہوئی تو وہ ہر رات دوکان سے تیل لاکر اس یہودی عورت کو دیتے جب وہ یہودی سفر سے واپس آیا تو اس کی بیوی نے یہ تمام کیفیت بیان کی وہ یہودی شرمندہ ہوا حضرت بایزید کی خدمت میں پہونچا اور پوچھا کہ آپ نے اتنا لطف وکرم کیوں کیا؟ جواب دیا کہ ہمسائگی کے سبب سے کیونکہ ہمسایہ کا حق بہت بڑا ہے اس کے بعد وہ یہودی مسلمان ہوگیا اسی کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے یہ حکایت بیان کی کہ خواجہ بایزید کا ایک دوسرا یہودی بھی ہمسایہ تھا اس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں مسلمان ہوتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ اگر مسلمانی

وہی ہے جس پر بالیقین عمل کرتے ہیں تو میں اس پر عمل نہیں کر سکتا ہوں، اور اگر مسلمانی وہ ہے جو تم کرتے ہو تو اس سے شرم آتی ہے۔"

اگر ذہن صاف ہو تو پھر افضل الفوائد میں جس سلسلہ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے اس سے یہ شبہہ نہیں پیدا ہوتا ہے کہ یہ فوائد الفواد سے لی گئی ہو، خصوصاً جب تذکرۃ الاولیا کا حوالہ صاف طور پر موجود ہے۔

اسی طرح یہ اعتراض ہے کہ افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مرتبہ مولانا کیتھلی میرے پاس آئے کھانا موجود تھا، بشیر کو کہا کہ لاؤ اس نے لانے میں دیر کر دی، میرے پاس ایک چھوٹی چھڑی تھی، اس کی پیٹھ پر ماری، مولانا کیتھلی نے اس طرح آہ کی گویا انہیں کی پیٹھ پر لگی ہے، میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری، فوراً پیٹھ سے کرتا اتار کر مجھے دکھایا، جب میں نے نگاہ کی تو اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا، یہ واقعہ سیر الاولیاء وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے"

(ص ۸۴)

میرے سامنے افضل الفوائد کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا، مگر فوائد الفواد (۱۱۲) اور سیر الاولیا (ص ۲۴۵) میں یہ ملفوظات ہیں، سیر الاولیاء کی روایت تو فوائد الفواد ہی سے تقریباً لفظ بہ لفظ مستعار ہے مگر افضل الفوائد میں جو روایت بیان کی گئی ہے، وہ کچھ مختلف ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ بشیر میرا خدمت گار ابھی بچہ ہی تھا، اس نے بے ادبی کی تو اس کو ایک چھڑی ماری گئی، مولانا کیتھلی نے ایسے درد کا اظہار کیا کہ تم کہو گے کہ وہ چھڑی ان ہی کو ماری گئی، وہ رونے لگے اور بولے کہ میری

شومیت کی وجہ سے یہ المنا کی ہوئی، فوائد الفواد کی روایت میں یہ نہیں ہے کہ میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری؟ فوراً پیچھے سے کرتا اٹھا کر مجھے دکھایا، جب میں نے نگاہ کی تو دیکھا اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا، اتنا ٹکڑا سیر الاولیا میں بھی نہیں ہے، اگر یہ ملفوظات فوائد الفواد اور سیر الاولیا سے سرقہ کیے گئے ہیں تو اتنے ٹکڑے کو کس معلوت سے بڑھایا گیا؟ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت خواجہ نے اپنی مجلس میں اس واقعہ کو اس طرح دہرایا! جس طرح کہ افضل الفوائد میں منقول ہے؟ پھر سیر الاولیاء اور فوائد الفواد کی عبارتوں میں بھی کچھ تھوڑا سا فرق ہے، فوائد الفواد میں ہے۔

"بیشتر کہ خدمت گار منت، ہنوز طفل بود مگر او بے ادبی کرد،

سیر الاولیا میں ہے۔

بیشتر خدمتگاران پیش من جمع شدہ بودند، یکے ازان بے ادبی کرد"

دونوں عبارتوں میں جو تھوڑا اختلاف ہے اس کے متعلق ایک خردہ گیر ناقد کی کیا رائے ہو سکتی ہے،

افضل الفوائد اور فوائد الفواد کی ملی جلی روایت کی ایک مثال کی اور نشاندہی کی گئی ہے، دونوں عبارتیں ملاحظہ ہوں،

افضل الفوائد	فوائد الفواد
بعد ازاں فرمود کہ شنیدہ ام از زبان شیخ الاسلام فرید الحق والدین	حاضر ایں سخن حکایت فرمود کہ در آنچہ خروج کفار تتار شد

قدس اللہ سرہ العزیز کہ وقتے
در نیشاپور مغل در آمد
و جملہ نیشاپور را گرد گرفت خلیفہ آن
شہر کس را نزد خواجہ فرید الدین
عطار فرستاد و گفت بر وید و بگوئید
کہ دعا کنید، خواجہ فرمود کہ کار دعا
گذشت بلائے خدا را ساختہ باید تعذر
این ست، ید علے تقدیر را بدل نتواند
کرد، پس رضا باشد بہرچہ تقدیر
است خدائے را (ص ۹)

چوں بلائے مغل بہ نیشاپور رسید
بادشاہی کہ آنجا بود کس بہ شیخ
فرید الدین عطار فرستاد قدس اللہ
سرہ العزیز کہ دعائے بکن او جواب
گفت کہ وقت دعا گذشت، وقت
رضا است یعنی بلائے خدا نازل
شد تن برضا باید داد، بعد ازاں
فرمود کہ بعد از نزول بلا ہم دعا
باید کرد، اگرچہ بلا دفع نشود اما
صعوبت بلا کم شود (ص ۸۹)

سیرالاولیاء میں بھی یہ ملفوظات ہیں جو اس طرح درج ہیں۔
"ملا ئم این حکایت فرمود چوں نداے بلاے مغل نیشاپور رسید
حاکم آنجا کس بر شیخ فرید الدین عطار فرستاد کہ دعا بکن او جواب
گفت وقت دعا گذشت، اکنوں وقت رضا ست، بعد ازاں فرمود
کہ بعد نزول بلا ہم دعا باید خواند، اگرچہ بلا دفع نشود اما صعوبت
بلا کم شود، و بعد ہٗ فرمود چوں بلا نازل شد باید کہ ازاں بلا
ہیچ کراہیت ندارد (ص ۲۴۴)
ان تینوں کتابوں میں جو یہ ملفوظات نقل کیے گئے، ان کے سیاق و سباق
کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے، افضل الفوائد میں یہ ملفوظات اس گفتگو کے

موقع کے ہیں جب مجلس میں اس کا ذکر تھا کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ بدلا نہیں جاسکتا، فوائد الفواد میں یہ ملفوظات اس موقع کے ہیں جب یہ ذکر تھا کہ نزول بلا سے پہلے کی دعا قبول ہوتی ہے، سیر الاولیا میں یہ ملفوظات ادعیۂ ماثورہ کے بیان کے سلسلہ میں درج ہیں پھر سیر الاولیا اور فوائد الفواد کے کچھ الفاظ تو مشترک ہیں، مگر افضل الفوائد کے ملفوظات معنًا تو یکساں ہیں، لیکن لفظاً مختلف ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہو سکتا ہو کہ یہ عبارتیں فوائد الفواد یا سیرالاولیا سے سرقہ نہیں کی گئی ہیں، پھر افضل الفوائد میں خلیفہ، فوائد الفواد میں بادشاہ اور سیر الاولیا میں حاکم کیوں درج ہے، اس اختلاف کی وجہ کیا بتائی جاسکتی ہے. کیا یہ دلیل قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس روایت کو بیان کرتے وقت خود حضرت خواجہ کی زبان مبارک سے مختلف مجلسوں میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا۔

افضل الفوائد اور فوائد الفواد دونوں میں شیخ فریدالدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیا سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، ان ہی میں افضل الفوائد کی ایک روایت کا اردو ترجمہ منادی کے امیر خسرو نمبر کے ص ۸۶ پر درج ہے، جس کا فارسی متن یہ ہے۔

"بعد ازاں سخن در برکت یا نقل خواجہ حسن بصری حکایت فرمود کہ خواجہ حسن طفل بود، روزے در کوزہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آب بخورد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرسید کہ ازیں کوزہ آب کہ خورد، گفتند حسن، چنانچہ ازیں کوزہ آب بخورد علم بروسرایت کند (افضل الفوائد قلمی نسخہ ص ۱۶۴)

یہ روایت تذکرۃ الاولیا میں اس طرح درج ہے۔

نقل است کہ حسن طفل بود یک روز از کوزہ پیغامبر علیہ السلام آب خورد در خانۂ ام سلمہؓ پیغامبر گفت علیہ السلام این آب کہ خورد گفت چندانک ازین آب خورد علم من بدو سرایت کند (ص ۲۴)

افضل الفوائد اور تذکرۃ الاولیا کی روایتیں معناً ایک ہیں مگر لفظاً ایک نہیں ہیں، جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرۃ الاولیا سے نقل نہیں کری گئی ہیں بلکہ یہ زبانی دہرائی گئیں جو اسی طرح قلمبند کر لی گئیں،

افضل الفوائد میں یہ بھی روایت بیان کی گئی ہے کہ

مادر خواجہ حسن بصری از موالی حضرت ام سلمہؓ بود چون مادرش بہ مشغول شدی خواجہ حسن بگریستی کہ ہنوز شیر نمی خورد ام سلمہؓ پستان شریفہ خود در دہان او نہادی تا بمکیدی و قطرہ شیر پدید آمدی، بعد ازان خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بر لفظ مبارک راند کہ چون ہزار برکت کہ حق تعالیٰ در وی پدید آورد آن از برکت او بود (ص ۶۴)

تذکرۃ الاولیا میں یہ روایت اس طرح درج ہے۔

مادر او از موالی ام سلمہؓ بود، چون مادرش بہ کاری مشغول شدی، حسن در گریہ آمدی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا پستان خود در دہانش نہادی تا او بمکیدی، قطرۂ چند شیری پدید آمدی، چندان

ہزار برکات کہ حق از وی دید آوردہ از اثر شیرام سلطہ بود (ص ۲۳)

یہ روایت بھی معناً ایک ہے لیکن تذکرۃ الاولیا سے نقل کی ہوئی نہیں ہے کیونکہ اس کو بیان کرنے سے پہلے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے یہ فرمایا:

"سخن در بزرگی شیخ معین الدین سجزی افتاد، حکایت فرمود کہ آں روز کہ شیخ معین الدین بخدمت شیخ عثمان ہارونی نوراللہ مرقدہٗ پیوست و بیعت آورد و نیز بر فوائد کہ از زبان گوہر بیان شیخ می شنید آں را بقلم آورد، چنانچہ ایں حکایت در بزرگی خواجہ بصری درآں فوائد نبشتہ دیدہ ام" (ص ۱۶۳)

اس سے ظاہر ہے کہ خواجہ حسن بصری سے متعلق چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ایسی روایتیں برابر بیان کی جاتی رہیں جو غالباً تذکرۃ الاولیا ہی کی ہوتیں، تذکرۃ الاولیا کی ان ضعیف روایتوں کے دہرانے اور ان کو ملفوظات کے کسی مجموعہ میں قلمبند کرنے سے پورا مجموعہ جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ صوفیائے کرام کی جلسوں میں اثر پیدا کرنے کی خاطر موضوع حدیثوں کے ساتھ غیر مستند روایتوں کا سہارا بھی لے لیا جاتا

افضل الفوائد اور فوائد الفواد میں مشترکہ اشعار کے ہونے سے یہ دلیل فراہم نہیں کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ فوائد الفواد سے سرقہ ہے، اگر فوائد الفواد کے اشعار در نظامی میں پائے جاتے ہیں تو وہ فرضی نہ سمجھے جائیں، لیکن وہی اشعار افضل الفوائد میں پائے جائیں تو یہ مسروقہ قرار دیئے جائیں، یہ عجب منطق ہے، اشعار کے غلط نقل ہونے کی مثالیں گذشتہ اوراق میں آ چکی ہیں، اس لئے وزن کی غلطیاں بھی ملفوظات کے فرضی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتیں، اگر مختلف نسخوں

اللہ کیا جائے تو یہ سارے شکوک آسانی سے رفع ہو سکتے ہیں،
یہ اعتراض بھی صحیح نہیں کہ افضل الفوائد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی
تسمیہ غلط بتائی گئی ہے، معلوم نہیں کاکی کی وجہ تسمیہ کتنی بتائی گئی ہو اور اب
یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی صحیح ہے۔
شروع کے خواجگان چشت کے ساتھ افضل الفوائد پر یہ بھی اعتراض
کہ ان جعلی ملفوظات کی تاریخیں بھی اکثر غلط ہیں، اس کا یہ جواب کیا قابل
دل ہو سکتا ہے کہ طبقات ناصری بہت اہتمام سے لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں بہت
سنین صحیح نہیں ہیں تو کیا پھر طبقات ناصری جعلی قرار دی جائے گی تاریخ فرشتہ
ہا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غزنین سے لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے
وقت اجمیر آئے جب کہ سید حسین مشہدی المشہور بہ جنگ سوار اجمیر کے داروغہ
تھے اور تاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ بتائی ہے جو یقیناً غلط ہے (جلد دوم ص ۳۰۷) یہی
روایت سیر العارفین میں ہے (ص ۱۲-۱۳) کیا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ
شہاب الدین غوری کے ہندوستان کے حملہ کے موقع پر اجمیر میں نہ تھے، سیر العارفین
میں ہے کہ لاہور میں حضرت شیخ سعد الدین حمویہ کے پیر شیخ زنجانی حضرت خواجہ
معین الدین چشتی کی بے حد دوستی اور محبت ہو گئی تھی مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ شیخ حسین
زنجانی شیخ علی ہجویریؒ کے پیر بھائی تھے جو شیخ علی ہجویریؒ کے لاہور آنے سے پہلے وفات
پا گئے تھے اسی طرح سیر العارفین میں ہے کہ جس سال حضرت خواجہ معین الدین لاہور
پہونچے اسی سال حضرت علی ہجویری کا انتقال ہوا تھا یہ روایت بھی صحیح نہیں کیونکہ
حضرت علی ہجویری کی وفات سنہ ۴۶۵ھ سے ۵۰۰ ہجری کے آغاز تک بتائی جاتی ہے

جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت خواجہ کی پیدائش سے بہت پہلے حضرت علی ہجویری کا وصال ہو چکا تھا سیر العارفین اور تاریخ فرشتہ میں سنین اور واقعات کی ان غلطیوں کی وجہ سے کیا یہ دونوں کتابیں جعلی اور فرضی کہی جانے کی مستحق ہیں یہ بھی اعتراض ہے کہ ان جعلی ملفوظات کے مجموعوں میں زندگی کی ہمہ اور موضوعات میں تنوعات بھی نہیں ان کے مطالعہ میں دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل نہیں ہوتا ہے (ص ۷۰) سرور اور نور کا حاصل کرنا ایک اضافی چیز ہے بزرگان دین کو تصوف کے ذریعہ سے تصفیہ قلب، تجلیہ باطن عشق الٰہی اسرار الٰہی اور نور الٰہی حاصل ہوا کئے ہیں۔ صوفیائے کرام نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات کی تاریخ جگمگا اٹھی ہے مگر ۱۹۷۵ء میں دہلی میں امیر خسرو کا جو بین الاقوامی سیمنار ہوا اس میں ایک بیرونی ملک کے ایک بہت ہی ممتاز نمائندہ نے یہ دعویٰ کیا کہ تصوف کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں اس کی تائید ہندوستان کے ایک پروفیسر صاحب نے بھی کی پھر ۱۹۷۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلام کی تشکیل جدید پر جو سیمنار ہوا اس میں ایک متقشف عالم نے مجھ سے کہا کہ اسلام کو تصوف سے جتنا نقصان پہونچا ہے کسی اور چیز سے نہیں پہونچا موجودہ دور کے بہت بڑے متکلم اسلام مولانا مودودی کا بیان ہے کہ تصوف کا کام افیون کا چھپکا لگا کر تھپک تھپک کر سلا دینا ہے اور اس کو چنیا بیگم قرار دیا ہے اس کے ماننے والے کو مزمن مریض کہا ہے (تجدید و احیاء دین ص ۱۲۰،۱۲۲)

مگر اسی چنیا بیگم کے عشاق میں سے حضرت خواجہ حسن بصری حضرت بایزیدؒ

امیؒ حضرت جلال الدین رومیؒ، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شہاب الدین
وردیؒ حضرت ابوالحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت
رکاکیؒ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ حضرت باقی باللہؒ
رت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان ہی کی طرح اور بزرگان
ن اور مردان حق رہے کیا وہ مزمن مریض رہے کیا ان سے اسلام کو
صان پہونچتا رہا، اگر ان کے اسمائے گرامی اسلام کی تاریخ سے نکال دیے
ئیں تو اسلام کی کوئی روحانی تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی۔

اگر تصوف سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا تو اس کے لیے تصوف نہیں بلکہ
ریک ذہن اور بیمار دل مورد الزام ہے رہا نور اور سرور کا حاصل ہونا
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو نور اور سرور اس میں حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی
صنیفات سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ امیر خسرو عاشق مزاج اور عشق باز تھے
وہ مسلسل عشق کرتے رہنے میں ایمان رکھتے، وہ ایک گائک اور نائک بھی
تھے، ان کی صحبت ڈھاری، ڈفالی اور سازندوں کے ساتھ رہتی تھی انھوں نے
نہ تو کبھی اپنے کو پارسا ظاہر کیا اور نہ صوفیت بگھاری، بلکہ ہمیشہ اپنے ایک
رند اور قلندر ہونے پر فخر کیا، وہ طماع، ہوس زر میں مبتلا کذب گو اور
سیہ رو شاعر تھے، اس قسم کے مباحث پروفیسر ممتاز حسین کی کتاب امیر خسرو
حیات اور شاعری میں ملیں گے جو پاکستان میں امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن
کی کمیٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، پروفیسر صاحب کو اس قسم کی باتیں لکھنے میں
خاص نور اور سرور حاصل ہوا، مگر یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری مذہبی روحانی

اور ثقافتی وراثت کا تمسخر کر کے ہم کو اپنے ماضی کی عظمت سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں اسی لیے ہم کو یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ ہم ان جیسے لوگوں کے لیے اپنی تحریروں میں ایسا مواد نہ فراہم کر دیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ تحقیق کی آڑ میں اسلام اور تصوف دشمنی کا ثبوت دیں۔

بزم صوفیہ

دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب بزم صوفیہ کا بکثرت اضافوں کے ساتھ ضخیم اڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری خواجہ گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ بو علی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ) سید گیسو دراز وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل، ان کے ملفوظات کے مجموعوں اور تصنیفات کی روداد بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالحق توشہ ردولوی کے حالات و تعلیمات کا مستقل اضافہ یہ بھی سابق الذکر بزرگوں کی طرح صاحب کرامات و ملفوظات ہیں جن کا مزار آج تک ردولی میں مرجع خلائق ہے، ردولی کے اسی خانوادہ رشد و ہدایت سے ہمارے شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا بھی تعلق تھا،

مرتبہ:- سید صباح الدین عبدالرحمٰن قیمت:- ۵۰-۱۶

"منیجر"

جمالی

لودی اور مغل دور کا شاعر

از ڈاکٹر ظفر الندوی مرحوم مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

(۳)

متفرقات | مندرجہ بالا مثنویات کے علاوہ بوڈلین لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۲۲۲ اشاعر کی ایک مناجات، دو قصیدوں اور چند رباعیوں[1] پر مشتمل ہے۔ بوہار لائبریری کے ایک مخطوطے میں آٹھ اشعار کا ایک قطعہ[2] ملتا ہے ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطہ جلد دوم میں ایک قطعہ اور بہت سی رباعیاں ملتی ہیں جو ۴۲ صفحات[3] پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک رباعی درج ذیل ہے

آغاز محمد است وانجام علی ست — آشوب محمد است وآرام علی ست
آیات خدا از کلام پیغمبر ماست — اے دوست بداں کہ سر پیغام علی ست

کیا مثنویات جمالی، جمالی دہلوی کی کتاب ہے | مندرجہ بالا مثنویاں جمالی دہلوی کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ اس جمالی کی نہیں بلکہ کسی دوسرے شاعر کی ہیں۔ جس کا تخلص بھی جمالی ہی تھا۔ اسباب درج ذیل ہیں۔

---

[1] بوڈلین لائبریری کا کیٹلاگ ۸۸۰۔ ۸۷، [2] مثنویات جمالی (بوہار) مخطوطہ ورق ۱۳۸ الف

[3] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد اول ورق ۱۰۴ الف، ۱۶۶ ب، ۱۷۱ الف، ۱۷۳ الف، ۱۸۱ ورق ۱۸۲ ب

سیبیان الحقائق لکھنے سے پہلے شاعر چوبیس[1] مثنویاں لکھ چکا تھا[2]۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیان الحقائق کہن سالی کی تصنیف ہے۔ سیر العارفین ہمایوں (دورِ حکومت ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کے نام معنون ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ہمایوں کے دورِ حکومت[3] میں مکمل ہو چکی تھی۔ اب یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ بیان الحقائق (جو خود پیرانہ سالی کی تصنیف ہے) لکھنے کے مزید سات[4] سال کے بعد (جب کہ شاعر بہت بوڑھا اور ضعیف ہو چکا ہوگا) شاعر نے حرمین شریفین دور دراز کے اسلامی[5] ممالک کا سفر کیا ہوا اور وہاں سے واپس آکر سیر العارفین مرتب کی ہو۔

مثنویات میں بہت سے ایرانی شیعہ درویشوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کسی ہندی چشتیہ درویش کا ذکر نہیں ملتا اس سے ظاہر ہے کہ "مثنویات" کا مصنف شیعہ ہے جب کہ سیر العارفین کا مصنف پکا سنی اور سلسلۂ چشتیہ کا صوفی ہے۔ اس مفروضہ کے ثبوت میں کہ مثنویات کا شاعر شیعہ ہے۔ اس کی نظم و نثر سے مندرجۂ ذیل حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

[6] مصطفےٰ گفتا منت یار و رفیق تو منی و من توام دراین طریق
روحِ من در خونِ تو سرشتہ اند در ازل این تخم با ہم کشتہ اند

(حضرت علیؓ سے خطاب)

[7] بہ تقوی اقتدا با مصطفےٰ کن بہ بین آں قامت و ردد رضا کن

---

[1] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد دوم ورق ۱۰۲ ب تا ۱۰۳ ب [2] سیر العارفین (ندوہ) مخطوطہ ورق ۴ ب اور (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۴ الف تا ۴ ب

[3] ایضاً ۱۲ الف - ۱۲ ب [4] ایضاً ۲۰ الف - ۲۰ ب [5] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) جلد دوم (شرح الواصلین) ورق ۴۶ ب [6] مثنویات جمالی (بوہار) مخطوطہ فرحت آسا ورق ۱۰ ب

پیشہ مصطفےٰ بے شک فنا شو ۔۔۔ باین علم وعمل دایم بقا شو

صلّی اللہ علیہ وسلم وآلہ المعصومین وسلم

حضرت سیدنا محمد و آلہ الطیبین الطاہرین والائمۃ المعصومین

حضرت سرور اولیا و امام الموحدین علی مرتضیٰ علیہ السلام والتحیۃ والاکرام اگرنہ

فرمودہ بودے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔۔۔۔

بلبل گلزار حضرت مصطفےٰ و حضرت علی مرتضیٰ علیہما الصلواۃ والسلام مولانا جامی

علیہ الرحمۃ دریں باب چہ خوش فرمایدے

سلام بے عدد دہ خوش بہ حیدر ۔۔۔ صلواۃ دایم آور بر پیمبر

بجان بپذیر این تلقین وارشاد ۔۔۔ باحد متصل در آل و اولاد

۳۔ یہ "مثنویات" شیخ جمالی دہلوی کی مثنویوں "مہر وماہ" اور "مرأۃ المعانی" سے پلان

اسپرٹ اور انداز بیان میں بالکل مختلف ہیں۔ "مہر وماہ" ایک رومانی مثنوی ہے۔

اور "مرأۃ المعانی" کا موضوع سلوک کے مختلف منازل ہیں، جب کہ "مثنویات" صوفیانہ

پند ونصائح پر مشتمل ہیں، اور ان کا کوئی مرتب پلان نہیں، ان کے مختلف حصوں میں

ربط پیدا کرنے کے لیے نثر کی مدد لی گئی ہے۔ ان میں عام روایتی مثنویوں کی طرح

حمد، نعت اور منقبت نہیں۔ ان کی مثنویاں براہ راست "موضوع سخن" سے شروع

ہو جاتی ہیں۔ جب کہ "مہر وماہ" اور "مرأۃ المعانی" کا ڈھانچہ مثنویوں کے روایتی ڈھانچے

کے عین مطابق ہے۔

۴۔ مہر وماہ اور مرأۃ المعانی کا انداز بیان دلکش اور مسحور کن ہے۔ اشعار

۱۔ مثنویات جمالی ایضاً ورق ۱۰ الف ۲۔ ایضاً ورق ۹ ب ۳۔ ایضاً ورق ۹ ب ۴۔ ایضاً ورق ۱۰ الف

رواں دواں ہیں، زبان شیریں اور سلیس ہے۔ مگر "مثنویات" ان خصوصیات سے مبرا ہیں، ان میں مشکل بلند آہنگ ادق الفاظ و محاوروں کی بھرمار ہے۔ عربی الفاظ کے کثرتِ استعمال نے اس کی شیرینی کو اور بھی زائل کر دیا ہے۔

۵۔ مثنویات کے نثری حصے اور سیر العارفین کا تقابلی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ دونوں نثر دو مختلف افراد کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

برائے تقابلی مطالعہ نثر کے دو ٹکڑے نمونتاً درج ذیل ہیں۔

(الف) پردر دہ ہائے صحبت درانکہ تقلید ذوق از علم حال برنتواند داشت۔ انہ بہر آنکہ قول صادق دکاذب یکے می نماید دیدہ حال بینش می باید فرق نیک وبد زمان تواند کرد گوش بہ نظم وارد حاضر نکتہائے جدید و غریب باش کہ ہمچو برق می گزرد حیف است و ہزار حیف است کہ شخص بذکر گذشتہ مشغول باشد و بفکر آیندہ و وقتش فوت شد (شرح الواصلین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ جلد دوم ورق ۲۶۶ تا ۱۶۷)

(ب) خواب می بینم کہ اجتماع خلقے انبوہ است و بزرگے ذکر می فرماید کہ ہر کار دنیارا بر کار دین مقدم دارد و ہر دو کار را دبخاک افتد و خراب گردد از یکے پرسیدم کہ این بزرگوار کیست کہ وعظ می فرماید را و جواب داد کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ است و من ہرگز ایشاں را ندیدہ بودم ...... چوں بیدار شدم روز دوم احرام زیارت ایشاں بستم

(سیر العارفین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ ورق ۱۷۱ الف)

دیوانِ جامی کسی کیٹلاگ میں دیوانِ جامی کا نام درج نہیں[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم

---

[1] جیسے بانکی پور، بوہار، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، آصفیہ، برٹش میوزیم اور بوڈلین لائبریری کے کیٹلاگ

کے دو نسخے ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ ایک نسخہ حبیب گنج لائبریری علی گڑھ میں دوسرا رامپور اسٹیٹ لائبریری میں۔ اول الذکر نسخہ کے اول و آخر کے صفحے غائب ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۹ قصیدے، دو ترجیع بند، ۵ مکمل اور نامکمل ترکیب بند ہیں۔ کل اشعار کی تعداد دو ہزار ایک سو سے زیادہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

قصائد:۔ ۱۳ اللہ کی مدح میں ہیں یعنی حمد ہیں، ۴ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں، ۱۲ جالی کے پیر و مرشد شیخ سماء الدین کی مدح میں، ۷ سلطان سکندر لودی کی تعریف میں، ۶ بابر کی تعریف میں، ۲ ہمایوں کی تعریف میں۔

ترجیع بند:۔ ایک ترجیع بند نعتیہ ایک ترجیع بند عارفانہ۔

ترکیب بند:۔ چار ترکیب بند جو مکمل ہیں۔ مرثیے ہیں۔ ایک مرثیہ سکندر لودی کا، ایک جالی کے پیر کا، دو جالی کے پیر کے لڑکے کا، ایک خود جالی کے لڑکے کا۔ ایک ترکیب بند جو نامکمل ہے عارفانہ ہے۔

رامپور اسٹیٹ لائبریری کا مخطوطہ ۲۵۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۷ قصیدے، دو ترجیع بند، ۵ مراثی، ۲۰۸ غزلیں، ۱۷ قطعات، ۴ مختصر مثنویات اور ۴۴ رباعیاں ہیں۔

صاحب مرآۃ العالم کا بیان ہے کہ دیوان جالی میں[1] تین ہزار اشعار سے زیادہ دیوان جو ملا بدایونی کی نظر سے گذرا، سات یا آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل تھا[2]

جالی بحیثیت قصیدہ گو: دنیائے شاعری میں جالی کا مقام بلا شبہ بہت بلند ہے

---

[1] مرآۃ العالم ورق ۲۹۷ الف [2] منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۳۲۲ حاشیہ صفحہ ۳۲۳

اپنے زمانے میں وہ خسرو ثانی کہا جاتا تھا۔ یوں تو شاعری کے تمام اصناف پر اس کو قدرت
حاصل تھی۔ لیکن اس نے قصیدہ، مثنوی اور غزل کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ ان میں بھی
قصیدہ کو اولیت حاصل ہے۔ قصیدوں ہی نے جمالی کو جمالی بنایا ہے۔ صاحب مراۃ العالم
بختاور خاں کا قول ہے کہ جمالی قصیدہ گوئی میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

جمالی نے سلطان سکندر لودی کی شان میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ
اس نے شہنشاہ بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ بابر کی
مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

شاہ دشمن کش ظہیر الدین محمد بابر آنکہ   لشکر بنگالہ از انفار کابل بشکند

بابر جمالی سے خوش رہتا تھا اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ ہمایوں
بھی اس کی بڑی تعظیم کرتا تھا اور اکثر بہ نفس نفیس اس کے مکان پر جاتا۔ بادشاہ وقت

---

۱ مراۃ سکندری صفحہ ۲۵۲۔ شیخ جمالی کنبوہ شاعر کہ اورا ثانی خسرو گفتند ۲
اخبار الاخیار صفحہ ۲۲۱۔ اقسام شعر از مثنوی و قصیدہ و غزل گفتہ۔ حالت شعر او
بر اہل سخن ظاہر است۔ قصیدۂ او بہتر از غزل و مثنوی است۔ ید بیضا ورق ۴۱ ب ۳ در
اقسام شعر خصوص قصیدہ قوت کمال داشت شمع انجمن صفحہ ۱۰۶۔ قصائد او بہتر از غزل
و مثنوی است۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۸۔ در شعر و سخن استاد زمانہ
و فرد یگانہ بود . . . . . . اقسام اشعار از مثنوی و قصائد و غزل گفتہ
ہفت اقلیم ورق ۱۲۹ ب۔ شیخ جمالی در نکتہ پردازی شعر گوئی عدیم المثل عصر خود بود
و صاحب قصائد غراست و در جواب قصائد عبدالواسع جبلی قصائد موزوں کردہ روز
روشن صفحہ ۱۵۱۔ اشعار لطیفش سراپا شوق ۴ مراۃ العالم ورق ۲۳۶ الف

لامکان پر جا سکنے کو اس زمانہ میں عزت و تعظیم کی انتہا سمجھا جاتا تھا۔ جمالی نے بھی
ربیت کے طور پر اس کی شان میں چند قصدے لکھے ہیں۔

بختاور خاں[۱] کا بیان ہے کہ مندرجہ ذیل نعتیہ شعر اس زمانے میں بہت مقبول
رمشہور تھا

سی ز ہوش رفت بیک پرتو صفات　　　تو عین ذات می نگری باز در ھستی

ماکانی انداز بیان، ماہرانہ بندش، پرجلال تشبیہ اور اچھوتے استعارے
یک اچھے قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ اور جمالی کے قصیدوں میں یہ بدرجۂ اتم ملتے ہیں، عام
صیدہ نگاروں کے مقابلے میں جمالی کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے، اس کے "گریز"
مدہ اور قابلِ داد ہیں۔ تشبیب اور قصیدے کے دوسرے اجزا بھی ایک اچھے
قصیدے کی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔ قصیدے ایسے رواں دواں اور مسحور کن
ہیں کہ قاری کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ تشبیب کب ختم ہوئی اور مدح کہاں سے شروع
ہوگئی، ہند و پاک کے عظیم فارسی عالم اور ناقد مولانا حبیب الرحمن شروانی نے جمالی
کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا ہے[۲] کہ قصیدے کی تمام خصوصیات جمالی کے قصیدوں
میں ملتی ہیں، جیسے الفاظ کا طمطراق، بلند پروازی تخیل اور مختلف اجزا میں ربط۔ اس نے

(بقیہ حاشیہ ص) ۱؎ اخبار الاخیار صفحہ ۲۱۴، بدیعہ ایضاً ورق ۱۴۱ ب، خزینۃ الاصفیاء جلد دوم، ورق ۴۰، تذکرۂ علماء ہند ورق ۳۴ ۵؎ مراۃ العالم ورق ۳۹۷ الف۔ اس کے دیوان میں اس قصیدے کے علاوہ بابر کی مدح میں لکھے گئے چند اور قصائد ملتے ہیں، ۱؎ مراۃ العالم ورق ۳۹۰ الف۔ ۲؎ مقالات شیروانی صفحہ ۱۳۱ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۵۱ کے سیر ورق بھی دیکھیے

قصیدوں میں محض قافیہ پیمائی نہیں کی ہے بلکہ نادر خیالات پیش کیے ہیں مگر بیشتر خوبصورتی سے پیرا در بعض تو بالکل ہی نادر الوجود تشبیب موضوع کے عین مطابق ہے،

جمالی نے بلند آہنگ الفاظ استعمال کیے ہیں جو موضوع کے تقاضے کے عین مطابق ہیں، ہر مصرع میں جوش ہے تخیل کی بلند پروازیوں اور نادر استعاروں کے باوجود زبان کی دلکشی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ بابر کی شان میں لکھے گئے ایک قصیدہ کی تشبیب بطور نمونہ درج ذیل ہے اس سے جمالی کی شاعرانہ مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بادجہاں پرور وزیداے ابرنوروزی بہار	شد چمن سرسبز بر فرقش لالی کن نثار
چار باغ بادشاہ دارد نشان ہشت خلد	آب جو آمد مثال سلسبیلش در کنار
شد کنار جوئبار از سبز مینائی بساط	تا دہد سلطان گل اندر کنار جوئے بار
رشتہائے از ہوا تا چون رزز ببرون کشید	می کند ہر رشتہ پر باران بہ در شاہوار
لالہ دارد جام یاقوتی پر از مے از چہ رو	نرگس اندر عین مستی سرگران گشت از خمار
تا کلیم عندلیب آید بدستان در کلام	از برائے او ہوا بر شاخ گل افروخت نار
شاخسار سرو اوراق شجر بنگر کہ ہست	در بہر ہر برگ طوبی بر سر ہر شاخسار
ہمچو لیلی جانفزایان غنچہ را شیرین دہن	ہمچو ردے دلکشایان لالہ را رنگین عذار
صوفیان سبز پوش باغ را وجد است دحال	از سرود بلبل و از دستک برگ چنار
اندرین موسم کہ در کشتی نشیند بادشاہ	آفتاب دان کہ اندر ماہ نو گیرد قرار

مندرجۂ بالا اشعار میں جمالی نے آگرہ کے چار باغ (جواب رام باغ کہلاتا ہے) کی کیسی دلکش تصویر کھینچی ہے اس کا پہلا مصرع ہی سامع کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، اس کے بعد شاعر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ایک خاص ماحول پیدا کردیتا ہے۔ اپنے ممدوح

رشن مطالع ڈالیں۔ کشتی کو چاند سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور ممدوح کے روشن چہرہ کو آفتاب کہتے ہیں اور پھر ایک اچھوتے انداز میں کہتے ہیں۔

ع۔ آفتابے داں کہ اندر ماہ نو گیرد قرار

وہ براہ راست ممدوح کی مدح نہیں شروع کرتے ہیں بلکہ ایک غزل کا سہارا لیتے ہیں۔

در بہار عیش می خواند بلبل ایں غزل	بر مثال عاشق شوریدہ دل بر بوستاں

اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

اے ز رشک عارضت پیوستہ گل در سفارش	در غم رویت چو من جاں دادہ در ہر بوستاں
از چہرہ رو سر برندارد لالہ در صحن چمن	گر نماند از عارض رنگینت اے گلروئے نشاں
سنبل پیچان تو از سرکشی مشکیں کمند	نرگس فتان تو از خون خوری مردم فشاں
چشم تو با طاق ابرو ہندوئے محراب گیر	خال تو با زلف مشکیں کافر زنار دار

مندرجہ بالا اشعار میں ممدوح کا حوالہ دو جگہوں پر آیا ہے لیکن بالارادہ اس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے جس سے تجسس برقرار رہتا ہے اس کے بعد گریز ہے اور پھر جب مدح شروع ہوتی ہے تو ممدوح کا نام ظاہر ہوتا ہے۔

شاہ جم سیرت ظہیر الدین محمد بابر آنکہ	خاک درگاہش بود مسجود شاہان جہاں
از خراساں چوں بہندستاں شدی آمد ترا	بخت و دولت در یمین و فتح و نصرت در یسار
دشمنت را زندگی شد خواب آسائش محال	خود خیال و خواب را چنداں نباشد اعتبار
در مصافہا شد از گرد و غبار موکبت	چہرہ افلاک تیرہ دیدہ خورشید تار
ملک ہندوستاں ز انصافت چناں بد نی تکرار	رشتہ بازار ارادہ شد ز کابل تا بہار

قصیدے میں مبالغہ آرائی سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے شعراء اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن جمالی کے یہاں یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ مدح میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے بابر بلا شبہہ اس کا مستحق تھا حقیقتاً وہ تخت ہندوستان کے لیے مایہ ناز تھا دشمن اس کا نام سن کر سہم جاتے تھے۔ فتح و کامرانی اس کے ساتھ چلتی تھی اس نے ہر قدم پر اپنے دشمن کو شکست دی اور کابل سے بہار تک کا علاقہ اپنے زیر نگیں کر لیا۔

عام طور سے جذبۂ حصول دولت ہی شاعر کو قصیدہ نگاری کی طرف مائل کرتا ہے عرفی کہتا ہے

ع قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی

لیکن جمالی کا مطمح نظر حصول مال و زر نہیں تھا وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ صوفی بھی تھے اس لیے ان کے یہاں تمنائے زر کا وجود نہیں اور نہ وہ قصیدے میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔

پانی پت کی پہلی لڑائی ہندوستان میں لڑی جانے والی خوفناک لڑائیوں میں سے ایک ہے اس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا افغان ہار جاتے ہیں بابر کی فتح ہوتی ہے اور بابر ایک عظیم الشان مغل سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے جمالی اس لڑائی کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

ز افغان فغان برآمد آندم کہ شد حصات	اشباح را ضرب ارواح را محصل
از صد مۂ سمند ت ہر فیل کوہ پیکر	در خاک و خون فرو شد ہمچون حمار در گل
در حلقۂ سپاہت کامد عدو پر از خون	چون نقطۂ ز سرخی در چشم گشتہ داخل

چوں در رو جامی بر آمد بسم اللہ از زبانت　　از عجزت جہاں دم خصم تو گشت بسمل
یک دم ز قلب افغان تیغت نہ گشت یکسو　　کے آب دور گردد با خوں چو گشت واصل
مردن گزید حضرت بر زندگی کہ او را　　مشکل نمود آساں آساں نمود مشکل

جامی بحیثیت غزل گو) فارسی کی سب سے مقبول صنف شاعری غزل ہی ہے، اس زبان کی دلکشی اور شیرینی عشق کے معاملات اور واردات کی تصویر کشی میں معاون ہوتی ہے، اسی لیے اس زبان کی عشقیہ شاعری کے بے بہا نادر اور دلکش اشعار بکثرت ملتے ہیں، متقدمین نے غزل کو اظہار عشق کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، وہ جذبات کا اظہار سیدھے سادے انداز میں کرتے تھے، ان کی غزلوں میں سچائی اور سادگی ہوتی، مبالغہ نہیں ہوتا، لیکن دور وسطیٰ میں سادگی اور سچائی کی جگہ بلندی تخیل اور نزاکت خیال نے لے لی، جس سے غزل کا دامن وسیع ہوا اور اس میں دوسرے مضامین بھی بیان کیے جانے لگے، جامی متقدمین کے دور کے آخری شاعر ہیں، ان کے یہاں کہیں تو سعدی اور خسرو کی سادگی اور کہیں سلمان اور خواجو کی دلکشی ملتی ہے، وہ صوفی بھی تھے۔ اس لیے ان کے اشعار میں صوفیانہ صداقت بھی پائی جاتی ہے، ان کے یہاں آمد زیادہ ہے اور آورد کم ہے، اسی کے ساتھ ان کے یہاں موسیقیت کا لطف بھی ہے۔ ان کی ایک غزل نمونتاً درج ذیل ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس میں متقدمین کا کتنا رنگ جھلکتا ہے۔

جاں ز تن بردی مرا گذاشتی خوار ایں چنیں　　کے روا باشد کہ بگزاری بیک بار ایں چنیں
چوں بود حال گرفتاری کہ ہر دم باشد شق　　سینہ پر سوز نہاں و دیدہ خونبار ایں چنیں
تو گل باغ بہشتی و من از ہجر تو خار　　آنچناں گل را بباید لاجرم خار ایں چنیں

پائے دل در بند زلفت گردن جاں در کمند ‏ ‏ کس مبادا در جہاں ہرگز گرفتار این چنین
حال مردم در فصیح نامہ ساں باشد کہ ہست ‏ ‏ چشم شوخت چون فتان و غمزہ خونی این چنین
سینہ بریاں دیدہ گریاں حال پریشاں جان خراب ‏ ‏ این ستم یارب بدرد عاشقی زار این چنین
گر جمالی برزخت پروانہ ساں سوزد چہ باک ‏ ‏ شمع گر اینست خواہد سوخت بسیار این چنین

ان اشعار میں جذبات کی گہرائی بیان کی سادگی اور خیال کی ندرت سے بڑی تاثیر پیدا ہو گئی ہے، ان میں شعر گوئی کے فن کی مہارت بھی عیاں ہے، متوسطین کی طرح ان کے اشعار میں بندش کی چستی، بیان کا اچھوتا پن بھی ملتا ہے، اس کی تائید میں ان کی ایک اور غزل پیش کی جاتی ہے[1]

این چنین قد کہ راست می گوییم ‏ ‏ یعلم اللہ کہ راست می گوییم
در دہان دلبت بجان بخشی ‏ ‏ ہمہ لطف خداست می گوییم
سر زاہد چو تو بہ مستان ‏ ‏ بشکستن رواست می گوییم
گفتم این درد را چہ درمانست ‏ ‏ گفت مرگت دواست می گوییم
پیشۂ او جفاست می گوید ‏ ‏ کار دلدار ما وفاست می گوییم
عہد و پیمان و وعدۂ وصلت ‏ ‏ ہمہ باد و ہواست می گوییم

"سراپا" دور وسطیٰ کی چیز سمجھی جاتی ہے جس میں معشوق کے ایک ایک عضو کی تعریف میں شعر کہنے میں خوب خوب اختراعات کیے گئے ہیں لیکن ان شاعروں سے بہت پہلے جمالی نے بھی "سراپا" فنکارانہ انداز میں لکھا ہے[2]

---

[1] دیوان جمالی (رامپور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۷۳ [2] دیوان جمالی (رامپور اسٹیٹ لائبریری) ص ۳۴۴

دل بردہ زمن بازعجب مہر فزائی — خورشید رخی عشوہ گری فتنہ فزائی
کان نمکی شہد لبی تنگ دہانی — شیریں حرکاتی صنم ماہ لقائی
سیمیں ذقنی گل بدنی لالہ عذاری — رشک چمنی سرو قدی سبز قبائی
زیبا صنمی رخ سمنی آفت شہری — بیداد گری دل شکنی ترک خطائی
ابرو شکنی تیر زنی سخت کمانی — شمشیر کشی خلق کشی عین بلائی
بے رحمی و آشوب گری رہزن دینی — اسلام بری کفر دلی زہد ربائی
گر حال جمالی زغمش باز نہ پرسی — دل گم شدہ جاں بکفی بے سرو پائی

"انسان خطا کا پتلا ہے" فارسی شاعری کا پسندیدہ موضوع رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کا کمال معصوم اور بے خطا ہونا نہیں عظیم انسان وہ ہے جس سے گناہ سرزد ہو اور احساس گناہ کی خلش اسے خدا کے سامنے سرنگوں کر دے، وہ توبہ کرے اور خدا سے معافی کا طلبگار رہے اس موضوع پر لاتعداد اشعار ملتے ہیں جمالی نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے جس سے ان کا دیوان بھرا ہوا ہے ذیل کے دو اشعار ان کی اخلاص مندی کے آئینہ دار ہیں[1]

اگرچہ درخور قہریم از گنہگاری — بود بہ لطف تو چشم امید زاری ما
زیک ترشح ابر کرم فرو شوئی — غبار جرم ز رخسار شرمساری ما

"انسان اگر گناہ نہ کرتا تو خدا کی رحمت کا وجود نہ ہوتا" یہ خیال دور وسطیٰ کے شاعروں کا رہا ہے متوسطین نے یہ تخیل پیدا کیا کہ گناہ ہی اللہ کی رحمت کو جوش میں لاتا ہے۔ اس خیال کو جمالی نے کتنے خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے[2]

---

[1] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۳۲

[illegible] ے بروں ز نقاب — اگر نہ روئے نمودے گنہ بگاری ما

[illegible] کی درگت بنانا نہیں برا بھلا کہنا فارسی شاعروں کا محبوب [illegible] اس موضوع پر بھی جامی کا ایک شعر ہے[1]

[illegible] چو تو با مستاں — بشکستن رواست می گویم

[illegible] اپنے احساسات و جذبات ہی کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے ان کے یہاں [illegible] اور دور از کار استعارات بھی نہیں[2]

دلم صد چاک و جاں غم ناک تا کے	تنم در خوں سرم در خاک تا کے
دلم [illegible] مرغ نیم بسمل	بخوں آلودہ و ناپاک تا کے
[illegible] لو خشک تا چند	دو چشم از خونِ دل نمناک تا کے
[illegible] بردے تو ہر شب	رود آہم سوئے افلاک تا کے
[illegible] زہر ہابر الفت	بجویم از لبت تریاک تا کے
[illegible] پیراہن صبر	زخارم دامنِ دل چاک تا کے
[illegible] دوست دل پاک	تنت پاک و دلت ناپاک تا کے

[illegible] قصیدوں کے بیچ بیچ میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ عموماً قصیدوں کے لیے [illegible] جاتی ہے اس لیے قصیدوں کی زمین میں کم تر ہی غزل کامیاب ہوتی ہے لیکن جامی قابلِ تحسین ہیں کہ یہاں بھی اپنے فن کی مہارت دکھاتے ہیں۔

در ہوائے مجلسش می خواند بلبل ایں غزل	زد گریباں تا بدامن چاک ازیں گفتارِ گل
اے [illegible] عارض لالہ در رخسارِ گل	لالہ ات ریحاں دمد شمشاد ت آرد بارِ گل

---

[1] دیوانِ جامی [illegible] رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۷۳ [2] ایضاً ص ۳۴۴

قصیدے کے درمیان لکھی ہوئی ایک دوسری غزل کا مطلع یہ ہے۔

اے زرشک عارضت پیوستہ گل در خار خار   در غم رویت چوں من جان داده در هر خو هزار

صاحب اخبار الاخیار[1] کا بیان ہے کہ جمالی کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ جمالی صوفی تھے انھوں نے خدا سے لو لگا رکھی تھی، ان کا دل محبت سے لبریز تھا، اس لیے ان کی غزلوں میں بھی عشقیہ جذبات کے اچھے پہلو ملتے ہیں، ان کے قصیدوں کی تشبیب میں بھی تغزل کا رنگ ہے، قصیدوں کی سنگلاخ زمینوں میں بھی وہ دلکشی پیدا کر دیتے ہیں[2]۔

جذب شبنم باشد از خورشید رویت در عرق   بوالعجب کارے کہ شد در زیر شبنم آفتاب
گر تو چشمی چشم کے نازک بود مانند رخ   در تو ر وحی کے بود در رخ محجبتم آفتاب

اشک من از خیالت ہمچوں غم تو حاضر[3]   صبر من از فراغت ہمچوں دہانت غائب

دوسرے اصناف سخن: جمالی کے قطعات، رباعیاں، ترکیب بند، ترجیع بند اور مرثیے ہیں، ان میں ان کی فنکارانہ مہارت نظر آتی ہے، ان کے قطعات کا ایک نمونہ یہ ہے۔

هر جا که رود عزیز گردد   چوں ترک وطن کند خرد مند[4]
گوہر چو ز کان خود برون شد   قیمت بودش زیادہ صد چند
گرچہ به نقش کنند سوراخ   سازند بتاج شاه پیوند
چوں شیرہ زنی شکر برون شد   در جوش فتد وے شود قند

موضوع کے لحاظ سے جمالی کی رباعیوں میں نیاپن نہیں ہے، انھوں نے عام موضوعات جیسے معرفت، تسلیم و رضا، عشق، کائنات کی فنائیت اور اخلاقی مضامین

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۸، [2] ایضاً ورق ۴۸ ب شمع انجمن ص ۱۰۷، [3] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۷۷، [4] ایضاً ص ۷۰، [5] ایضاً ص ۱۵۹

ہی لکھتے ہیں لیکن ان کے انداز بیان سے پامال موضوعات میں بھی کچھ جان پڑ گئی

ہے نمونتاً چند رباعیاں درج ذیل ہیں[1]

اگر در پئے من حاسد بے باک افتد | زد غلغلہ در عالم افلاک افتد
او در دعفو بگیرد از بد گوشش | من خاکم واندر دهنش خاک افتد

بازم در رزش دلم آویختہ باز[2] | باز آمدم از خویش چو چشم شدہ باز
بازدم کشیدہ و گفت بازی میباز | بازی نکند ہیچ کبوتر با باز

یارب ز کرم بخش من بیدل را[3] | سودا زدۂ خیال بے حاصل را
بے توشہ و بے رفیق و بے منزل را | در راہ فتادہ بار و پا در گل را

آنکس کہ ترا شناخت از خود بگذشت[4] | از شائبۂ قبول و ز رد بگذشت
از بہر تو زیست و برائے تو بمرد | از ہر دو جہان پاک وجود بگذشت

مائیم وجودے ز حقیقت محروم[5] | ایں ہستی ناچیست خیال موہوم
اول بودہ نابودہ و آخر معدوم | معدوم کند ہستی حق چوں معلوم

جمالی کے مرثیے بھی پر اثر ہیں' انھوں نے رسمی طور پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا
ان کے سب ہی مرثیے ان کے دوست یا عزیز کی موت پر لکھے گئے ہیں' اسی لیے ان کے
غمناک جذبات میں حقیقی رنگ پایا جاتا ہے' انھوں نے پیر و مرشد شیخ سماء الدین
کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے

اے دیدہ خوں بریز کہ دلدار غائب ست | یعنی جمال آں مہ رخسار غائب است

---

[1] دیوان جمالی ص ۴۰۲ [2] ایضاً ص ۴۰۸ [3] ایضاً ص ۴۰۷ [4] ایضاً ص ۴۰۶

ان پر شیخ سماء الدین کی موت کا گہرا اثر تھا جس کی شہادت یہ مطلع دیتا ہے
اسی طرح انھوں نے اپنے لڑکے اور اپنے پیر و مرشد کے لڑکے کی موت پر جو مرثیے
لکھے ہیں وہ بھی بہت دردناک ہیں، سلطان سکندر لودی کا مرثیہ بھی غم و اندوہ
سے بھرا ہوا ہے اس کا مطلع ہے

خلق حیران و پریشان کہ شہنشاہ چہ شد ہمہ بر سینہ زنا دست کہ اللہ چہ شد

اس مرثیہ میں یہ بات نئی ہے کہ وہ مرثیہ کے اختتام پر نئے بادشاہ کو خوش
آمدید کہتے ہیں،

باد مجو سزا دار سریر و دیہیم مردم چشم تو سلطان جہان ابراہیم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمالی نے بھی "بادشاہ مرگیا بادشاہ زندہ باد" کا نعرہ
لگایا ہے

آخر میں جمالی کے دو مطلعے پیش کئے جاتے ہیں جو بلا شبہہ اچھے اچھے شعراء کے
بہترین اشعار کے مقابلے میں رکھے جاتے ہیں، پہلا مطلع ترجیع بند کا ہے، اور دوسرا
ترکیب بند کا۔

اے رخوت در جمال تو پیدا ۔ وے جمال تو بر رخت شیدا

مائیم خلاصۂ دو عالم ۔ تفسیر حروف اسم اعظم

خواجگانِ چشت کے ملفوظات

سے متعلق ایک مکتوب

بنام

سید صباح الدین عبد الرحمن

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

مزاج مبارک۔ مارچ ۱۹۵۹ء کا معارف ایک دوست کی وساطت سے مل گیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کا مضمون امیر خسرو اور افضل الفوائدؔ پورے انہماک اور توجہ سے مطالعہ کیا۔ یہ پہلی قسط ہے۔ دیگر اقساط کا منتظر ہوں۔ آپ کی تحقیق و تلاش اور نکتہ رسی کی داد دینا سورج کو چراغ دکھانے کی مصداق ہے۔

ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

خوب لکھا ہے اور تفصیل سے لکھا ہے

اس دوران میں میرے علم میں یہ بھی آیا کہ دلی کی کسی پبلک لائبریری میں معارف نہیں آتا۔ میں نے ناتھ وری لائبریری کے ارکان کو توجہ دلائی ہے انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے۔ ایفا کب ہوتا ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ع وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا کہ معارف کی کتابت و طباعت کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں قلم جما کر لکھیں اور اشکال صحیح بنائیں نوک پلک کا بھی خیال رکھیں مشین مین صاحب روشنائی کی وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پر آجائے

کا بقول سعدی ؒ آزادی پیکر جمیل بہ لباس حریری دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے۔

اس کے بعد موضوع سے متعلق یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ خیر المجالس میں فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے قطع نظر اس سے کہ وہ بعینہ فوائد الفواد میں نہیں ہے۔ مگر ان ناقدین کے لیے اساس ہے جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے درپے ہیں، یہ پوری عبارت اصل ہے جو ز استقام سے بھرپور اور اس لائق ہے کہ تجزیہ کر کے بتایا جائے کہ یہ نہ کسی صاحب کمال کے قلم سے نکلی ہے، اور نہ اسے اساس بنایا جا سکتا ہے، یہ تو کسی کم سواد کی کارستانی ہے،

متکلم کا بیان ہے۔ "من مرتحفہ کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ" متکلم نے کسی کے پاس کوئی کتاب دیکھی، غالباً اسی مماثلت سے اس کو یہ شبہہ ہوا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، یہ رائے خود دیکھنے والے نے قائم کی ہے۔ کسی نے اسے بتایا نہیں ہے کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق اتنا ہی ذہن نشین رکھنا کافی ہے، جملے کا آخری حصہ "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے۔ لفظ شیخ وضاحت کا متقاضی ہے کہ شیخ سے مراد کون ہے؟ یہ جملہ حضرت محبوب الٰہی ؒ کے روبرو بولا گیا ہے گویا کہ لفظ شیخ سے مراد حضرت محبوب الٰہی ؒ ہیں، اہل گفتگو اور آداب مجلس کا اقتضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا اضافہ بھی ہو کیونکہ حضرت محبوب الٰہی ؒ کی مجلس وہ مجلس تھی جہاں اچھے اچھے باکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے۔ صرف شیخ کہہ دینا اور حضرت محبوب الٰہی ؒ کے روبرو کہنا ہرگز قرین قیاس نہیں،

اس کے بعد اس کا جواب ہے۔ جو حضرت محبوب الٰہی کی زبانی نقل کیا ہے یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے۔ جو بے محل الفاظ سے پُر اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے۔ جو بالکل ہی مبتدی ہے بلکہ مبتدی سے بھی گیا گزرا ہے، اس میں تحریف بھی ہے اور

اور الحاق بھی جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں ہے، اسے بطور جواب حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا بہت بڑی گستاخی اور سر بسر افترا ہے۔ وہ بندش جسے فارسی میں ذرا بھی شد بد ہے، وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کیا گیا ہے جو عالم و عارف، زبان دان و اہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ جواب یہ ہے: "او تفاوت گفتہ است من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند" متکلم مخاطب و موجود ہے۔ پھر "او" اور "گفتہ" کا کیا محل ہے۔ متکلم نے جو کچھ کہا ہے اپنے صوابدید سے کہا ہے کسی نے اس سے کچھ کہا سنا نہیں ہے۔ افعال اور ضمائر کی ایسی غلطیاں مبتدیوں سے بھی کم ہی ہوتی ہیں، کسی معقول پڑھے لکھے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی چہ جائے کہ کسی عالم و زبان داں سے۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے۔ تفاوت دیدی۔ تفاوت می گوئی۔ ...... بلا شبہہ یہ تفاوت کنندہ یہ جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں۔ ناقل پہلے جملے کے محل استعمال سے ناواقف ہے دوسرے جملے میں کتابے کی یائے وحدانی حذف کردی ہے جو کسی ایک کتاب کی نمایندہ تھی، عمل تحریف سے بنشتہ ام کو تصنیف نہ کردہ ام کر دیا ہے، تیسرے جملے کا اضافہ فرمایا ہے جو حشو اور کھلا عیب کلام ہے اور الحاقی ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کی اساس ہے، یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں، کیسے دانشور ہیں وہ نقاد جو پانی پر پاڑ باندھتے اور ہوا پر محل بناتے ہیں۔ کھوکھلی بنیاد کو ذرا چھیڑیے عمارت دھڑام سے منہ کے بل آ پڑے گی، .آپ نے کمال ایجاز سے یہ فرمایا ہے: "خواجگان چشت کے

لفاظ کا اضافہ قرار دیا جاتا ہے، اس کا محض قیاس ایک مبہم اور
ردا نحیبیان سے کیا جاتا ہے، میرے نزدیک خیرالمجالس کی مذکورہ عبارت
تا حت وضاحت کی مقتضی ہے۔

مولانا حمید قلندرؒ سے تو یہ توقع نہیں کہ وہ یہ بے سر و پا عبارت لکھتے
بنا یہ کسی کم سواد ستم ظریف کی کارستانی ہے، اور ایسے ہی عقل کے پورے
س کو معتبر مانتے ہیں۔ حیرت ہے ان دانشور نقادوں پر جن کے لیے یہ اساس
ہ۔ خیرالمجالس کے باب میں یہ بھی دشواری ہے کہ اس کے قدیم نسخے دستیاب
نہیں ہوتے۔ ایک نسخہ سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں
ہے۔ جو چند در چند اوراق کا مجموعہ اور ناقص ہے۔ ایک نسخہ اورینٹل ریسرچ
انسٹیٹیوٹ حیدرآباد میں ہے۔ جسے آصفیہ لائبریری کہتے تھے، یہ ۱۳۱۳ھ کا
مکتوبہ ہے، مطبوعہ نسخہ اسی کی آواز بازگشت ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ کتب ملفوظات
کو جعلی قرار دینے والے نقاد جن کتب ملفوظات کو مستند قرار دیتے ہیں
ان ہی کے قدیم نسخے نایاب ہیں، درر نظامی کا ایک نسخہ ہے جو سالار جنگ میوزیم
حیدرآباد کی زینت ہے، اور بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، فوائد الفواد کا
قدیم ترین نسخہ ۱۱۶۱ھ کا مکتوبہ ہے، یہ بھی سالار جنگ میوزیم ہی میں ہے،

یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ فاضل نقاد نے مولانا رکن الدینؒ
کاشانیؒ کی کتاب کا نام شمائل الاتقیا و رذائل الاشقیا لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے،
مولانا رکن الدین کاشانی کی کتاب کا نام "شمائل اتقیا و دلائل اتقیا" ہے، یہ
کتاب ایشیاٹک سوسائٹی کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے، فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ

۱؎ معلوم ہوا ہے پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خیرالمجالس کا جو نسخہ شائع کیا ہے وہ فاضل مکتوب نگار کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔

طبعہ [illegible] کے صفحہ ۱۰۰ میں ہے ۹۱۱ھ تحریر ہے اور [illegible] کا مکتوبہ ہے۔ ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے جو [illegible] کا مکتوبہ ہے۔ مرحوم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم (نولکشوری) صفحہ ۱۰۰ میں یہی نام لکھا ہے اور مصنف کا مختصر سا حال بھی لکھا ہے۔ مجھے بھی ایک ایسے نسخے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہے جو [illegible] کا مکتوبہ ہے، جس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رفوائد الشمائل الاتقیا کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے۔ یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سیر الاولیا (چرنجی لال ایڈیشن) صفحہ ۱۰۵ تا ۲۹۵ میں۔ نکتہ در بیان مردے کہ ایشان مستغرق باشند و از خواب و خور ایشان را یاد نہ باشد کے تحت تمہیدی اور اختتامی چند سطور اور بعض بعض الفاظ اور جملوں کے سوا جو حاشیہ آرائی کرنے اور ربط قائم رکھنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں، تمام عبارت تاریخ فیروز شاہی برنی کے جستہ جستہ مقامات سے ماخوذ ہے، اس نکتے سے متعلق جملہ عبارت الحاقی ہے، جس کے متن کا تعلق سیر الاولیا سے نہیں ہے۔ یہ نکتہ سیر الاولیا کے معدودے چند ان نسخوں میں ملتا ہے، جو [illegible] عہد محمد شاہ کی مرتبہ سیر الاولیا سے منقول ہیں، اوروں میں نہیں ہے، چرنجی لال ایڈیشن بھی اسی کی آواز بازگشت ہے، عنوان کو متن سے ربط نہیں، متن تمام تر احوال شاہان و امرا پر مشتمل ہے، جگنو کی سی

---

[1] معارف [illegible] میں شیخ رکن الدین کی یہ کتاب اشرف پریس حیدرآباد سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائٹل پر شمائل الاتقیا ہی لکھا ہوا ہے، اور اسی نام سے مشہور ہوئی۔

بل البتہ کہیں کہیں لکھا ہے جو انشا کا قبیح ترین نقص ہے، امیر خورد کرمانیؒ کے اسلوب

ایہ تو بھی نہیں ہے، عنوان کی عبارت میں بھی وہ ندرت وصفائی، شگفتگی و دلآویزی

نہیں جو امیر خورد کرمانی کے اسلوب کا خاصہ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں [illegible] کا مکتوبہ سیر الاولیا کا نسخہ ہے، جس کا پہلا کیٹلاگ

نمبر ۲۰۲ اور بعد کا ۱۲۰۵ ہے، جو معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے، اس میں متن سیر الاولیا

کے اختتام کے بعد کچھ اوراق خالی ہیں، پھر یہ عبارت مرقوم ہے، گویا کسی کی یادداشت ہے،

اس کے آغاز میں نہ عنوانی عبارت ہے نہ نکتہ مرقوم ہے، نہ کسی باب سے اس کا تعلق ہے نیز

مضامین میں بھی یہ نکتہ اور عنوان نہیں ہے،

یہ بھی لطیفہ ہے کہ امیر خورد کرمانی کا سنہ وفات [illegible] ہے اور مذکورہ عبارت میں

[illegible] تک کا احوال ہے، مرزا مظہر جان جاناں کے شیخ طریقت سید نور محمد بدایونی کا سنہ وفات

بقول مرزا مظہر [illegible] ہے، مگر وہ [illegible] میں سیر الاولیا کے ناقل کاتب ہیں، الحاق کے

شغف میں ان دانشوروں کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ جو دنیا سے گزر گئے وہ دنیاوی کتابوں

کے مصنف اور کاتب و ناقل نہیں ہوا کرتے،

سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں، معارف اپریل کا منتظر ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ افضل الفوائد

کی مجالس کی تاریخوں کا نقشہ میں آپ کو بھیج دوں، اور آپ اپنے قلمی نسخے سے مقابلہ کرا کے مجھے

بھیج دیں، مجھے توقع ہے کہ اس باب میں آپ میری رہنمائی فرماتے رہیں گے، کیا اچھا ہو جو

آپ کسی ایک مجموعہ ملفوظات پر لکھتے رہیں، اور معارف میں شائع کرتے رہیں، بعد ازاں

ان سب کو کتابی شکل میں شائع کر دیں، یہ ایک اچھی خدمت ہوگی، دعائے خیر کا طالب

ہوں

طبع ۱۹۰۲ء کے صفحہ ۱۰۵ میں یہ ۱۱۰۹ھ تحریر ہے اور ۱۱۳۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ ایک نسخہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے، جو ۱۱۵۲ھ کا مکتوبہ ہے، مرحوم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم (نولکشوری) صفحہ ۱۱۰ میں یہی نام لکھا ہے، اور مصنف کا مختصر سا حال بھی لکھا ہے، مجھے بھی ایک ایسے نسخے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہے، جو ۱۱۲۶ھ کا مکتوبہ ہے، جس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رفوائد الشتیاء کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے

یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سیرالاولیا (چرنجی لال اڈیشن) صفحہ ۱۰۵ تا ۲۶۹ میں "نکتہ در بیان مردے کہ ایشاں متفرق باشند در زر و خواب و خور ایشاں را یاد نہ باشند" کے تحت تمہیدی اور اختتامی چند سطور اور بعض بعض الفاظ اور جملوں کے سوا جو منا کی کرنے اور ربط قائم رکھنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں تمام عبارت تاریخ فیروز شاہی برنی کے جستہ جستہ مقامات سے ماخوذ ہے، اس نکتے سے متعلق جملہ عبارت الحاق ہے، جس کے متن کا تعلق سیرالاولیا سے نہیں ہے، یہ نکتہ سیرالاولیا کے معدودے چند ان نسخوں میں ملتا ہے، جو ۱۲۲۰ھ عہد محمد شاہ کی مرتبہ سیرالاولیا سے منقول ہیں اور دوں میں نہیں ہے، چرنجی لال اڈیشن بھی اسی کی آواز بازگشت ہے، عنوان کو متن سے ربط نہیں، متن تمام تر احوال شاہان و امرا پر مشتمل ہے، جگنو کی سی

ؔ معارف ۱۹۲۸ء میں شیخ رکن الدین کی یہ کتاب اشرف پریس حیدرآباد سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائٹل پر شمائل الاتقیا ہی لکھا ہوا ہے، اور اسی نام سے مشہور ہوئی۔

ل البتہ کہیں کہیں لکھا ہے، جو انشا کا تتبع تزئین نقش ہے، امیر خورد کرمانی کے اسلوب
پر توجہ نہیں ہے، عنوان کی عبارت میں بھی وہ ندرت و صنائع لفظی و رعایت وغیرہ
ں جو امیر خورد کرمانی کے اسلوب کا خاصہ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ۱۱۰۲ھ کا مکتوبہ سیر الاولیا کا نسخہ ہے، جس کا پہلا کیٹلاگ
نمبر ۲۶۴۲ اور بعد کا ۱۲۰۵ ہے، جو معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے، اس میں متن سیر الاولیا
کے اختتام کے بعد کچھ اوراق خالی ہیں، پھر یہ عبارت مرقوم ہے، گویا کسی کی یادداشت ہے،
اس کے آغاز میں نہ عنوانی عبارت ہے نہ نکتہ مرقوم ہے، نہ کسی باب سے اس کا تعلق ہے، فہرست
مضامین میں بھی یہ نکتہ اور عنوان نہیں ہے،

یہ بھی لطیفہ ہے کہ امیر خورد کرمانی کا سنہ وفات ۷۷۰ھ ہے اور مذکورہ عبارت میں
۱۱۳۵ھ تک کا احوال ہے، مرزا مظہر جان جاناں کے شیخ طریقت سید نور محمد بدایونی کا سنہ وفات
بقول مرزا مظہر ۱۱۳۵ھ ہے، مگر وہ ۱۱۰۲ھ میں سیر الاولیا کے ناقل کاتب ہیں، الحاق کے
شغف میں ان دانشوروں کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ جو دنیا سے گذر گئے، وہ دنیاوی کتابوں
کے مصنف اور کاتب و ناقل نہیں ہوا کرتے،

اس خراشی کی معافی چاہتا ہوں، معارف اپریل کا منتظر ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ افضل الفوائد
کی مجالس کی تاریخوں کا نقشہ میں آپ کو بھیج دوں، اور آپ اپنے قلمی نسخے سے مقابلہ کراکے مجھے
بھیج دیں، مجھے توقع ہے کہ اس باب میں آپ میری رہنمائی فرماتے رہیں گے، کیا اچھا ہو جو
آپ کسی ایک مجموعہ ملفوظات پر لکھتے رہیں، اور معارف میں شائع کرتے رہیں، بعد ازاں
ان سب کو کتابی شکل میں شائع کر دیں، یہ ایک اچھی خدمت ہوگی، دعائے خیر کا طالب
ہوں

تلخیص و تبصرہ

اسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان

آسٹریلیا کے مسلمانوں کے بارہ میں پچھلے دنوں مختلف رسائل میں مضامین شائع ہوئے، ہم سعودی عرب کے ہفتہ وار رسالہ الدعوۃ کے ایک مضمون کا خلاصہ ذیل کی سطور میں پیش کر رہے ہیں (م ن)

آسٹریلیا کا کل رقبہ ۲۹ لاکھ ترسٹھ ہزار نوسو مربع میل (۷۶ لاکھ ۸۶ ہزار نوسو مربع کیلومیٹر) اور ۷۵ء و ۷۶ء کی مردم شماری کے حساب سے مجموعی آبادی ایک کروڑ اکتیس لاکھ اکتیس ہزار تین سو افراد پر مشتمل ہے، اس کے زیادہ تر باشندے عیسائی ہیں، مسلمان مجموعی آبادی کا ایک فی صد ہونگے، ان کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے کچھ اوپر کیا جاتا ہے، علاقہ وار ان کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے

نیو ساؤتھ ویلز، چالیس ہزار	وکٹوریہ پچاس ہزار
کوئنس لینڈ، دو ہزار	مغربی آسٹریلیا ڈھائی ہزار
جنوبی آسٹریلیا ڈھائی ہزار	تسمانیا دو ہزار
شمالی آسٹریلیا پانچ سو،	دارالسلطنت کینبرا دس ہزار

یہ سب یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں، بلکہ اکثر لوگ گوسلادیہ، البانیہ، ملیشیا، ہندوستان، ترکی، اور عرب ملکوں سے تجارت و تعلیم کے سلسلہ میں آئے ہیں، ان میں سے کچھ آباد بھی ہوگئے ہیں

اسلام کی تاریخ | اس براعظم کو جب یورپین باشندوں نے آباد کرنا چاہا تو آباد کاری میں مدد کی غرض سے کچھ شتربانوں کو لائے تاکہ ان کے ذریعہ صحرائی علاقوں کو عبور کرسکیں، اور ملک کے نشیب و فراز سے واقف ہوں، ذخائر کا پتہ چلائیں، اور تعمیر و ترقی کا بندوبست کرسکیں، انھیں ساربانوں کے ذریعہ اسلام یہاں پہونچا، اس سلسلہ میں ایک کشمیری مسلمان دوست محمد اور کچھ پشاوری اور افغانی مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے، انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا، اور فریضۂ حق کی ادائگی کے لیے، مساجد بھی تعمیر کیں، موٹر ریل، اور ہوائی جہازوں کے بعد اونٹوں کا دور ختم ہوگیا تو کاروانوں کی گذرگاہیں متروک ہوگئیں، اور اکثر مساجد ختم ہوگئیں، اب صرف دو ایک باقی رہ گئی ہیں، پرانے شتربان تعلیم یافتہ نہ تھے، عربی زبان سے ناواقفیت اور حفظ قرآن پاک کے عدم رواج کی وجہ سے ان کی اسلامی زندگی پر ملکی باشندوں کا اثر پڑا، یہاں کی عورتوں سے شادی کی وجہ سے بھی ان کی معاشرت متاثر ہوئی، اور اسلامی زندگی کو صدمہ پہونچا۔

۱۹۵۰ء سے قبل اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی، مگر اس کے بعد مہاجرین کی آمد بڑی تیزی سے شروع ہوئی، یہ مہاجر مختلف علاقوں اور ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور زبان تہذیب و معاشرت کی بنا پر مختلف حلقوں میں تقسیم ہیں، ان کی سوسائٹیاں اسلام کے بجائے ملکی اساس پر ہیں، جیسے شامی، ہندی، ترکی وغیرہ، خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہ انتشار جلد دور ہو جائے گا اور

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا   اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور الگ الگ نہ ہو

کے جب منشا اسلام کے زیر سایہ منظم و متحد ہو جائیں گے،

اسلامی سرگرمیاں ان مہاجرین نے بعض اسلامی تنظیمیں قائم کی ہیں، جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتی ہیں، ان کے ذریعہ تہذیب جدید کی دسیسہ کاریوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں مندرجۂ ذیل تنظیمیں قابل ذکر ہیں،

(۱) جمعیۃ نیو ساؤتھ ویلز (اس کا قیام ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا) (۲) جمعیۃ اسلامی سڈنی (۳) جمعیۃ اسلامی نیو طاؤن (۴) جمعیۃ اسلامی تسمانیا (۵) جمعیۃ الطلبہ تسمانیا، (۶) مرکز اسلامی کنبرا

مذکورہ بالا تنظیموں نے بہت سے دینی مرکز، مکاتب اور مساجد قائم کی ہیں، جن کے ذریعہ اسلام کی روشنی پھیل رہی ہے، مگر ابھی یہ کام بہت محدود طور پر ہو رہا ہے،

مسلمانوں کی حالت اس وقت آسٹریلیا کے مسلمان بڑی کسمپرسی کا شکار ہیں، ان کی زیادہ تعداد مزدور پیشہ ہے، وہ اسلامی تعلیمات سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اکثر پنج وقتہ نماز کے پابند نہیں ہیں، صرف نماز جمعہ پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں کچھ نے اسلامی ناموں کو چھوڑ کر مسیحی نام اختیار کر لیے ہیں، اور اسلامی انجمنوں سے ان کا کوئی ربط وضبط باقی نہیں ہے، ان مہاجر مسلمانوں میں کچھ پڑھے لکھے ڈاکٹر، انجینیر، ہنرمند بھی ہیں مگر انھوں نے کسب معاش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے، ان کو عملاً اسلامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں، صرف زبانی اسلام کا دم بھرتے ہیں، اسی بے عملی کی وجہ سے آج تک آسٹریلیا میں مسلمان دینی د

سیاسی قوت بن سکے نہ اپنا وزن و وقار قائم کرا سکے،

مسلمانوں کو درپیش خطرات آسٹریلیا کے مسلمان بڑے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں استعماری قوتیں نہیں چاہتی ہیں کہ ان کے قدم یہاں جم جائیں، وہ عیسائی مشنریز کو اس غرض سے استعمال کر رہی ہیں، ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ان کے دین سے منحرف کرکے عیسائی بنالیں، اور بڑی عمر کے مسلمانوں کو عیسائی عورتوں سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرکے اسلام سے بے تعلق کردیں، اسی کے ساتھ قادیانیت نے اپنی دلفریب چالوں سے مسلم عوام کو گمراہ کرنا شروع کیا ہے، وہ بھی مشنری اسپرٹ سے کام کر رہے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے عقائد میں انقلاب پیدا کرسکیں، ان دو عظیم خطروں کی موجودگی میں مسلمانوں کے آپسی اختلافات بھی ان کے شیرازہ کو منتشر کر رہے ہیں، اور ان اختلافات سے ان دونوں اسلام دشمن تحریکوں کو غذا مل رہی ہے،

دعوت اسلامی کا موقف دعوت اسلامی کے سلسلہ میں محتاط اندازہ یہ ہے کہ آسٹریلیا میں اسلام کو صحیح، قوی اور مؤثر صورت میں ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے، چند نفوس اپنی انفرادی جدوجہد سے دعوت اسلامی کا کام انجام دے رہے ہیں، اگر یہ انتشار دور ہوجائے اور اجتماعی طور سے دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دیا جائے تو باطل قوتیں سرنگوں ہوسکتی ہیں،

یہ صورت حال بڑی روح فرسا ہے کہ باپ دادا کا نام تو محمد و احمد تھا لیکن آج ان کی اولاد پطرس یا جارج کے نام سے موسوم ہے، یہ لوگ مردوں کو عیسائی قبرستان میں بھی دفن کرنے لگے ہیں، اور اتوار کے دن گرجا گھروں

کاروبار بھی کرتے ہیں، غیر صحیح ذبیحہ بھی کھاتے ہیں اور عیسائی عورتوں سے شادی کرتے ہیں بلکہ اس سے گزر کر مسلمان عورت عیسائی مرد سے رشتۂ مناکحت قائم کرتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کو خیرباد کہہ چکا ہو لیکن اگر مسلمان اپنے کو دعوت اسلامی کیلئے منظم کریں تو یہ افسوسناک حالت ختم ہوسکتی ہے اور نور الٰہی کو پھونکوں سے بجھانے والے زیر ہوسکتے ہیں۔

اسلامی فرض: آسٹریلیا میں آج دعوت اسلامی کی تقویت و توسیع کیلئے مندرجۂ ذیل چیزیں درکار ہیں اگر یہ بہم ہوجائیں تو یہ براعظم اسلام کی پاک تعلیمات کا امین بن جائے؟

۱۔ اس براعظم میں ایک ایسے مرکز کا قیام عمل میں آئے جہاں سے دعوت اسلامی کا کام منظم طریقہ سے انجام پائے، یہ مرکز مسلمانوں کے مسائل بھی حل کرے اور اگر ضرورت ہو تو ارکان حکومت کے روبرو ان کی ترجمانی بھی کرے، اس مرکزی نظام کے ساتھ صوبوں میں بھی اس قسم کے ادارے قائم کئے جائیں۔

۲۔ قرآن مجید کی تعلیم کا خاص طور سے انتظام کیا جائے۔

۳۔ عرب اور مسلم حکومتیں حکومت آسٹریلیا کو اسلامی مدارس کے قیام پر آمادہ کریں، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیم حاصل کرسکے۔

۴۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی زبان بھی شامل کیجائے اور عرب حکومتیں اسکے لئے لائق اساتذہ فراہم کریں، نیز عرب اور مسلم حکومتیں آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں سے علمی و ثقافتی تعلقات قائم کریں۔

۵۔ عرب ممالک اور اسلامی حکومتیں آسٹریلیا کے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لیں ان کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کریں۔

۶۔ اسلامی اور عرب جامعات آسٹریلیا کے مسلمانوں کو اپنے یہاں تعلیم کے مواقع مہیا کریں اور اس سلسلہ میں انکی مالی مدد کریں۔

۷۔ رابطۂ عالم اسلامی اور وزارت حج و اوقاف سعودی عرب حکومت آسٹریلیا کو آمادہ کریں کہ وہ ہر سال مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کو سفر حج کی اجازت دے، ممتاز مسلمانوں کو سعودی حکومت کی طرف سے ایک دعوت بھی دیجائے۔

۸۔ اسلامی حکومتوں کی طرف سے لائق واعظین اور ائمۂ مساجد کا بھی انتظام کیا جائے۔

غزل

از ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، الہ آباد

غم آرزو کی تلاش تھی، ہے غم زندگی کی تلاش ہے
دل خوگر غم عشق کو غم واقعی کی تلاش ہے

نہ مسرتوں کی ہے جستجو نہ ہماہمی کی تلاش ہے
جو سکوت قلب عطا کرے اسی آگہی کی تلاش ہے

نہیں ربط کوئی اے ہم نفس مرے اور تیرے مذاق میں
میں خلیل وقت کا منتظر تجھے آزری کی تلاش ہے

کسی اہل دل سے کہو ذرا کہ جلا کے دل کرے روشنی
کہ فضائے عہد جدید کو نئی روشنی کی تلاش ہے

جو تمیز باطل و حق کرے جو خطا و شرک سے پاک ہو
وہی زندگی مجھے چاہیے اسی زندگی کی تلاش ہے

اسی میکدہ میں ہیں ہم سبھی پہ طلب ہے سب کی جدا جدا
تجھے بےخودی کی ہے آرزو مجھے آگہی کی تلاش ہے

ہیں اگرچہ کتنے ہی غمگسار و رفیق غم اسی شہر میں
دل غمزدہ کو نہ جانے کیوں کسی اجنبی کی تلاش ہے

کہوں بات کوئی تو سہہ سکے جو مزاج میرا سمجھ سکے
مجھے اے طفیلؔ بہر قدم اسی آدمی کی تلاش ہے

غزل

از ڈاکٹر افتخار احمد فخر ایم۔ جے کالج جلگاؤں

زیر قدم قمر ہے کبھی کہکشاں کبھی
خاموش بیٹھتا نہیں عزم جواں کبھی

ہوتی جو دور رس نگہ باغباں کبھی
لٹتا بہار میں نہ مرا آشیاں کبھی

اک حال پر یہ تھی روش گلستاں کبھی
آئی کبھی بہار تو آئی خزاں کبھی

گمراہ خود ہی ہوتے نہ گر رہبران قوم
منزل سے دور رہتا نہ یہ کارواں کبھی

ہے دور لامکاں سے حد نگاہ سے
اس کو اسیر کر نہ سکے گا گماں کبھی

کیا بات ہے لنڈھائے چلا ہے جو خم پہ خم
تھا اتنا مہرباں نہ پیر مغاں کبھی

کیوں آج ہیں وہ خاک بسر اور منفعل
تھا جن کی ٹھوکروں میں یہی خاکداں کبھی

کیا گل کھلا رہا ہے زمیں پہ یہ آدمی
سوچا بھی تو نے خالق کون و مکاں کبھی

برسے وہ آگ فخر جہاں ہیں کہ الاماں
آنکھوں سے گر بیاں ہو سوز نہاں کبھی

غزل

از جناب شمسی قریشی جلال پوری فیض آباد

کبھی یہ صبح درخشاں کبھی یہ شب کی نمود
ہزار رنگ بدلتا ہے روز چرخ کبود

وجود عشق سے جن و بشر و ملک کا وجود
وگرنہ عالم ہستی تمام تر بے بود

پلا دے پھر مرے ساقی مئے انا المعبود
بنا لیے ہیں جہاں نے ہزار ہا معبود

دعا کرو یہ خدا سے خلیلؑ کا ہو ورود
بھڑک اٹھی ہے جہاں میں پھر آتش نمرود

گنہگار ہوں در کرم مجھے مطلوب
مجھے عزیز مئے انفعال کی ہر بوند

بغیر ہمت عالی، بغیر عزم صمیم
خیال منزل مقصود بھی عبث بے سود

ہر ایک ذرے سے شمسی عیاں ہے جلوۂ طور
تجھی میں ذوق نظارہ ہے بے خبر مفقود

مطبوعات جدیدہ

آپ بیتی: - مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر، برولیا، لکھنؤ۔

یہ اردو کے مشہور ادیب و انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اس کے اندر ان کی پوری زندگی کا مرقع ہے، بچپن سے بڑھاپے تک وہ جن مراحل سے گذرے، اور جس نشیب و فراز سے دو چار ہوئے، اسے بے کم و کاست قلمبند کر دیا ہے، اپنی سرگذشت سے پہلے اس ماحول کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں، اس میں خاندان کی تاریخ بھی ہے اور ماں باپ بھائی بہن اور عزیز و اقارب کا تذکرہ بھی، اسکے بعد ہیرا لشن بسم اللہ، اسکول اور کالج کی تعلیمی و تہذیبی زندگی، شادی، اردو اور انگریزی مضمون نگاری اور صحافت کی داستان سنائی ہے، اس سلسلہ میں الحاد کی طرف میلان اور اسکے علل و اسباب کا ذکر کیا ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ کسطرح اس میں کمی ہوئی اور از سر نو مذہبی رنگ قائم ہوا، اس سلسلہ میں مولانا محمد علی اور اکبر الہ آبادی کے مخلصانہ اور حکیمانہ مشوروں کا بڑا اثر پڑا، اس سرگذشت کے بعد مجلس خلافت سے تعلق، بیعت و ارادت، تصنیف و تالیف اور ذوق شعر و سخن کا حال تحریر کیا ہے اور اپنی مالی حالت، جسمانی صحت، سفر اور خاص خاص معمولات و عادات کا ذکر کیا ہے، آخر میں ان اشخاص کا تذکرہ ہے جن سے ان کو عقیدت و محبت تھی، اس میں بزرگوں، استاذوں،

ہم عصروں اور ہمسروں کے ساتھ چند خوردوں اور عزیزوں کا بھی فراخ دلی سے ذکر ہے
اس سلسلہ میں مولانا نے بعض ملازموں اور خدمت گذاروں کو بھی فراموش نہیں کیا،
اسی طرح جن لوگوں کے حقوق کی ادائگی میں ان سے کوتاہی ہوئی یا جن سے ان کو اذیت
پہنچی ہے ان کا بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ذکر ہے، مولانا کی قوت مشاہدہ بہت تیز اور نگاہ
بڑی نکتہ شناس تھی، اس لیے چھوٹا بڑا کوئی قابل ذکر واقعہ نظر انداز نہیں ہونے
پایا، اپنی لغزشوں کے ساتھ دوسروں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو بھی فراموش
نہیں کیا ہے، اور گفتنی ناگفتنی سبھی باتیں بیان کر دی ہیں، ان کے سحر نگار قلم نے جذبات کی
ترجمانی اور واقعات کی تصویر کشی بڑے دلفریب انداز میں کی ہے، یہ کتاب صرف مولانا
کی آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بھی ہے اس میں ان کے عہد و ماحول کی سرگذشت اور اس
دور کے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، یہ اودھ کی تہذیب و معاشرت
اور وہاں کے شرفا اور زمیندار گھرانوں کا ایسا آئینہ ہے جس میں اس کی خوبیاں
اور خامیاں دونوں نظر آتی ہیں، مولانا کے مشاہدات، تاثرات اور تجربات بڑے
سبق آموز ہیں، ان کے سحر طراز قلم نے اس سبق آموزی میں ایسی دلآویزی پیدا کر دی
ہے کہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد رکھنے کو جی نہیں چاہتا، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی
ندوی نے مولانا کے ادب و انشاء کی خوبیاں اور اس آپ بیتی کی خصوصیات تحریر
کی ہیں، مگر اس کی قیمت زیادہ ہے،

تجلیات حق:۔ از ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت
بہتر صفحات ۵۰۳ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے پتہ مرکز تحقیقات و اشاعت
علوم قرآنی، جونپور۔

اس کتاب میں خدا کے وجود کے دلائل بیان کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی آیتوں کے علاوہ موجودہ سائنسی انکشافات بھی پیش کیے گئے ہیں، مصنف نے اپنے دلائل آفاق وانفس کے نام سے دو حصوں میں تقسیم کئے ہیں، پہلے حصے میں کائنات کی تخلیق، اس کے نظم و تدبیر، اس میں کارفرما حسن و جمال اور حکمت و کاریگری اور اس کے اندر کی بعض عظیم الشان نعمتوں کا ذکر کرکے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے، اور دوسرے میں انسان کے مادۂ تخلیق، خلقت کے مدارج، جسمانی نظام، عقل، شعور، ارتقا اور تقدیر وغیرہ پر گفتگو کرکے خدا کے وجود کی دلیلیں فراہم کی ہیں اور دکھایا ہے کہ خود موجودہ سائنسی حقائق سے بھی خدا کا وجود پوری طرح ثابت ہے، آخر میں قرآن کے الہامی اور غیر انسانی کلام ہونے کے شواہد بیان کرکے خدا کا وجود ثابت کیا ہے، اس ضمن میں پانچ قرآنی آیتوں کے مضامین کی نئی سائنسی تحقیقات سے مطابقت بھی واضح کی ہے، جدید فلسفہ و سائنس نے مطالعۂ کائنات کے جو جدید اسلوب وضع کیے ہیں ان کی علمی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود مصنف سائنسی تحقیقات کے سارے ذخیرہ کو درست نہیں مانتے، ان کے خیال میں گو موجودہ سائنس سے قرآن اور مذہب پر کوئی زد نہیں پڑتی، تاہم جہاں دونوں میں موافقت نہ ہو وہاں قرآن ہی کا بیان صحیح مانا جائے گا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اور سائنس کے بارہ میں ان کا ذہن صاف ہے، لیکن ارتقا اور بعض دوسرے مسائل میں ان کے خیالات پوری طرح واضح نہیں ہیں، اگرچہ اس موضوع پر پہلے بھی بہت لکھا جا چکا ہے، لیکن چونکہ یہ کتاب زمانہ کے موجودہ حالات اور جدید ذہن کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اس کے اندر فلسفہ و سائنس کے ماہرین کی تحقیقات اور مفید معلومات جمع کی گئی ہیں، اس لیے امید ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ

گے ہے اس کا مطالعہ مفید ہوگا'

تاریخ اودھ کا :۔ مرتبہ جناب احمد علی خاں صاحب' متوسط تقطیع' کاغذ'
مختصر جائزہ کتابت وطباعت اچھی' صفحات ۲۴۴ مجلد مع گردپوش'
قیمت تین روپے پتہ :۔ واجد علی شاہ اکاڈمی پبلک واپ کمپنی' مقابل کالج
امین آباد' لکھنؤ'

مولوی نجم الغنی نے اودھ کی تاریخ بڑی تفصیل سے لکھی ہے لیکن انکی متعدد ضخیم جلدوں کا پڑھنا آسان نہیں ہے' اس لیے اس موضوع پر مختصر کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں مولانا عبد الحلیم شرر کی "گذشتہ لکھنؤ" بہت مشہور ہے' پیش نظر کتاب اودھ کی سلطنت کی مختصر تاریخ ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے' پہلے اور دوسرے باب میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے عہدہ داروں کے متعلق معلومات درج ہیں' تیسرے باب میں اودھ کی وجہ تسمیہ اور اس کے دونوں صدر مقاموں فیض آباد اور لکھنؤ کی گذشتہ شان و شوکت کا ذکر ہے' چوتھے باب میں اودھ کے حکمرانوں کی تخت نشینی اور ان کے واقعات و حالات درج ہیں' پانچویں باب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بیگم حضرت محل اور نواب برجیس قدر کی سرگرمیوں اور انگریزوں کے مقابلہ میں ان کی صف آرائی کی تفصیل پیش کی گئی ہے' آخری باب میں سلطنت کے نظم و نسق اور کارناموں کا ذکر ہے' اس کتاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاری' اس کے عہدہ داروں کی چالبازی اور انگریزوں کے جبر و تشدد اور استحصال بیجا کی پردہ دری کی گئی ہے' اور شاہان اودھ کی فیاضی و علم دوستی' رواداری' رعایا پروری' اور ان کے عہد کے سیاسی' معاشی' اقتصادی حالات بیان کیے گئے ہیں' شروع میں برجیس قدر کی شبیہ اور آخر میں اودھ کی

سلطنت کا نقشہ دیا گیا ہے، مصنف نے یہ شکایت کی ہے کہ برطانوی دور میں اودھ کی جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں اس کے حکمرانوں کی نااہلی اور نکمے پن کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، اگرچہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ نہیں ہے، مگر اس میں مبالغہ آرائی بہت کی گئی ہے، مصنف نے ان الزامات کی تردید کی ہے، اور شاہان اودھ کے اچھے کاموں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے،

امرت بانی:۔ مرتبہ ڈاکٹر عبد الستار دلوی، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۵۰، قیمت بیس روپے، پتہ (۱) مہاتما گاندھی، ریسرچ سنٹر، ایم۔ جی۔ ایم بلڈنگ، بمبئی، (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی،

یہ ہندی اور اردو کی ملی جلی شاعری کا ایک انتخاب ہے، اس کا مقصد اس گنگا جمنی زبان کا نمونہ پیش کرنا ہے، جو ناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی اور ملک کے تقریباً ہر خطہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسی کو گاندھی جی "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے، اور ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے اسی کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے، یہ انتخاب تین حصوں پر مشتمل ہے، ایک حصہ میں غزلیں، دوسرے میں نظمیں، گیت، اور بھجن، اور تیسرے میں رباعیاں، دوہے، اور چوپدے شامل ہیں، تینوں حصوں میں ہر دور کے شعرا کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، اس طرح بو علی قلندر، امیر خسرو، کبیر، میرا بائی، الکھنا تھ، سوامی، محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، تلسی داس، چندر بھان برہمن، عبد الرحیم خان خاناں اور ابو الحسن تانا شاہ جیسے قدیم شاعروں سے یہ سلسلہ شروع ہو کر اس دور کے شاعروں پر ختم ہوتا ہے، اس میں ہندوستان و پاکستان، مسلمان اور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے، آخر میں مشکل لفظوں

کے معنی، شعرا کا مختصر تعارف اور ان کے کلام کی تلمیحات اور تاریخی اشاروں کی وضاحت کی گئی ہے، اور شروع میں "ہندوستانی" زبان میں لکھا گیا ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں خصوصاً اردو، ہندی اور ہندوستانی اور ان کی شاعری کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، انتخاب سلیقہ اور محنت سے کیا گیا ہے اور اس سے اردو و ہندی شاعری پر مصنف کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے،

دیوان ناطق:۔ مرتبہ جناب محمد عبد الحلیم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپیے

پتہ: محمد عبد الحلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگ پور نمبر ۱ مہاراشٹر،

سید ابو الحسن ناطق گلاؤٹھی مرحوم اردو کے اچھے ادیب و شاعر تھے، ان کے ابتدائی دور کی نظموں کا ایک مجموعہ بہت پہلے چھپا تھا، مگر اس کے بعد کے کلام کا زیادہ حصہ تلف ہوگیا، اور جو باقی رہا وہ ادھر ادھر منتشر حالت میں تھا، کچھ عرصہ پہلے جناب ناطق مرحوم کے ایک قدر داں جناب عبد الحلیم نے ان کے مضامین و مکتوبات کا ایک مجموعہ اور دیوان غالب کی شرح کنز المطالب شائع کی تھی، اور اب منتشر کلام کو جمع کرکے شائع کیا ہے، یہ دو سو غزلوں، کچھ نظموں، سہروں، تضمینوں، رباعیوں، متفرق اشعار، اور قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں ناطق کے خاندانی حالات، ان کی تعلیم اور عام واقعات زندگی کے علاوہ ادبی کمالات اور تصنیفات کا ذکر ہے، انھوں نے یہ دیوان شائع کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے، جو لائق تحسین ہے۔
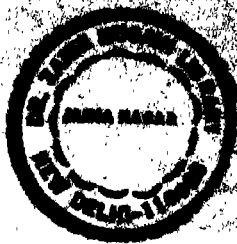
"ض"

جون سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ـ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمن (مرتب)
۵۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (مرتب)

بکثرت اضافوں کے ساتھ دو کتابوں کے نئے اڈیشن

بزم تیموریہ جلد اول

اس جلد میں شروع کے تین مغل

بادشاہ بابر، ہمایوں، اور اکبر کے علمی ذوق اور ان میں سے ہر ایک کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء، شعراء کا تذکرہ، اور ان کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، بعد کی جلدوں میں جو زیر ترتیب ہیں، بعد کے مغل سلاطین اور شاہزادوں کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوگا۔

قیمت:۔ ۳۲-۲۵

بزم صوفیہ

تیموری عہد سے پہلے کے تمام ممتاز

صاحب تصانیف صوفیہ کرام، مشائخ عظام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ اجمیری، بختیار کاکی، قاضی ناگوری، نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات تعلیمات و ملفوظات جس میں آٹھویں صدی کے مشہور شیخ طریقت عبدالحق نوشہ ردولوی کے حالات کا مستقل اضافہ ہے۔

قیمت:۔ ۱۹-۲۵

[illegible]

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۲۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

وفیات

شذرات

مولانا محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات کو اڑتالیس برس ہو گئے، اُن کی صد سالہ سالگرہ ہندوستان اور پاکستان میں بڑی عقیدت سے منائی گئی، سیمینار بھی ہوئے کانفرنسیں بھی ہوئیں، رسالوں اور اخباروں کے نمبر بھی شائع کئے گئے، اُن کی خدمت کا اعتراف بڑی عقیدت، عزت، اور محبت سے کیا جا رہا ہے، وہ خود کہہ گئے تھے،

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر ـــــ مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

اُن کی سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ یہ ہے کہ وہ کبھی لائڈ جارج، کبھی لارڈ ریڈنگ، کبھی ریمزے میکڈانلڈ، کبھی ابن سعود، کبھی مصطفےٰ کمال، کبھی گاندھی جی، کبھی موتی لال نہرو، کبھی کسی عالم، کبھی کسی اڈیٹر، اور اپنے کسی مخلص ترین دوست سے لڑے، مگر اپنی ان لڑائیوں میں وہ ترکی میں خلافت کو نہ بچا سکے، حجاز میں شرعی جمہوریت قائم نہ کرا سکے، ہندوستان میں مسلمانوں کو ان کے حقوق نہ دلا سکے، ساردا ایکٹ کو منسوخ نہ کرا سکے، ہندو مسلم اتحاد قائم نہ کرا سکے، پھر ہندوستان کی آزادی بھی اُن کی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی جس کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی، اس لئے ظاہر بینوں کی نظر میں انہوں نے جیتے جی کچھ نہ دکھلایا، مگر جس شان اور آن بان سے وہ مختلف مورچوں پر لڑائیاں لڑتے رہے، وہی ان کا اصلی کارنامہ ہے، اُن کی زندگی سے یہ پیام ملتا ہے کہ لڑائی میں دہکتی ہوئی روح، لپکتے ہوئے ضمیر اور دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ پسپائی ہو جائے، تو صحیح معنوں میں یہی فتح و کامرانی ہے،

اُن کی قیادت سے ہم کو یہ درس ملا ہے کہ ایک قائد میں ہمت مردانہ، جرأت رندانہ، قلندرانہ جوش، شاہین کا جگر، اور چیتے کا کلیجہ ہو، اور وہ جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا جانتا ہو، تو ظاہری فتح و کامرانی نہ بھی ہو، مگر اس سے عدو کانپ سکتا ہے، غنیموں کے دل دہل سکتے ہیں، ان کی صف شکنی ہو سکتی ہے، پست حوصلے بلند کئے جا سکتے ہیں،

———•———

آج ہم مسلمانوں میں کون ایسا جری ہے کہ جو یہ بانگِ دہل کہہ سکے کہ جہاں تک خدا کے احکام کی تعمیل کا تعلق ہے میں اوّل مسلمان ہوں بعد میں مسلمان ہوں، آخر میں مسلمان ہوں اور کچھ بھی نہیں صرف مسلمان ہوں، مگر جہاں تک ہندوستان کی فلاح و بہبود کا تعلق ہے میں پہلے ہندوستانی ہوں آخر میں ہندوستانی ہوں، اور کچھ بھی نہیں صرف ہندوستانی ہوں،

انھوں نے یہی مسلک ہندوستانی مسلمانوں کو اختیار کرنا سکھایا، اس میں کوئی نقص نہیں، محب مذہب ہی محب وطن ہو سکتا ہے، مذہب سیاست کو خراب نہیں کرتا، سیاست مذہب کو آلودہ کرتی ہے، گاندھی جی مہاتما بن کر دلوں پر حکمرانی کرتے رہے، وہ بہترین ہندو اور بہترین وطن دوست تھے، ہندومت کے پجاری بن کر ہندوستان کے بھی پجاری ہوئے، مسلمانوں میں کچھ رہنما ایسے بھی ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں، پھر مسلمان ہیں، یہ رہنما زیادہ تر ایسے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد اور مصالح کی خاطر پہلے ہندوستانی اور پھر بعد میں مسلمان بنتے ہیں، مگر جب اُن کی ذاتی غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ نہ ہندوستانی اور نہ مسلمان باقی رہتے ہیں، اُن کی حیثیت جرمن سلور کی ہو جاتی ہے، جو نہ جرمن ہوتا ہے اور نہ سلور،

مولانا محمد علی کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ ایک اچھے رہنما کے لئے ضروری ہے، کہ وہ پہلے اپنے نفس کی تربیت کرے، پھر اپنے خاندان اور کنبے والوں کو تنظیم کرے، کیونکہ منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک ملت اور نہ ایک قوم کی تنظیم ہو سکتی ہے، جو شخص اپنے خاندان اور کنبہ کی تنظیم نہیں کر سکتا وہ اپنی ملت کے سود و بہبود کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، وہ بھلا قوم اور ملک کے لئے کیا کر سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس ارتقا کی ہر منزل میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس منزل سے آگے بھی منزلیں ہیں، آخر میں نہ فقط اپنا نفس ہے نہ اپنا کنبہ ہے، نہ اپنی ملت ہے، نہ اپنی قوم ہے، بلکہ بنی نوع انسان ہے، اور اس سے بھی آگے مخلوق اور کائنات ہے،

اس طرح مولانا محمد علی کی قیادت ملیت، قومیت اور خدمت انسانیت کے اعلیٰ اور ارفع تخیلات پر مبنی تھی وہ اپنی ملت اور اپنی قوم کی خدمت کی منزلیں طے کر رہے تھے کہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، انھوں نے

ان دونوں کی خدمت میں جو مبارک آمیزش پیدا کی، وہ ہندوستان کے موجودہ مسلمان رہنماؤں کے لئے مثال ہے کہ امتِ محمدیہ کے لئے سوگوار رہ کر وطن کے لئے بھی وفادار رہا جا سکتا ہے، اسلام کے لئے پرزور آواز بلند کر کے ملک کے لئے بھی صدائے صور پھونکی جا سکتی ہے، مسلمانوں کی ہر مصیبت پر بے تاب ہونے کے ساتھ برادرانِ وطن کے لئے بھی سینہ سپر ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی،

مگر یہ ممکن العمل اس وقت ہے جب فکر و نظر کی مبارزطلبی میں بلندی اور عالی ظرفی ہو حق و صداقت کے اعلان میں سیاسی ریاکاری کے بجائے مخلصانہ بے باکی اور فراخدلی ہو، دعوت و تبلیغ میں پختگی اور اولوالعزمی بھی ہو، یہ ساری باتیں مولانا محمد علی میں تھیں جن کی قدر اہلِ دل، اہلِ توفیق اور اہلِ بصیرت ہی کرتے رہیں گے،

اب جب کہ ہندوستانی مسلمان ایک موثر قیادت سے محروم ہو رہے ہیں تو مولانا محمد علی یاد آتے ہیں، اور اکثر یاد آتے ہیں، اُن کی قیادت میں مسلمانوں نے گھر بار چھوڑ کر مال و دولت لٹا کر عیش و راحت سے منہ موڑ کر، دوش پر کفن اور ہتھیلی پر سر رکھ کر سیاست میں داخل ہونا سیکھا تھا، اور اپنی سیاسی زندگی میں بڑی حرارت اور حرکت پیدا کر لی تھی، مسلمان وہی ہیں، مگر اب وہ راکھ کے ڈھیر ہیں، صرف اس لئے کہ ان میں کوئی محمد علی نہیں، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اُن کو ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے جو اُن کو اُن کی سیاسی زندگی میں ملیت اور وطنیت کا درس دے کر اُن میں جرأت، ہمت، دیانت، اخلاص اور یقینِ محکم پیدا کرے،

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے ۔۔۔ کہ خم کے خم بھرے ہیں اور میخانہ خالی ہے

پاکستان کے مشہور اہلِ علم اور صاحبِ قلم جناب بشیر احمد ڈار کی وفات کی خبر دیر میں ملی، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت فرمائیں وہ اقبالیات کے بڑے واقف کار اور ماہر تھے، اپنے علمی کمالات کے ساتھ اپنی شرافتِ اخلاق، انکسار اور وضعداری کی وجہ سے اپنے دوستوں اور ملنے والوں میں بہت مقبول تھے، آیندہ اشاعت میں ان پر ایک تعزیتی مقالہ شائع ہوگا،

کاغذ کی گرانی کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی قیمتوں میں آیندہ کچھ اضافہ ہو جائے گا،

مقالات

قاضی زادہ رُومی مُصنّفِ شرحِ چغمینی

احوال و آثار

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم، اے ایل ایل بی، ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علی گڑھ

(۲)

ماوراء النہر کا علمی ماحول | چنگیز کی طرح تیمور نے بھی مشرق وسطیٰ کو روند ڈالا تھا، مگر اس کے برخلاف وہ جس علاقہ کو فتح کرتا تھا وہاں سے زر و جواہر کے ساتھ ارباب کمال کو بھی اپنے ہمراہ لا کر دار السلطنت کی زیب و زینت بناتا تھا۔ صاحبِ حبیب السیر نے لکھا ہے:۔

"و از ہر مملکت کہ تحت تصرفش در آمد، علماء و فضلا و مہندسان و ہنرمندان را کوچانیدہ و قرین اعزاز و اکرام بماوراء النہر رسانید۔"[۱]

چنانچہ جب اس نے ۷۸۱ھ میں خوارزم پر حملہ کیا تو ملک محمد سرخسی نے اس سے درخواست کی کہ فتح کے بعد مولانا سعد الدین تفتازانی کو وہاں سے سرخس بھیج دیا جائے۔ تیمور نے فتح کے بعد ایسا ہی کیا، مگر ماوراء النہر کے علماء و مشائخ نے جو علامہ سعد الدین تفتازانی کے علم و فضل سے متاثر تھے بادشاہ سے شکایت کی:۔

"اگرچہ تسخیر خوارزم بندگان آستان سلطنت آشیاں را تیسیر پذیرفت، اما حاصل

---

[۱] حبیب السیر جلد سوم جزو سوم ص ۸۸

آں مملکت ملک محمد سرخسی گرفت ہا[1]

اور جب تیمور کو معلوم ہوا کہ "حاصل آں مملکت" سے ان کی مراد علامہ سعد الدین تفتازانی سے ہے تو اس نے باصرار والحاح تمام علامہ کو سرخس بلا بھیجا اور انتہائی عزت واحترام کے ساتھ اپنے دربار میں رکھا، صاحب حبیب السیر لکھتے ہیں :-

"امیر تیمور در تعظیم آں پادشاہ علماء و خسرو دانشمندان مبالغہ بسیار می نمود و در مجالس آنجناب را زیر توشک خویش جای داد و در وقت مراجعت تا سر طناب پیش خانہ مشایعت می فرمود"[2]

اسی طرح جب ۷۸۹ھ میں شیراز پر حملہ کیا اور فتح کے بعد مغل غارتگروں کی رسم معہود کے مطابق شہر میں لوٹ مار مچائی تو وزیر نے میر سید شریف جرجانی کے دولت کدہ کو دارالامن قرار دیدیا، سپاہیوں کو حکم تھا کہ جو ان کے مکان میں پناہ — اس کے جان و مال سے تعرض نہ کیا جائے، امن قائم ہونے کے بعد اس عزت واحترام کے بدلے میں انھیں سمرقند آنا پڑا،[3] جہاں وہ تیمور کی وفات تک انتہائی اعزاز واکرام کے ساتھ (علامہ تفتازانی سے بھی زیادہ، اگرچہ اپنی طبیعت کے خلاف) مقیم رہے،

اسی طرح جب ۸۰۳ھ میں دمشق پر حملہ کیا اور لشکر نے فتح کے بعد قتل وتعذیب کا سلسلہ شروع کیا تو بقیۃ السیف میں قرأت کے مشہور عالم مولانا شمس الدین محمد جزری، سید محمد بخاری اور مولی شمس الدین فناری بھی مفرورین کے ساتھ بھاگ

---

[1] حبیب السیر ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۸۵ [3] الشقائق النعمانیہ ص ۴۴

نے لشکر نے پکڑ لیا اور گرفتار کر کے تیمور کے پاس لائے[1] جب اسے شیخ محمد جزری کے علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو انھیں دارالسلطنت لے آیا جہاں وہ اس کی وفات تک بڑے عزت و احترام سے رہے،

اس سے پہلے جب ۸۰۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور فتح کے بعد بہت سے قیدی دربار میں لائے گئے تو ان میں مولانا احمد تھانیسری بھی تھے، ان کی علمی گفتگو سے تیمور اتنا متاثر ہوا کہ انھیں سمرقند چلنے پر مجبور کیا، مگر وہ راتوں رات دہلی سے نکل بھاگے[2]

اس طرح ممالک مفتوحہ کے نفائس و رغائب ہی سے تیمور نے سمرقند کی ثروت میں اضافہ نہیں کیا، مختلف ممالک کے باشندوں کو دارالسلطنت میں جمع کر کے اسے عروس البلاد بنا دیا، ان میں سے بعض مشاہیر حسب ذیل ہیں،

علامہ سعد الدین تفتازانی، میر سید شریف جرجانی، شیخ شمس الدین محمد جزری، مولانا شمس الدین محمد شافعی، سید برہان الدین اشرف بن مبارک شاہ، شیخ بہاء الدین یحیٰ بن عبد اللہ، شیخ بدر الدین حنفی، شیخ سراج الدین، مولانا حمید الدین شاشی، مولانا نظام الدین شامی، قاضی قطب الدین بن عبد اللہ امامی، مولانا صفی الدین ختلانی، مولانا نجم الدین طارمی، خواجہ علی تبریزی، مولانا حسام الدین بن ابراہیم شاہ، مولانا عبد اللہ بن لسان الدین محمد[3]

تیمور نے ۸۰۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، پہلے کچھ دن اس کا پوتا خلیل سلطان اور پھر بیٹا شاہ رخ اس کے جانشین ہوئے، شاہ رخ کا طویل عہد حکومت نے

---

[1] حبیب السیر ص ۵۰ [2] اخبار الاخیار ص ۱۵۱ نیز سبحۃ المرجان ص ۲۰ [3] حبیب السیر ص ۹۵-۹۲

ممالک کی فتح کے بجائے ملک موروثی پر قبضہ مستحکم بنانے میں گذرا، بایں ہمہ اس نے بھی علمی سرپرستی کی روایات کو زندہ رکھا، اس کے عہد کے علماء و فضلاء میں حسب ذیل باکمال مشہور ہیں:

مولانا شمس الدین محمد تفتازانی، مولانا جلال الدین یوسف اوبہی، مولانا نورالدین لطف اللہ المشہور بحافظ ابرو، خواجہ نورالدین عبدالرحمن جامی، مولانا رکن الدین خوافی، مولانا کمال الدین خوارزمی، سید صدرالدین یونس، مولانا جلال الدین، خواجہ صاین الدین علی اصفہانی، مولانا جمال الدین عبدالغفار سمرقندی، امیر... پسر میر سید شریف، عبدالقادر مراغی، مولانا شمس الدین علی، مولانا زادہ ابہری وغیرہم[1]۔ ان میں چار باکمال اس کے دربار کے چار رتن تھے، جن کے بارے میں دولت شاہ لکھتا ہے:

گویند چہار ہنرمند در پائے تخت شاہرخ بودند کہ بروزگار خود نظیر نداشتہ اند، خواجہ عبدالقادر مراغی در علم ادوار و موسیقی، و یوسف اندکانی در خواندگی و حفظ الحانی واستاد قوام الدین در ہندسی و طراحی و معاری، و مولانا خلیل اللہ مصور کہ ثانی مانی بود[2]

شاہرخ نے ۸۵۰ھ میں انتقال کیا اور اس کا جانشین اس کا بیٹا الغ بیگ ہوا، وہ خود صاحب علم و فضل تھا، اور اہل فضل و کمال کا قدر دان، اس کے علم و فضل کے بارے میں عبدالرزاق کاشی نے "مطلع السعدین" میں لکھا ہے:

"مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود[3]"

اسی طرح صاحب "حبیب السیر" اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

دانش جالینوس باحشمت کیکاؤس جمع فرمودہ ودر سایر فنون خصوصاً علم ریاضی

---

[1] حبیب السیر ص ۲۴ ۱۵ [2] تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ص ۲۲۱ [3] مطلع السعدین ص ۲۱۰

ونجوم در ایام دوران عدیل و نظیر نداشت"[۱]

دولت شاہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

"اما شاہ مغفور سعید الغ بیگ گورگانی سقی اللہ روضتہ و انار اللہ برہانہ

بادشاہ عالم عادل قاہر صاحب ہمت بود و در علم نجوم مرتبہ عالی یافت و در

معانی موئے شگافت"[۲]

الغ بیگ خود صاحب فضل و کمال ہونے کے ساتھ علم دوست و علماء نواز

بھی تھا، صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:-

"پیوستہ ہمت بر تربیت اہل فضل و کمال می گماشت"[۳]

دولت شاہ اسکی علم دوستی اور فضل نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:- "وے

درجہ عالمان بحد او بذروۂ اعلی بودہ و فضلا را بدوران او مرتبہ عظمی"

صاحب "حبیب السیر" نے اس کے زمانہ میں علماء کا ذکر کرنے سے پہلے اس کی

علم نوازی کے بارے میں لکھا ہے:

"چوں بادشاہ عالی جاہ میرزا الغ بیگ بوفور علم و فضل از سائر اولاد و امجاد

حضرت صاحبقرانی امیر تیمور گورگانی امتیاز تمام داشت و همواره همت عالی نہمت

بر تربیت و رعایت علماء و فضلاء می گماشت و در زمان دولتش جمع کثیر از آن

طائفہ در بلدہ سمرقند مجتمع گشتہ بودند و در ظلال دولت و اقبالش در غایت

فراغت و رفاہیت می غنودند"[۵]

---

[۱] حبیب السیر ص ۱۵۱ [۲] تذکرہ دولت شاہ ص ۵۰۴-۴۹۳ [۳] حبیب السیر ص ۱۶۹ [۴] تذکرۂ دولت شاہ ص ۴۹۳-۴۹۴ [۵] حبیب السیر ص ۱۵۹

اس کے بعد مندرجہ ذیل علما کا تذکرہ دیا ہے۔

مولانا غیاث الدین جمشید کاشی، مولانا علاء شاشی، مولانا نفیس، مولانا محمد عالم، خواجہ عصام الدین، خواجہ افضل الدین کمگا، سید عاشق، مولانا محمد اردستانی، قاضی محمد مسکین، خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی، مولانا علاء الدین علی قوشچی، خواجہ عبد المومن، مولانا بدخشی[1]

اس عہد کے ماوراء النہر میں مختلف علوم کی گرم بازاری تھی، مگر قاضی زادہ بالطبع ریاضی و ہیئت کے دلدادہ تھے، اور روم کے مقابلے میں ماوراء النہر میں ان علوم کا اچھا خاصہ چرچا تھا، بالخصوص الغ بیگ کے زمانہ میں،

تیموری خاندان نے اپنے پیشرو ایلخانیوں سے جہاں سفاکی و خونریزی ورثہ میں پائی تھی، نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں بھی ان کے نقش قدم پر چلے، تیمور خود اس کا وصی تھا، مگر درباری منجم عبد اللہ لسان الدین محمد سفر و حضر میں اس کا رفیق و ملازم بارگاہ رہتا تھا، چنانچہ صاحب حبیب السیر اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں،

"افضل حکماء زمان و اعلم منجمان دوراں بود۔ احکام نجومی او مانند قضا و قدر تخلف نمی نمود۔ بیت

همه زیج فلک جدول بجدول باسطرلاب حکمت کرده بدحل

و صاحبقرانی خورشید محل نسبت بآں فاضل بے بدل التفات بیار داشت و آنجناب نیز همواره بساں بخت و دولت در ملازمت بود و در تمام اختلاف بر صحیفۂ ضمیری نگاشت"[2]

---

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو سوم ص ۱۹۰ و ۱۹۱ [2] ایضاً جلد سوم جزو سوم،

تیمور جن ریاضی دانوں کو ممالک مفتوحہ سے لایا تھا، ان میں گل سرسبد میر سید شریف جرجانی تھے، وہ جملہ علوم میں پایۂ سامی رکھتے تھے، ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، انھوں نے ہندسہ میں "تحریر اقلیدس طوسی" اور "اشکال التاسیس سمرقندی" کی اور ہیئت میں "تذکرہ محقق طوسی" اور "چغمینی کے "الملخص فی الہیئت" کی شروح لکھی تھیں، ریاضی و ہیئت میں ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہمارے رئیس التذکرہ کو بھی کشاں کشاں ان کی مجلس درس میں لے گیا۔[1]

شاہ رخ کے زمانہ میں بھی ان علوم کے ماہرین رہے ہوں گے، مگر ان میں گل سرسبد قوام الدین شیرازی تھے، جو بقول دولت شاہ دربار شاہ رخ کے چار رتنوں میں سے ایک تھے، سول انجینئرنگ میں ان کے کمال کے متعلق صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:-

> استاد قوام الدین معمار شیرازی قدوۂ مہندسان زمان و مرجع معماران دوراں بود۔ از جملہ آثار آں استاد نادرۂ کار در دارالسلطنت ہراۃ عمارات عالیات مہد علیا گوہر شاد آغاست"[2]

نجوم میں ان کے تبحر علمی کے سلسلے میں یہ حکایت مشہور تھی کہ ایک مرتبہ شاہ رخ کسی عمارت کے سلسلے میں ان سے ناراض ہو گیا اور سال بھر تک انھیں دربار کی حاضری سے محروم رکھا، آخر میں جب انھیں باریابی کی اجازت ملی اور دربار میں حاضر ہوئے تو تقویم نکال کر پیش کی کہ میں نے از روئے نجوم معلوم کر لیا تھا کہ آج میرا قصور معاف کیا جائے گا اور مجھے شرف بساط بوسی سے نوازا جائے گا، شاہ رخ نے زیر لب تبسم کیا اور کہا

---

[1] سخاوی: الضوء اللامع الجزء الثانی ص ۳۲۸　[2] حبیب السیر ج ۳ ص ۱۳۰-۱۳۷

تو کار زمیں را نکو ساختی — کہ با آسمان نیز پرداختی[1]

اس عہد کے ایک اور ماہر ہندسہ و ریاضی مولانا جلال الدین برادر اسپانی مولانا شہاب الدین تھے، مختلف علوم و فنون میں یدطولیٰ رکھتے تھے، مگر لشکریوں کی وضع میں رہتے تھے، اس سے مرزا الغ بیگ کو غلط فہمی ہوئی اور ایک دن محض انھیں آزار پہنچانے کے لیے ریاضی و ہیئت کے کچھ مسائل لکھ کر انھیں دیے کہ یہ تمہارے خاندانی علم کے مسئلے ہیں، مجھے ان کا حل درکار ہے، مولانا جلال الدین نے انھیں بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا، مرزا الغ بیگ کی غلط فہمی رفع ہو گئی اور اسے ان کی جودت طبع کا اندازہ ہو گیا[2]

اور الغ بیگ کا عہد تو تیموری خاندان میں ریاضی و ہیئت کی ترقی کا نقطۂ عروج ہے، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

علمی مجمع سمرقند کا قیام: یورپ میں سائنٹفک سوسائٹیوں کا سلسلہ سترھویں صدی میں شروع ہوا[3]، مگر ماوراء النہر میں اس کی ابتدا اس سے کہیں پہلے ہو چکی تھی، اہل علم و فضل کی تربیت اسلامی ثقافت کی ایک غیر متبدل رسم رہی ہے، اور یوں تو ہر مغل تاجدار کا دربار مجمع اہل کمال ہوا کرتا تھا، مگر الغ بیگ کو اپنے خاندان میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ریاضی و ہیئت کے علماء سے تحریر پر مشتمل ایک علمی انجمن قائم کی، جس کے بارے میں صاحب "مطلع السعدین" لکھتے ہیں،

---

[1] حبیب السیر ص ۳۰۸ [2] ایضاً ص ۳۰۸، ۳۹ [3] یورپ میں اس قسم کی قدیم ترین انجمن فلورنس کی Academy of experiments تھی جو ۱۶۵۷ء میں قائم کی گئی تھی، اس کے پانچ سال بعد رائل سوسائٹی لندن کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۱۶۶۲ء، چار سال بعد پیرس کی Academie des Science قائم ہوئی ۱۶۶۶ء، برلن اکیڈمی ۱۷۰۰ء میں اور

"میرزا (الغ بیگ) خواست کہ انوار دانش خویش چوں اشراق آفتاب در اقطار آفاق ظاہر گرداند و فروغ ادراک از مقعر خاک بحدب فلک الافلاک رساند وصدائے رصد کواکب در گنبد گردوں اندازد و طنطنہ ایں کار بزرگ در اطراف ربع مسکون منتشر سازد۔ بنا براں با خواص حکما و فحول عقلاء مہندسان عطارد ذکا و فیلسوفان بطلمی کشا کہ در جمیع علوم و حقائق معلوم و مفہوم بتخصیص ریاضی و حکمی بجوبہ عصر و نادرہ دہر بودند مثل فلاطون زمان مولانا صلاح الدین موسیٰ قاضی زادہ رومی بطلیموس دوران مولانا علاء الدین علی قوشچی کہ تربیت یافتہ میرزا الغ بیگ بود و بزبان عنایت او را فرزند خطاب فرمودے و ایں دو محقق دانشمند در سمرقند اقامت داشتند و مولانائے اعظم غیاث الدین جشید و مولانائے معظم معین الدین کہ میرزا الغ بیگ ایشاں را از کاشان بسمرقند بردہ بود انجمنے ساخت و در معرفت دقائق تنجیم و ادراک غوامض تقادیم آں دانشوران کہ بمد دعقل کل بر کیفیت ہر جزوے از اجزائے سپہر واقف بودند بخطوات اقدام مسافر وہم کمیت طول وعرض عالم علوی می پیمودند و در تحقیق ابعاد و سطوح اجرام ہیچ دقیقہ مہمل و ہیچ ثانیہ نامرعی نمانود و در ارتقاع درجات مرتبہ تحقیق بفلک الافلاک رسانده سخناں پرداخت"[1]

یہ مجلس غالباً ۸۲۳ھ سے پہلے قائم ہو ئی تھی جب کہ الغ بیگ اپنے باپ کے ظل تربیت ہی میں پرورش پا رہا تھا اس "مجلس علمی" کے ارکان اور بعد میں سے مولانا غیاث الدین جشید کاشی کے بارے میں صاحب "حبیب السیر" لکھتے ہیں:۔

---

[1] مطلع السعدین ص ۲۸۳

"مولانا غیاث الدین جمشید ۔۔۔۔ در علم ہیئت و ریاضی و فن نجوم عدیل و نظیر نداشت[1]

انھوں نے اس دوران میں "زیج خاقانی" کے نام سے ایک نئی زیج مرتب کی (جسے ایتھے نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرست کتب میں زیج الغ بیگ کا ابتدائی ایڈیشن لکھا ہے[2] مگر) جو محقق طوسی کی مرتب کردہ "زیج ایلخانی" کا تتمہ تھی جیسا کہ وہ خود اپنے رسالہ "مفتاح الحساب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"استأنفت استخراج جمیع جداول الزیج الایلخانی بادق عمل و وضعت الزیج المسمی بالخاقانی فی تکمیل الزیج الخاقانی و جمعت فیہ جمیع ما استنبطت من الاعمال النجومیۃ مما لایاتی من زیج آخر مع البراھین الھندسیۃ"[3]

میں نے زیج ایلخانی کی جملہ جدولوں کا بڑے دقیق عمل کے ذریعہ از سر نو استخراج کیا اور ایک نئی زیج مرتب کی جس کا نام "زیج خاقانی" کی تکمیل زیج ایلخانی" ہے۔ میں نے اس کے اندر وہ تمام باتیں جمع کر دیں جنھیں میں نے پچھلے ہئیت دانوں کے اعمال سے مستنبط کیا اور جو کسی اور زیج سے معلوم نہیں ہو سکتیں اور ان سب کے ہندسی دلائل بھی بیان کیے ہیں'

۲۔ اس "زیج خاقانی" کے علاوہ انھوں نے ایک اور زیج بھی لکھی جس کا نام "زیج التسہیلات" رکھا'

۳۔ ان دو زیجوں کے علاوہ متعدد جداول تیار کیں'

۴۔ اجرام سماویہ کے ابعاد و اجرام کے بارے میں متقدمین کو بہت سے اشکال تھے

---

[1] حبیب السیر ص ۱۵۹ ج ۲ [2] Catalogue of India office - ص
[3] مفتاح الحساب جمشید کاشی مقدمہ (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری Library col. 1220 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ذخیرہ مولانا عبدالحی نمبر ۱۵۹) صفحہ اب

ان کے حل کے لیے انھوں نے ایک رسالہ بنام "سلم السماء" لکھا۔

۵۔ دائرہ کے قطر اور محیط کی نسبت (π) کی زیادہ تحقیقی قیمت دریافت کرنے کے لیے ایک رسالہ بنام "رسالہ محیطیہ" لکھا۔

۶۔ قدیم علم المثلثات کا ایک مسئلہ لاینحل یہ تھا کہ ایک معلوم الوتر قوس کے تہائی حصہ کی قوس کا وتر کیسے دریافت کیا جائے، جمشید کاشی نے اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک رسالہ بنام "رسالۃ الوتر والجیب" لکھا۔[1]

۷۔ انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعہ کواکب کی تقویم، ان کے عروض، زمین سے ان کے فاصلے، ان کی رجعت واستقامت، کسوف وخسوف اور دیگر متعلقات دریافت ہوتے تھے۔ اس آلہ کی تیاری اور طریق استعمال کے لیے ایک رسالہ بنام "نزھۃ الحدائق" لکھا تھا۔[2]

۸۔ مفتاح الحساب: یہ علم حساب کی ایک مفید کتاب ہے، جو ایک مقدمہ اور پانچ مقالات پر مشتمل ہے، حساب صحاح، حساب کسور، حساب منجمین، مساحت اور جبر و مقابلہ۔

انڈیا آفس لائبریری کے مرتب فہرست ڈاکٹر ہرمن ایتھے نے "زیج خاقانی" کا سال تکمیل ۸۱۶ھ بنایا ہے، حالانکہ الغ بیگ نے رصدگاہ سمرقند ۸۲۳ھ کے بعد قائم کی تھی، اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ الغ بیگ نے یہ مجلس علمی جس کے ایک رکن رکین کا کارنامہ "زیج خاقانی" ہے ۸۱۶ھ سے پیشتر قائم کی تھی، یہ بھی واضح رہے کہ "زیج خاقانی"

---

[1] مفتاح الحساب، مقدمہ ص ۲ قا ۔ [2] کشف الظنون جلد ثانی ص ۹۶ و ۳۹۵ نیز مفتاح الحساب ص ۲ ۔ [3] مفتاح الحساب مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ذخیرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نمبر عربی ۔

الغ بیگ کی مرتب کردہ "زیج جدید گورگانی" سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق زیج خاقانی میں چھ مقالے ہیں جب کہ زیج گورگانی (یا زیج الغ بیگ) چار مقالوں پر مشتمل ہے اور اس لیے اول الذکر کو ثانی الذکر کا "پہلا (یا ابتدائی) ایڈیشن" نہیں کہا جاسکتا۔

بعد میں جب الغ بیگ نے ۸۲۳ھ میں سمرقند میں رصدگاہ تعمیر کرائی تو اس رصدگاہ کا سب سے پہلا سربراہ غیاث الدین جمشید کاشی ہی کو مقرر کیا اور وہ مولانا معین الدین کاشی اور ہمارے رئیس التذکرہ کی اعانت سے اس فریضہ کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

دوسرے کارکن مولانا معین الدین کاشی کے حالات کی تفصیل تاریخ نے محفوظ نہیں رکھی۔ صاحب مطلع السعدین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ الغ بیگ نے انھیں کاشان سے بلا کر اس "مجمع علمی" کا رکن بنایا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنونِ ریاضیات کے اندر اپنے عہد کے نوابغِ روزگار میں محسوب ہوتے تھے۔

اس علمی مجلس کے تیسرے رکن رکین ہمارے رئیس التذکرہ تھے، جن کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

چوتھے رکن مولانا علاءالدین علی قوشجی تھے، جن کے متعلق یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ ریاضیات کے ماہر خصوصی تھے یا علم کلام کے۔ محقق طوسی کی "تجرید الکلام" کی انھوں نے جو شرح لکھی ہے (اور جو سابق کی شروح سے امتیاز کے لیے "شرح جدید تجرید" کہلاتی ہے) اس نے پچھلے شارحین کی شروح کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا اور بہ جلد ہی معقولات کے اعلیٰ نصاب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا اور یہ شرف اسے آج تک حاصل ہے۔

یاد رہے کہ وہ صف اول کے ہیئت داں بھی تھے کیونکہ قاضی زادہ کی وفات کے بعد ہی رصدگاہ سمرقند کے متولی مقرر ہوئے اور بادشاہ نے انھیں کی مدد سے فلکی مشاہدات اور ہیئتی دریافتوں کو "زیج جدید گورگانی" میں مرتب کرایا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ صاحب "مطلع السعدین" نے انھیں "بطلیموس دوران" بتایا ہے، اور صاحب حبیب السیر نے "اعلم علمائے زمان وافضل فضلائے دوران" لکھا ہے۔ خود بادشاہ الغ بیگ "زیج جدید گورگانی" کے دیباچہ میں ان کے بارے میں لکھتا ہے:

فرزند ارجمند علی بن محمد قوشچی کہ در حداثت سن وعنفوان شباب قصب السبق در مضمار فنون وعلوم نبوے ربودہ کہ امید واثق ورجا متحقق است کہ ہمت آثر آں علی اقرب الزمان واسرع آوان باطراف واکناف منتشر ومنتفعن گردد۔[1]

رصدگاہ کی آخری تولیت اور "زیج جدید" کی تکمیل وترتیب میں بادشاہ کی اعانت کے علاوہ انھوں نے حسب تصریح حاجی خلیفہ اس "زیج الغ بیگ" کی شرح بھی لکھی تھی، جو مختلف ضابطوں کی ہندسی دلیلوں پر مشتمل ہے۔[2] علامہ قوشچی کی عبقریت کا شاہکار تو ان کی شرح "تجرید جدید" ہے جو معقولات کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، مگر ریاضی وہیئت میں ان کے دو رسالے مشہور ہیں، ایک حساب میں بنام "رسالہ محمدیہ" اور دوسرا ہیئت میں بنام "رسالہ فتحیہ" (جو عرصہ تک "رسالہ قوشچی" کے نام ہیئت کے ابتدائی نصاب میں شمول رہا ہے) دونوں رسالے انھوں نے سلطان روم محمد فاتح کے نام معنون کیے تھے۔[3]

---

[1] زیج الغ بیگ، مقدمہ: (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یونیورسٹی کلیکشن نمبر ۲۵ فارسیہ علوم) ص ۴ [2] کشف الظنون جلد ثانی ص ۱۴ [3] الشقائق ص ۱۷۸-۱۸۹

تو کچھ بعید نہیں کہ سمرقند میں بھی ہمارے رفیق التذکرہ کا کوئی شاگرد رہا ہو جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

قاضی زادہ ماوراء النہر میں | ماوراء النہر کا یہ علمی ماحول تھا جس کے اندر قاضی زادہ ایران سے تشریف لائے، طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:-

"پھر انھوں نے ماوراء النہر کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے پڑھا، وہاں انھوں نے بہت سے علوم حاصل کیے اور ان کے اندر فضل و کمال کے بلند ترین مرتبہ تک پہنچ گئے، ان کے فضائل مشہور ہو گئے، ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور زبان خلق پر انھیں کا ذکر جاری ہو گیا، یہاں وہ قاضی زادہ کے نام سے ملقب ہوئے"

بدقسمتی سے تاریخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی کہ وہ ماوراء النہر کب تشریف لائے، لیکن چونکہ انھوں نے ۸۱۴ھ میں "شرح چغمینی" جیسی کتاب لکھی جو آج تک اسلامی علم الہیئت کی ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی ہے اور جس کی تصنیف کے لیے مصنف کو حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد بیس پچیس سال کی پختگی فضل و کمال درکار ہے، اس لیے اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ ایران سے ماوراء النہر آٹھویں صدی کے آخری عشرہ میں پہونچے تو غالباً یہ حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا،

اس وقت تیمور کا دربار مجمع اہل کمال بنا ہوا تھا جس کے گل سر سبد میر سید شریف جرجانی تھے، وہ مختلف علوم میں تبحر کے ساتھ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، انھوں نے ہندسہ میں محقق طوسی کی "تحریر اقلیدس" اور شمس الدین سمرقندی کی "اشکال التاسیس" کی اور ہیئت میں عمر بن محمود چغمینی کی "الملخص فی الھیئۃ" اور محقق طوسی کی

۱؎ الشقائق صفحہ ۱۷

کی تا اتذکرہ فی الہیئۃ کی شرح لکھی تھی۔

قاضی زادہ نے بھی جو علوم ریاضیہ میں کسب کمال کے خواہاں تھے، ان علوم میں میر سید شریف کے فضل و کمال کی شہرت سنی اور استفادے کے لیے ان کے پاس پہونچے، میر سید شریف کو خصوصی تبحر علم کلام میں تھا، مگر قاضی زادہ کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، وہ تو علوم ریاضیہ کے شائق تھے، اور ان علوم کے اندر سید شریف ان کو مطمئن نہ کر سکے، اور وہ جلد ہی مایوس ہو کر لوٹ آئے، چنانچہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے:۔

"روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے میر سید شریف سے بھی پڑھا تھا، مگر دونوں کے درمیان موافقت قائم نہ رہ سکی، اس لیے قاضی زادہ نے ان سے پڑھنا چھوڑ دیا، میر سید شریف کا قاضی زادہ کے بارے میں کہنا تھا کہ ان کی طبیعت پر ریاضیات کا غلبہ ہے اور قاضی زادہ میر سید شریف کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ (مجھے) علوم ریاضیہ میں مطمئن نہیں کر سکتے ہیں۔"[1]

اسی چشمک کے زیر اثر قاضی زادہ نے میر سید شریف کی "شرح الملخص فی الهیئۃ" پر اپنی "شرح چغمینی" میں ان کا نام لیے بغیر جابجا تعریض کے پیرایہ میں اعتراض کئے ہیں[2] اسی جذبہ کے تحت انھوں نے ہر چند کہ انھیں علم کلام سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی میر سید شریف کی "شرح المواقف" کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اکثر مقامات پر شارح امیر سید شریف پر نقض وارد کیے، مگر ان نقائض کو قید کتابت میں نہیں لائے، صرف حاشیہ پر قلم سے حلقے بنا کر ان "محلات نظریہ" کی طرف اشارے کر دیے، طاشکبری زادہ نے

---

[1] الشقائق صفحہ ۱۔ [2] شرح چغمینی صفحہ ۲۶، ۳۵، ۳۶

کہتا ہے کہ بلادِ عجم میں ان مخلات نظریہ کے ذریعہ طلبہ کی ذہانت کا امتحان لیا جاتا ہے کہ معترض بیان کیا اعتراض کرنا چاہتا تھا[1]

غالباً ماوراءالنہر میں قاضی زادہ نے اور علماے کبار سے بھی پڑھا تھا جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے، اور بعض علمائے ماوراءالنہر کے فیض تلمذ نے قاضی زادہ کو قاضی زادہ بنایا، مگر ہمیں ان اساتذۂ کرام کے نام معلوم نہیں ہیں، بہرحال کچھ تو ہونہار شاگرد کی غیر معمولی صلاحیت اور کچھ شفیق اساتذہ کا فیض جلد ہی ان کے علم و فضل کا تذکرہ ماوراءالنہر کے علمی حلقوں کی رونق بن گیا۔

قاضی زادہ الغ بیگ کے دربار میں یہ تذکرہ الغ بیگ کے کانوں تک پہونچا، وہ تو اہلِ کمال کا جویا اور قدردان تھا ہی، بلا کر انھیں اپنے تقرب خصوصی سے نوازا، طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:-

"قاضی زادہ والی سمرقند کی خدمت میں باریاب ہوئے، وہ امیر کبیر الغ بیگ تھا..... اس نے ان کی طرف خصوصی توجہ کی اور تقرب خصوصی سے نوازا[2]"

الغ بیگ خود علوم ریاضیہ میں عبقری وقت تھا، اس نے قاضی زادہ کی آمد کو مغتنماتِ روزگار میں شمار کیا، اور ریاضیات کی اعلیٰ کتابیں ان سے پڑھیں جیسا کہ طاشکبری زادہ لکھتے ہیں،

امیر مذکور (الغ بیگ) علوم ریاضیہ کا شائق تھا، لہٰذا اس نے ان سے (قاضی زادہ سے) علوم ریاضیہ کی بہت سی کتابیں پڑھیں[3]

وہ صرف ان کے علم و فضل کا معترف ہی نہ تھا بلکہ ان کے تلمذ پر فخر بھی کرتا

---

[1] الشقائق صفحہ ۱۰ [2] ایضاً ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۱۰۱

نے اپنی زیج جدید گورگانی کے دیباچے میں انھیں بڑے عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتا ہے:۔

"حضرت استاذی و سندی علامۃ العالم، ناصب امادات الفضل والحکم، سالک مسالک التحقیق، ناہج مناہج التدقیق مولانا صلاح الملۃ والدین موسی المشتہر بقاضی زادہ الرومی علیہ الرحمۃ والغفران"[۱]

قاضی زادہ بھی سعادت مند شاگرد کی عزت و احترام سے اتنے متاثر ہوئے کہ وطن عزیز اور اعزہ و اقارب سبھی کو بھول گئے۔ چنانچہ "شرح چغمینی" کے دیباچہ میں ترک وطن کا سبب دربار سمرقند کی غیر معمولی مہمانداری کو قرار دیتے ہیں جس نے ان کے دل سے نہ صرف وطن بلکہ عزیزوں اور دوستوں تک کو فراموش کرا دیا۔

ولا عیب فیھم غیر ان ضیوفھم تلوم بنسیان الاحبۃ والوطن[۲]

یہی نہیں بلکہ اس زمانہ (۸۱۵ھ) میں انھوں نے جو دو کتابیں "شرح چغمینی" اور "شرح اشکال التاسیس" لکھیں انھیں عزیز شاگرد ہی کے نام معنون کیا، اور ان کے دیباچے میں اس کی تعریف و توصیف میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ چنانچہ "شرح چغمینی" کے دیباچہ میں کمال خلوص و محبت کے ساتھ اسے دعائے بزرگانہ سے نوازتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جب یہ کتاب مکمل ہو چکی اور اس کے لکھنے سے فراغت ہوئی تو میں نے اسے اس بارگاہ میں بطور تحفہ پیش کیا جو اپنی بہجت و خوبی کی بنا پر دلوں کے لئے موجب حیرت ہے اور اس آستانۂ عالی میں بطور پیش کش رکھا جو اپنی نزہت و پاکیزگی

---

[۱] زیج الغ بیگ، مخطوطہ مذکورہ بالا، صفحہ ۵ ب۔ [۲] الشقائق ص ۱۰، نیز شرح اشکال التاسیس مخطوطہ مذکورہ فیا ... صفحہ ۲ ب

میں رشکِ بہشت ہے' وہ اس ہستی کی بارگاہ ہے جس نے بھلائی اور احسان کی
نشر و اشاعت کی ہے' امن و امان کو پھیلا دیا ہے' عدل و انصاف کی ترازو
قائم کی ہے' حیثیت داری اور ظلم کی آگ کو بجھا دیا ہے' عقل کے باغ کو اپنی خوبی بہت تر
سے شاداب بنایا ہے اور اپنی تقویت کی برکت سے شریعت کی کلیوں کو کھلا دیا ہے'
اس کی طبیعت کے نقاد نے تمام علوم کے اصول و فروع کو رواج دیا ہے' اور
معارف منقول ہوں یا معقول سب کو اتقان بخشا ہے' سو (ممدوح) چاشت
کے وقت کا سورج ہے' اندھیری رات کا بدر ہے' بلندی مرتبہ کا آسمان ہے'
مخلوق میں سب سے بہتر ہے' بخشش کا سمندر ہے' اور ہدایت کا جھنڈا ہے'
(ارے میں نے یہ کیا کہدیا) بھلا سورج کو برستے بادل جیسا (ممدوح کا) ہاتھ
کہاں نصیب ہے' اور چاند کو جوشش مارتے سمندر جیسی (ممدوح کی) ہتھیلی کہاں
حاصل ہے' سرداری کا نور اس کی پیشانی میں چمکتا ہے اور نیک بختی کی کلیاں اس
کے رخساروں میں چٹکتی ہیں' (نہیں) بلکہ وہ مرتبۂ عالی کی آنکھ کا نور اور
سلطنت کے چمن کا پھول ہے

جب اس کے اندر اپنے دادا (تیمور) کی دولت وعظمت نظر آئی تو لوگوں نے
بچپن ہی میں اس کا نام امیر اعظم (الغ بیگ) رکھ دیا۔

وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے' حق' ملت اور دین کا فریاد رس ہے' سلطان
ہے' سلطان کا بیٹا اور سلطان کا پوتا یعنی الغ بیگ بن شاہرخ بن تیمور گورگان
اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کے آفتاب کو زوال سے دور اور اس کی دولت
وحکومت کے چاند کو کمال پر قائم رکھے جب تک ستارے آسمان پر گردش

کرتے رہیں اور پہلیں زمین پر اگتی رہیں یا اللہ اس کے دوستوں کی مدد فرما!

اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر، اور جب تک لیل و نہار کا سلسلہ

قائم ہے اس کی مہربانی کا سایہ جملہ مخلوق پر دراز فرما تارہ نبی کریم اور

ان کے اہل بیت کرام کے صدقہ میں[1]

اسی طرح جب انھوں نے "شرح اشکال التاسیس" لکھی تو اسے بھی الغ بیگ ہی کے

نام سے معنون کیا، چنانچہ اس کے دیباچے میں اس کی پوری تفصیل تحریر کی ہے[2]

انھوں نے "شرح چغمینی" حسب تصریح حاجی خلیفہ ۸۱۴ھ میں لکھی اور شرح اشکال التاسیس

۸۱۵ھ میں، چنانچہ مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرہ سرشاہ سلیمان موخر الذکر کا جو

مخطوطہ ہے اس کے آخری صفحہ کے حاشیہ پر مرقوم ہے :-

هو لفه رحمة الله تاريخ تاليفه

جرى عادة القوم ان ارخو ــــ د تاريخ تاليفه خيره

اس طرح تاریخ تالیف ۸۲۰ نکلتی ہے (الا یہ کہ آخری لفظ "خیرۃ" ہو بغیر واو)

مگر حاجی خلیفہ کا بیان کردہ ۸۱۵ھ ہو یا شعر سے نکلی ہوئی تاریخ ۸۲۰ھ بہر صورت حل

طلب مسئلہ باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ الغ بیگ ۸۱۰ھ یا ۸۱۲ھ میں درجۂ امارت پر فائز ہوا

"وجناب الغ بیگی در ظل تربیت والد بزرگوار خویش بسر می برد تا در ۸۱۲ھ بایالت

ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت"[3]

اور ۸۵۰ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا لہذا اسے سلطان اعظم، خاقان افخم خلد

اللہ شموس سلطنتہ، ظل اللہ تعالیٰ فی الارضین جیسے اوصاف سے متصف کرنا کیا معنی، ابھی تو اسکا

باپ شاہرخ بقید حیات تھا۔ (باقی)

---

[1] شرح چغمینی ص ۲ [2] شرح اشکال التاسیس دیباچہ مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ذخیرہ سرشاہ

سلیمان ۵۲۰ ص ۲ و ظ ۲۰ ب [3] حبیب السیر ص ۱۵

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
کے
کچھ غیر مطبوعہ فتاوی اور ایک دستاویز

از

جناب مولوی نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے نامور صاحبزادگان کی تالیفات و تحریرات کے متعدد و مستند اور قیمتی نسخے مختلف اشخاص کے نجی ذخیروں اور غیر معروف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عام طور پر اہل قلم کے علم میں ہیں اور نہ ہی ان کا تعارف ہوا ہے، اس طرح کی بعض چیزیں ہمارے ذخیرۂ کتب میں بھی محفوظ ہیں، اس میں سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے دو غیر مطبوعہ فتاوی، اور شاہ صاحب کی مہر اور تحریر سے مزین ایک دستاویز کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ فتاوی ایک طولانی کاغذ کی دونوں سمتوں میں لکھے ہوئے ہیں، کاغذ کے بالائی حصہ پر دونوں طرف ایک ایک سوال اور اس کے نیچے جواب تحریر فرمایا ہے، سائل کی تحریر پختہ اور رواں ہے، کاغذ مضبوط مگر کہیں کہیں کرم خوردہ ہے۔

پہلا سوال یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ بطور وظیفہ پڑھنے کے متعلق ہے، اس کا بطور وظیفہ ورد صدیوں سے عوام میں معروف ہے، لیکن فقہی اعتبار سے اس کی حیثیت آج بھی مختلف فیہ ہے، علماء میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اسے قطعاً حرام اور

اس کے ورد کو ناجائز اور بدعت کہتے ہیں علمائے متاخرین میں شاہ عبدالغنی مجددیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی، مفتی عزیز الرحمٰن نے بھی یہی نقطۂ نظر دیا ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے لیکن ماہرین عملیات، متعدد علماء اور بعض مشائخ (شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، مرزا مظہر جانجاناں، شاہ غلام علی) سے مختلف طریقوں سے اس کی قرأت و اجازت معمول و منقول ہے۔[1]

شاہ عبدالعزیزؒ نے اس فتویٰ میں دونوں نظریات کی جامعیت کے ساتھ ترجمانی فرمائی ہے اس میں فقہاء کے مسلک کی پوری پوری رعایت بھی ہے اور عاملین کے لیے چند شرائط کے ساتھ اجازت بھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرنے کا رواج ہے اور اس کی ادائیگی کا دستور نہیں مہر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی یکمشت ادائیگی کا ارادہ کریں تو دوسرے ضروری اخراجات پورے نہیں ہو سکتے،

---

[1] ان فتاوی کا مجموعہ "فتاوی جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کے نام سے چالیس پچاس برس سال پہلے نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا آج کل کمیاب ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی مسلک ہے کہ "ایسے امور میں تفصیل ہے صحیح العقیدہ سلیم الفہم کے لیے جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے تاویل مناسب کر کے اور سقیم الفہم کے لیے بوجہ مفاسد اعتقادیہ و عملیہ کے اجازت نہیں دی جاتی چونکہ اکثر عوام بدفہم اور کج طبع ہوتے ہیں ان کو علی الاطلاق منع کیا جاتا ہے اور منع کرنے کے وقت اس کی علت اور مدار نہی کو اس لیے نہیں بیان کیا جاتا ہے کہ قیاس فاسد کر کے ناجائز امور کو جائز قرار دے لیں گے" (امداد الفتاوی ج ۵ ص ۱۶۲ کراچی)

مالکوں اور مشائخوں کے یہاں تمام اسباب معیشت موجود رہتے ہیں اور یہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ انہیں غریب کہا جائے یا نذر و منت کی کوئی چیز انہیں دی جائے؛ ان پر زکوٰۃ اور حج فرض ہے یا نہیں؟ غالباً یہ اس دور کے متوسط طبقہ کا ذکر ہے، جو آج بھی ان ہی حالات کا شکار اور انہی مشکلات و مسائل کا اسیر ہے اس لیے پونے دو سو سال بعد بھی اس فتویٰ کی اہمیت کم نہیں ہوئی اور آج بھی اس کی اشاعت اسی طرح مفید ہے جیسی اس وقت تھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا معمول برجستہ اور قلم برداشتہ لکھنے کا تھا حوالے اور عبارتیں بھی حافظہ ہی کی مدد سے نقل فرماتے تھے، اس لیے ان کی منقولہ عبارات اور اصل متون میں کہیں کہیں فرق نظر آتا ہے، اسی طرح ان فتاویٰ میں منقول عبارتوں اور ان کتابوں کے مطبوعہ نسخوں کی عبارتوں میں معمولی فرق ہے، جن کی حواشی میں وضاحت کردی گئی ہے لیکن اس معمولی تفاوت سے نفس مسئلہ متاثر نہیں ہوتا۔

سوال نمبرا

خواندن ورود ... یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ غائبانہ از روئے شریعت کہ ظاہر در این اعتقاد علم غیب در حق آنجناب لازم می آید۔ شرعاً چہ حکم دارد و اگر بر وقت خواندن این کلام معنی ترکیبی از آن مراد ندارد بلکہ آن را مثل دیگر اسماء متبرکہ عبرانیہ یا سریانیہ کہ ہیچ معنی آن بافہم خوانندہ نمی آید، اگرچہ این معنی مستبعد از ترکیب الفاظ است، دانستہ بخواند سوائے این قدر کہ از اعتقاد کردن علم غیب در حق غیر خدا محفوظ ماند و بحسب قواعد شرعیہ باعتبار عظمت خود در انجاح مطالب ہم چیزے مفید است یا غیر مفید؟ و در باب صدور این قسم کلمات از شخص غیر خواندہ چہ حکم فرمایند۔

لہ یہ لفظ واضح نہیں ہو سکا ہے۔

دخواندن نادِ علی چہ حکم دارد، واز کدام کس است؟ بینوا توجروا۔

ترجمہ سوال:۔ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کا مزار شریف سے غائبانہ پڑھنے اور ورد کرنے کا، حالانکہ بظاہر اس سے شیخ جیلانی کے لیے علم غیب کا اعتقاد لازم آتا ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟ اور اگر پڑھنے کے وقت اس کے لفظی معنی مراد نہ لیے جائیں اور اس کو عبرانی اور سریانی کے ان اسماء متبرکہ کی طرح سمجھ کر پڑھے جن کے کوئی معنی اس پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہوتے، اگرچہ یہ معنی ترکیب الفاظ سے بہت دور ہیں مگر اس سے صرف یہ مراد ہو کہ غیر خدا کے لیے علم غیب کے اعتقاد سے محفوظ رہے اور کیا قواعد شرعیہ اور اپنی عظمت کے لحاظ سے حل مقاصد کے لیے کوئی مفید چیز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی جاہل اس قسم کے کلمات کہے تو اس کے متعلق علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟ اور دعاء نادِ علی پڑھنے کا کیا حکم ہے اور یہ کس کی طرف منسوب ہے؟

جواب:۔ خواندن مثل ایں کلمات یکے از سہ وجہ تواند اول آنکہ منادیٰ را عالم غیب اعتقاد کند، و قادر مطلق یا نجاح مطالب گمان برد، وایں وجہ مستلزم کفر است بسبب شرک، دوم آنکہ چناں پندارد کہ موکلاں ایں کلام را بگوش روح آں جناب منادیٰ میرسانند، و منادیٰ متوجہ بدعا و التجا از جناب حضرت (کذا ؟) کارپرداری من میفرما ید، چنانچہ از لفظ شیئاً للہ ہمیں معنی مستفاد میشود، وایں بظاہر ہیچ خلل ندارد، در حدیث صحیح آمدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند "ان للہ ملکاً اعطاہ اللہ اسماع الخلائق عند قبری یبلغونی السلام من سلم علی من امتی" و نیز در حدیث صحیح آمدہ "تعرض علی اعمال امتی فی قبری فان کان خیرا حمدت اللہ وان رائیت شرا استغفرت لهم"

سیوم آنکہ خیال اعتقاد کند کہ نام این بزرگ بطور ورد میخوانم تو ہر چند او نمی شنود لیکن در انجاح مطلب من عیبے نیست لیکن حق تعالیٰ می شنود و او محبوب و مرضی خدا است و تعالیٰ لہٰذا بعنایت خود بحال محبوب و توسل من بآنجناب مطلب من را حاصل خواہد فرمود، چنانچہ خدا پیغمبر را در تشہد از ہمین باب ساختہ اند السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، و این مانند آنست کہ شخصے از طفل لایعقل امیرے یا بادشاہے چیزے طلب نماید ہر چند آن طفل او را نہ فہمد و نہ قدرت بر دادن مطلوب دارد لیکن پدر شفیق او مطلب او را برآرد بنا بر آنکہ این سوال حقیقتاً از پدر است نہ از طفل، و در حدیث صحیح آمدہ کہ برائے حصول مطالب این قسم دعا بکنید: اللہم انی اتوجہ الیک بنبیک محمد (کذا؟) نبی التوبۃ انت تفعل بی کذا وکذا ثم یقول یا محمد انی اتوجہ بک الی ربک ان تفعل بی کذا وکذا[1] واللہ اعلم،

(حاشیہ ص ۴۲۷) [1] یہ حدیث بعینہ ان الفاظ میں ہمیں نہیں مل سکی لیکن مسند بزار کی حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت لفظاً و معناً اس کے قریب قریب ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان اللہ وکل بقبری ملکا اعطاہ اللہ اسماع الخلائق فلا یصلی علی احد الی یوم القیامۃ الا ابلغنی باسمہ واسم ابیہ ہذا فلان بن فلان قد صلی علیک" الترغیب والترہیب (برحاشیہ مشکوٰۃ) ص ۲۹۹۔ اس مفہوم کی صحیح روایت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی عن امتی السلام رواہ احمد والنسائی والحاکم وابن حبان والبیہقی والصحیحین دون قولہ سیاحین زرقانی ج ۵ ص ۳۳۵ طبع اولیٰ [2] روی البزار بسند جید عن ابن مسعودؓ حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ وما کان من شیء استغفرت اللہ لکم" زرقانی ص ۳۳۶۔

(ھو الغنی الولی الرحیم)

ترجمہ جواب :۔ اس طرح کے کلمات کا ورد کرنے میں تین میں سے ایک صورت ضروری ہوتی ہے، اول یہ کہ جس کو آواز دے رہے ہیں اس کے لیے علم محیط کا اعتقاد رکھیں اور اسے تمام ضرورتوں کا پورا کرنے والا خیال کریں، یہ صورت اپنے مشرکانہ عقیدہ کی وجہ سے کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ گمان کرے کہ ان کلمات کے موکل ان الفاظ کو جب منادی۔ شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچا دیں گے اور وہ حضرت حق سے دعا اور التجا کرکے میرے مقصد کی کاربرآری فرما دیں گے۔ لفظ شیئاً للہ سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں، اس صورت میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ کا ایک فرشتہ ایسا ہے جس کو حق تعالیٰ تمام مخلوق کی آواز میری قبر کے قریب پہنچاتے ہیں اور وہ (فرشتہ) ہر اس شخص کا سلام مجھے پہنچاتا ہے جو میری امت میں سے مجھ پر سلام بھیجے" ایک اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ "میری امت کے اعمال میرے پاس قبر میں پیش کیے جاتے ہیں اگر وہ اچھے عمل ہوتے ہیں تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اگر برے ہوتے ہیں تو ان کے لیے استغفار کرتا ہوں" اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثان میں سے بعض اولیاء کو بھی یہ مقام عطا فرما دیا جائے تو کیا تعجب ہے۔

---

[۱] رواہ الترمذی ولفظہ "اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ انی توجھت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی اللھم فشفعہ فی" وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح غریب لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ ترمذی ص ۱۹۷ ج ۲ مجتبائی سنہ ۱۳۲۰ھ ورواہ ابن ماجہ والحاکم فی مستدرکہ مرقاۃ ملا علی القاری ص ۲۵۳ ج ۵ املادیہ ملتان سنہ ۱۳۱۷ھ وراجع کنز العمال ص ۱۹۳ ج ۱ طبع جدید،

تیسری صورت یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ اعتقاد کرے کہ ان بزرگ کا نام میں وظیفہ کے طور پر پڑھ رہا ہوں اگرچہ وہ بزرگ میری آواز نہیں سن سکتے اور نہ ہی میرے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ تو سنتے ہیں اور وہ بزرگ خدا کے محبوب ہیں اللہ کی اپنے محبوب کے حال پر جو عنایت ہے اس کی وجہ سے اس کے وسیلہ اور ان کا ذکر کرنے سے میری مشکل کو آسان فرما دے، جیسا کہ تشہد میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حرف ندا کے خطاب "السلام علیک ایھا النبی" کو اسی پر محمول کیا گیا ہے،

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا رئیس کے ناسمجھ بچے سے کوئی چیز طلب کرے اور وہ بچہ نہ اس چیز کو سمجھتا ہے اور نہ اس کے دینے پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس بچہ کا شفیق و مہربان باپ اس سائل کے مقصد کو۔ وہ چیز دے کر۔ پورا کر دیتا ہے یعنی وہ سوال اس بچہ سے نہیں درحقیقت اس کے باپ سے ہے، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ حصول مقاصد کے لیے اس طرح سے دعا کرے "اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی التوبہ کے واسطہ کہ آپ میرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ فرمائیے پھر دعا کرنے والا یہ الفاظ کہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے ذریعہ آپ کے رب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ فرمائے"

سوال نمبر ۲

سوال:- ازبسکہ دیار ہندوستان مقرر کردن مہر زیادہ از قدرت رواج عام یافتہ لیکن از ان جا کہ مرد و زن ہیچ تفرقہ و تمیز در مال خود نمیکنند بلکہ مرد تمام مال و اسباب خانہ را بجز و زن آنہم را بجز وجہت میکنند ہیچ خیال

لہ جواب میں شادی کا پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔

وہم ادای دین مہر در خاطر خطور نمی کند، پس کسانیکہ از طرف آمدنی و اسباب اینقدر دسترس دارند کہ جمیع اسباب امارت مثل فیل و اسپ و شتر وغیرہ مہیا می دارند و در سال تمام صدہا روپیہ خرچ می سازند تا این قدر نقدی کہ از آن دین مہر زوجہ ادا کردہ شود بالفعل جمع نہ دارند و اگر ارادہ ادای دین مہر بخیال آرند بآمدنی و تا مدت ادا تکفل نمی توانند فاما بسبب اینکہ بحسب رواج بودہ[1]... دین واجب الادائی بخاطر ایشان نمی گزرد چیزے از آنچہ این منع نمی کنند و بلکہ زنان ہم گرفتن مال مہر خود را از شوہر خود کمال خلاف مروت می شمارند پس شرعاً این چنین اشخاص در باب فضیلت حج و وجوب صدقۂ فطر و ادا شدن زکوٰۃ دیگران از دادن ایشان چہ حکم دارند؟ و حال آنکہ دیگران ایشان را و ایشان بخیال خود خود را امیر می دانند و این طور بخاطر خود ندارند کہ ایشان را بوجہ اللہ چیزے بدہد بلکہ گرفتن چیزے را کہ بطور صدقہ نباشد بلکہ بطور نذرانہ باشد اکل حنک حرمت خود می دانند بینوا توجروا

ترجمہ سوال :۔ ہندوستان میں وسعت سے زیادہ مہر مقرر کرنے کا عام دستور ہے لیکن ایسی صورت میں جب کہ مرد و عورت اپنے مال میں آپس میں کوئی فرق اور پہچان نہیں کرتے، بلکہ تمام مال اور مکانات کو مرد اپنا اور عورت ان سب کو اپنی ملکیت خیال کرتی ہے اور کبھی کوئی ارادہ و خیال مہر کی ادائگی کا نہیں کرتے پس وہ اشخاص جو آمدنی و اسباب کے لحاظ سے ایسے باحیثیت ہوں کہ تمام اسباب امارت مثلاً ہاتھی اونٹ گھوڑے وغیرہ رکھتے ہوں اور تمام سال میں سیکڑوں ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہوں لیکن اتنی رقم نقد کہ جس سے بیوی کا مہر ادا کیا جا سکے جمع نہیں رکھتے اور اگر اس مہر کی ادائگی کا ارادہ کریں تو جب تک مہر ادا کریں اس وقت تک ان کی آمدنی بیوی کے اخراجات کا تکفل نہیں کر سکتی اور یہ عام رواج کی وجہ سے

---

[1] نقل کرم خوردہ ہے جس سے یہ فقرہ پوری واضح نہیں ہو سکا ہے

ہے کہ اس مہر کی ادائیگی کا کسی کو خیال نہیں آتا اور کوئی چیز انہیں اس کے ادا کرنے سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ عورتیں شوہر سے اپنا مہر وصول کرنا بے مروتی سمجھتی ہیں، پس شرعاً ایسے اشخاص پر حج کے فرض، صدقۂ فطر کے واجب ہونے اور ان کو دینے سے زکوٰۃ کے ادا ہو جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور حال یہ ہے کہ عوام ان اشخاص کو، اور یہ خود بھی اپنے کو امیر خیال کرتے ہیں، اور اسے پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص انہیں اللہ واسطے کوئی چیز دے اور ایسی چیز کا لینا بھی جو بطور ہدیہ کے نہ ہو بلکہ نذر و نیاز کی ہو اپنی سخت توہین سمجھتے ہیں۔

جواب:۔ موافق ظاہر قواعد فقہ ایں قسم دین مانع فرضیت حج، و وجوب زکوٰۃ و صدقۃ الفطر و مبیح گرفتن زکوٰۃ از دیگران می باشد، لیکن از روئے تقویٰ و تورع ادائے حج و دادن صدقۃ الفطر و زکوٰۃ ایشاں را باید کہ بعمل آرند زیراکہ در صورت مذکورہ زن ہرگز مطالبہ مہر خود نمی کنند و در ادائے ایں دین خطور خاطر ایں کس است، پس عنداللہ احتیاط در ہمیں است کہ ایں چیز ہا را ادا نماید، و زکوٰۃ دیگران نہ گیرد، زیراکہ ایں دین، مانند دین خدا شد، او زکوٰۃ سالہائے و از نذر و کفارات، و دین خدا منع نمی کند از وجوب ایں چیز ہا در شرح وقایہ میگوید

"و مدیون مطالب من عبد بقدر دینہ لان ملکہ غیر فاضل عن الحاجۃ الاصلیۃ وھی قضاء الدین وانما قید بکونہ مطالبا من عبد ......
...... حتی لو کان مطالبا من اللہ تعالیٰ لا یمنع وجوب الزکوۃ کمن ملک نصابا بعضہ مشغول بدین اللہ کالنذر او الکفارۃ او الزکوۃ ......
تجب فیہ الزکوۃ ولا یشترط لوجوب الزکوۃ فراغہ عن ھذا الدین"[1]

---

[1] ص ۳۳۴ پر

وفی الفتاوی العالمگیریۃ "ومنہا القدرۃ علی الزاد والراحلۃ بطریق الملک او الاجارۃ،[1] وتفسیر ملک الزاد والراحلۃ ان یکون لہ مال فاضل عن حاجتہ وھو ما سوی مسکنہ ولبسہ وخدمہ واثاث بیتہ؛ قدر ما یبلغہ الی مکۃ ذاھبا وجائیا راکبا لا ماشیا وسوی ما یقضی بہ دیونہ ویمسک لنفقۃ عیالہ ومرمۃ مسکنہ ونحوھا الی وقت انصرافہ"[2]

فی الدر المختار "تجب صدقۃ الفطر موسعا فی العمر کزکوۃ وقیل مضیقا فی یوم الفطر عینا علی کل مسلم ذی نصاب فاضل عن حاجتہ الاصلیۃ کدینہ وحوائج عیالہ وان لم تنم وبہ یحرم الصدقۃ"[3]

الرحیم لہ
(ھو العزیز الو) مہر

ترجمہ جواب :۔ قواعد شرعیہ کی رو سے اس قسم کا قرض بظاہر وجوب زکوۃ اور وجوب صدقۃ الفطر کو مانع ہے اور ایسا قرض ذمہ ہونے کے وقت زکوۃ لینی بھی

---

[1] شرح وقایہ بحاشیہ عمدۃ الرعایہ ص ۲۲۹ ج ۱ مجتبائی، ۱۳۲۰ھ [2] یہ مسلسل عبارت نہیں ہے درمیان سے چند سطریں شاہ صاحب نے حذف فرمادی ہیں اس کے بعد عبارت "وتفسیر ملک الزاد والراحلۃ" ہے [3] فتاوی عالمگیری ص ۳۰۵ و ص ۳۰۶ اول ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۲۵۸ھ ہے گذشتہ عبارت کی طرح یہ عبارت بھی حذف و اختصار کے بعد نقل فرمائی ہے مکمل کے لیے دیکھیے درمختار (برحاشیہ شامی) ص ۷۲، و ص ۷۳، دوم مجتبائی دہلی ۱۲۸۶ھ

جائز ہوگا لیکن تقوی و احتیاط ایسے لوگوں کو چاہیے کہ حج، زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر ادا کریں اس لیے کہ ایسی صورت میں عورت ہرگز اپنے قرض مہر کا مطالبہ نہیں کرے گی اور نہ ہی اس قرض کی ادائیگی اس شخص کے وہم و خیال میں ہے۔ اس لیے عند اللہ احتیاط اسی میں ہے کہ ان چیزوں۔ خدا کے قرض حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ادا کرے اور زکوٰۃ کی رقم بچانے اور نہ اپنے خرچ میں لائے اس لیے کہ سب خدا کے قرض کی طرح ہے، گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نذر و کفارات اور خدا کا قرض ان چیزوں کے واجب ہونے کو منع نہیں کرتا۔ شرح وقایہ میں ہے کہ

اور جس شخص کے ذمہ کسی انسان کا قرض ہو اس پر بھی یا فرض نہیں اس لیے کہ اس شخص کی ملکیت۔ رقم۔ ضرورت اصلیہ سے زیادہ نہیں ہے، اور روہ ضرورت قرض ادا کرنا ہے، انسان کا مقروض ہونے کی شرط کا اس لیے اضافہ کیا کہ اگر اس کے ذمہ اللہ کا کوئی مطالبہ ہے تو اس مطالبہ کی وجہ سے زکوٰۃ کا وجوب متاثر نہیں ہوگا جیسے کوئی شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک ہے اور اسی نصاب کی رقم میں سے کوئی نذر یا کفارہ بھی ادا کرتا ہے تو اس رقم میں بھی زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس قرض خداوندی سے فارغ ہونا شرط نہیں ہے" فتاوی عالمگیری میں ہے کہ

"حج کے فرض ہونے کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ زاد سفر اور سواری کی استطاعت بھی رکھتا ہو، سواری کا مالک ہو یا سواری کرایہ پر لے سکے، زاد سفر اور سواری کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ضروریات یعنی مکان، ملبوسات خادم اور خادم کے خرچ سے زیادہ اتنا مال ہو جس سے سواری کے ذریعہ مکہ کا سفر کر سکے، پیدل جانے کا اعتبار نہیں یعنی اگر کوئی بغیر سواری کے پیدل سفر

کر سکتا ہے تو وہ شرعاً محتاج نہیں اور یہ تمام رقم قرض کے علاوہ ہو، یہ شخص کسی کا
مقروض بھی نہ ہو اور اس کے پاس اتنی رقم ہو جو حج سے واپس آنے تک اس کے اہل
و عیال کے خرچ مکان کی مرمت اور اس طرح کے ضروری اخراجات سے بھی زیادہ ہو"
درمختار میں ہے کہ "صدقہ فطر واجب ہے اور اس کے تمام عمر میں کسی بھی وقت
ادا کرنے کی اجازت ہے زکوٰۃ کی طرح "کہا گیا ہے کہ صدقہ فطر کی ادائیگی کے لیے عید
کا دن معین ہو ہر آزاد مسلمان پر جو نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو اور وہ نصاب
اس کے ضروری اخراجات جیسے قرض اور اہل و عیال کے خرچ سے زیادہ ہو
اگرچہ نصاب نام ہو اور اس نصاب کا مالک ہونے کی وجہ سے اس کو صدقہ لینا
حرام ہے"

(مہر عبد العزیز الولی الرحیم)

شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کی تصدیق کی ہوئی ایک دستاویز!

یہ دستاویز فارسی میں ہے ۱۳ طویل اور ۱۳ چوڑے کاغذ پر نہایت خوبصورت
اور جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے، اس دستاویز کے فارسی متن کا خلاصہ یہ ہے کہ

"مولانا حکیم محمد عرف شیخ الاسلام کاندھلوی کی جائیداد ان کے صاحبزادگان
مفتی الٰہی بخشؒ، مولانا شاہ کمال الدینؒ، مولانا محمود بخشؒ اور عبد الشاہ کے درمیان
تقسیم شدہ نہیں ہے، لیکن پروانہ جات صدر الصدور عبد الغنی خاں اور کتاب
صاحبان انگریز" میں اندازے سے سب کے نام الگ الگ لکھ دی گئی ہے، جیسا کہ قرائن
سے ہوتا ہے، اس لیے وارثان مولانا محمد شیخ الاسلام میں سے کسی کو بھی ان اندراجات
کی وجہ سے کسی خاص زمین پر ملکیت کا دعوی نہیں ہے"

حاشیہ پر اہل معاملہ اور گواہان کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، پہلی تحریر اور گواہی شاہ عبدالعزیزؒ کی ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

"با قرار مقرین مذکورین بالمواجہہ مہر نمودہ شد" مہر عبدالعزیز الولی الرحیم

دوسری شہادت شاہ رفیع الدینؒ نے ان الفاظ میں ثبت فرمائی ہے

"فقیر رفیع الدین بریں مضمون مطلع است" مہر رفیع الدرجات ذوالعرش ۱۱۹۲ھ اس کے بعد مفتی الٰہی بخش، مولانا شاہ کمال الدین، مولانا محمود بخش، مولانا حکیم محمد اشرف کی مہریں اور دستخط ہیں، یہ تحریر ۱۴ ربیع الثانی ۷ جلوس محمد اکبر شاہ بادشاہ مطابق ۱۲۲۹ھ (۱۴ اپریل ۱۸۱۴ء) کو لکھی گئی،

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہد رسالت اور اس کے بعد کے ہر دور میں احادیث نبویؐ کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہ احادیث تمام دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں، نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر ان احادیث کو جمع کیا، ان کے مجموعے مرتب کیے، ہزاروں لاکھوں رواۃ کے حالات قلمبند کیے، جرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا، سید صاحب کو اپنی آخر زندگی میں امت کے اسی برگزیدہ طبقہ یعنی محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، ان کو اس موضوع سے خود بھی دلچسپی تھی، ان کی وفات کے بعد یہ کام مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا ہے، جو اسکو انجام دے رہے ہیں، اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا حصہ زیر ترتیب ہے، آخری حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی حدیثی خدمات اور

گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ

از

محمد منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

کسی بھی ملک کی شہرت و عظمت کا دار و مدار علوم و فنون کی ترقی میں مضمر ہے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ صدیوں میں سلاطین کے درباروں میں صاحب فضل و کمال علماء کا منتخب مجمع نظر آتا ہے جنھوں نے بادشاہوں کی فیاضی اور علم دوستی کی بدولت تصانیف کا انبار لگا دیا تھا، اس سلسلہ میں سلاطین گجرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علوم و فنون کی ترقی میں ان کے قدم کسی سے پیچھے نہیں رہے، انھوں نے اپنے بے مثال کارناموں، ملکی اصلاحوں اور صنعت و حرفت کی ترقیوں کے ساتھ صوبۂ گجرات کو دار العلوم والفنون بنا دیا تھا، ان کی فیاضی و علم نوازی نے اس خطہ کو زین البلاد کا مرتبہ عطا کیا تھا، بادشاہوں نے اپنی ڈیڑھ سو سال کے عہد حکومت میں علوم و فنون کی ایسی سرپرستی کی کہ گجرات دہلی سے بھی گوئے سبقت لے گیا، علماء کی قدر و عزت افزائی سے اطراف و جوانب ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر کے علماء بھی گجرات میں کھنچ کر آگئے، انھوں نے یہاں توطن اختیار کیا اور اپنے فیوض و برکات سے اس خطہ کو مالا مال کر دیا، ان کی بدولت گجرات حدیث و قرآن کے نغمات سرمدی سے گونجنے لگا، ہندوستان میں اشاعت حدیث کا سہرا شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے سر سمجھا جاتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب شیخ محدث عالم وجود میں

میں نہ آئے تھے، اس وقت گجرات حافظ سخاوی (متوفی سنہ ۹۰۲ھ) شیخ الاسلام زکریا انصاری (متوفی سنہ ۹۲۶ھ) اور علامہ ابن حجر مکی متوفی سنہ ۹۷۳ھ کے تلامذہ کے وجود مسعود سے منور تھا اور علامہ وجیہ الدین عمر بن محمد المالکی متوفی سنہ ۹۱۹ھ علامہ بحرق سنہ ۹۳۰ھ، شیخ عبد المعطی باکثیر سنہ ۹۸۹ھ، شہاب الدین احمد اباکی مصری متوفی (سنہ ۹۹۲ھ) شیخ ناکہی متوفی سنہ ۹۹۲ھ سید شیخ بن عبد اللہ عیدروسی متوفی سنہ ۹۹۰ھ شیخ سید حبشی متوفی سنہ ۱۰۰۱ھ، قاضی وجیہ الدین علوی متوفی سنہ ۹۹۸ھ، قطب الدین نہروالی مفتی مکہ متوفی سنہ ۹۹۰ھ راجح ابن داؤد گجراتی وغیرہ علم حدیث کی مشعل روشن کیے ہوئے تھے۔

دسویں اور گیارہویں صدی گجرات کی بڑی سدا بہار صدیاں تھیں، اس مبارک زمانہ میں یہ علاقہ انفاس قدسیہ کا ایک عظیم مرکز بھی تھا یہاں مشائخ چشت، مشائخ سہروردیہ سلسلۂ مغربیہ، رفاعیہ، قادریہ، نقشبندیہ، شطاریہ اور عیدروسیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

اسلامی تہذیب و تمدن کے عہد عروج میں جن ہزاروں نفوس قدسیہ نے اپنی زندگیاں قربان گاہ علم پر نثار کی ہیں، ان میں سے کچھ تو نگاہوں کا مرکز بن گئے لیکن ہزاروں اصحاب فضل و کمال ایسے بھی ہیں، جن کو یا تو ہم نے حافظہ سے نکال دیا یا وہ ہمارے تغافل کا شکار ہو گئے، اس خاکستر میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں کہ اگر ان کو منظر عام پر لایا جائے تو آسمان علم و ادب کے بہت سے تابندہ ستارے نذر چمک اٹھیں گے ذیل میں ایک ایسی ہی شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس نے اپنی معلومات کی وسعت تحقیقات کی ندرت اور علمی فضیلت کے سبب معاصرین اور متاخرین سے خراج تحسین

وصول کیا اور اپنے بعد کتابوں کا ایک ذخیرہ چھوڑ گیا جس کی وجہ سے بزم علم و ادب میں آج بھی اس کا نام عقیدت و محبت سے لیا جاتا ہے، وہ پوری عمر جادۂ علم و تحقیق پر گامزن رہا، حدیث و سیر اخلاق و تصوف اور تاریخ و سوانح اس کا خاص موضوع تھا، انکی مایہ ناز تصنیف "النور السافر عن اخبار القرن العاشر" ان کے فضل و کمال کی شاہد ہے، ذیل میں ان کے اوراق حیات اور ان کی خدمات جلیلہ کی مرقع کشی کی جارہی ہے،

نام و نسب: عبدالقادر نام، ابوبکر کنیت، اور محی الدین لقب ہے، مسلک کے اعتبار سے شافعی اور سلسلۂ تصوف کے لحاظ سے عیدروسی تھے،

ولادت: انھوں نے اپنی سوانح حیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ربیع الاول ۹۷۸ھ میں میری ولادت ہوئی، والد محترم نے ولادت کے سلسلہ میں مختلف تاریخیں نوٹ کرلی تھیں، ان میں سے ایک "بخ بخ مولود سید قطب زمانہ" ہے، مختلف شعرائنے جو تاریخیں کہی تھیں وہ النور السافر میں دیکھی جاسکتی ہیں، انھوں نے اپنی ولادت اور لقب (کنیت) کے بارے میں ایک منامی بشارت یوں نقل کی ہے "میری ولادت سے نصف ماہ قبل میرے والد نے اولیاء کرام کی ایک جماعت کو خواب میں دیکھا، ان میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابوبکر العیدروس تھے، شیخ جیلانی نے میرے والد سے کچھ مطالبہ کیا، والد نے اس خواب کی تعبیر کے طور پر میری کنیت ابوبکر اور لقب محی الدین تجویز کیا[۲]

والد: شیخ عبدالقادر کے والد شیخ بن عبداللہ عیدروسی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار

---

[۱] خلاصۃ الاثر ۲/۴۴۲ [۲] النور السافر ۳۳۴ [۳] النور السافر

عالم و صوفی تھے، آپ کی ولادت ۹۱۹ھ میں تریم میں[1] ہوئی تعلیم و تربیت انھوں نے
میں حاصل کی، اس کے بعد حرمین شریفین میں شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں سماع حدیث کی، پھر
زبید کا سفر کیا اور علامہ دبیع کی صحبت میں علم و ادب میں کمال پیدا کیا[2]، ۹۵۸ھ میں
شیخ بن عبداللہ نے رخت سفر باندھا اور ہندوستان کے خوش قسمت خطہ گجرات
کے شہر احمد آباد میں وارد ہوئے، اور یہیں توطن اختیار کر لیا اور اپنے فیض ظاہری
و باطنی سے مخلوق خدا کو فائدہ پہونچایا، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عیدروسی سلسلہ
سے ہندوستان کو روشناس کیا اور اس سلسلہ کو ہندوستان میں فروغ دیا[3]، شیخ تصوف

---

[1] تریم شمالی حضرموت کے اہم شہروں میں تھا، یہ شہر اس بڑی وادی کے بائیں جانب واقع
ہے جو سارے حضرموت سے ہو کر گذری ہے، اور جسے شبام کے مشرق میں وادی نبیلہ یا وادی
حضرموت کہتے ہیں، عرب جغرافیہ دانوں نے حضرموت میں دو بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے، شبام
اور تریم، صاحب معجم البلدان نے اس ذیل میں اعشیٰ اور کثیر کے اشعار بھی نقل کیے ہیں
(معجم البلدان ۲/۳۸۵) زمانہ قدیم میں تریم حضرموت کی صنعت پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا
طلائی حاشیے والی ریشمی شالیں وہاں کی مشہور تھیں، زمانہ مابعد میں یہ علم و ادب کا بھی بڑا مرکز
رہا ہے، نحو، ادب، حدیث، فقہ، تفسیر کے نامور ائمہ یہاں پیدا ہوئے، تجارت میں بھی اس کی
بڑی شہرت رہی ہے، ہندوستان کے ساتھ اس کے تجارتی روابط تھے، حضرموت کے جو لوگ بغرض تجارت
تھانہ و حضار و بیکھل، تریم اور تیریم دو الگ جگہوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات واضح
ہوتی ہے کہ تریم حضرموت کا ایک قلعہ ہے اور تریم ایک معروف و مشہور مقام ہے (ملخص دائرہ معارف
اسلامیہ ۶/۹۲) [2] معارف الهند (دبیان عربی) صفحہ ۱، والنور السافر صفحہ ۳۰۳ [3]
سلسلۂ عیدروسی کے بانی سید عفیف الدین عبداللہ عیدروس کبیر ہیں، اس سلسلہ کی اساس

میں اعلیٰ ادبی حیثیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، درس و تدریس کے میدان میں بھی ان کی بہت سی یادگاریں "العقد النبوی السر المصطفوی" "الفوز ابشری" "تحفۃ المرید" کی دو شرحیں، "رسالۃ المعراج" "الحزب النفیس" وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں علامہ ربیع کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی تھی، ان کے اشعار کے نمونے "النور السافر" میں دیکھے جا سکتے ہیں، عربی کا ایک دیوان ان سے منسوب ہے، تبرک کے لیے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں

حجاب من اللّٰہ وحرز منیع ۔۔۔ علینا دواما وفضل وسیع

اللہ کا سایہ اور اس کا فضل و کرم ہر لحظہ ہم پر سایہ فگن ہے

وحسبی ربی لطیف بدیع ۔۔۔ علیم بحالی بصیر سمیع

میرے لیے میرا پروردگار کافی ہے وہ بڑا ایک میرے حال کا سننے جاننے والا ہے،

عبدالقادر عیدروسی نے ان کے کمالات و مناقب کو "فتوحات القدوسیۃ فی الخرقۃ العیدروسیۃ" کے مقدمہ میں بہ تفصیل لکھا ہے، ۹۹۰ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، حضن خانہ میں دفن کیے گئے، قبر لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے، قبہ کی تاریخ تکمیل انھوں نے "لمن الفیض" ۹۹۹ سے حروف سے نکالی، قطعہ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۷) عبداللہ عیدروس کے چچا ابوبکر عیدروس، ابوبکر عیدروس کے والد سید عفیف الدین عیدروس ہیں، جب ان کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے عبدالقادر ان کے جانشین ہوئے، اور وہ حضرموت میں اس سلسلہ کو ان کے پوتے شیخ محمد بن عبداللہ اور پھر شیخ جعفر علی بن عبداللہ بن شیخ نے سنبھالا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ گجرات و دکن کے اکثر علاقوں میں پھیل گیا، (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مطبوعہ دمشق ص ۱۸۶، ۱۸۷) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ص ۱۲۶، ۱ النور السافر ص ۳۴۰

۲ نزہۃ الخواطر ۱۵/۲۳۵، ۳ معارف العوارف ص ۱۸

کثرت فیضہا قد جاء ضبطا   عن الفیض تاریخ البناء[1]

(صاحب قبر کے کثرت فیض سے اس کی تاریخ بنا عن الفیض کے حروف سے نکلتی ہے)

والدہ ماجدہ | شیخ عبد القادر کی والدہ بھی بڑی صاحب کرامات تھیں، ان کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میری والدہ ام ولد تھیں، شاہی گھرانہ کی بعض عورتوں نے ان کو میرے والد کو ہبہ کیا تھا، اور ان کو بڑے عطیات، سازوسامان اور مکانات سے نوازا تھا، ان کی خدمت پر کنیزیں مامور تھیں، شاہی گھرانے کی عورتیں ان کو اپنی بیٹی کی طرح مانتی تھیں، وہ خود ان کی مزاج پرسی کے لیے مہینہ میں کئی بار آتیں، میری والدہ ماجدہ بہت نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، تواضع، فیاضی، سیرچشمی اور حسن اخلاق میں وہ اپنی مثال آپ تھیں، ان کا انتقال جمعہ کے دن رمضان المبارک ۱۰۱۱ھ میں ہوا، انتقال کے وقت ان کی زبان پر کلمۂ طیبہ کا ورد تھا، یہ خاتمہ بالخیر کی واضح دلیل ہے، ان کی قبر میرے والد کی قبر کے باہر ہے"[2]

تعلیم و تربیت | شیخ عبد القادر علوم ظاہری و باطنی کے رمز شناس تھے، تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے ہوا، اور اسے بعض اولیاء اللہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد تحصیل علم میں مشغول ہوئے، اور وطن ہی کے بعض مشاہیر سے اکتساب فیض کیا، بعض علوم کا درس اپنے والد شیخ ابن عبد اللہ سے کیا، اور دوران عمر ہی میں محدث زمانہ شیخ عبد المعطی باکثیر کے حلقۂ حدیث میں مجھ کی ... کی اور اجازت سے سرفراز ہوئے تھے

[1] النور السافر ص ۵۹ ... ایضاً ص ۳۳ ... ص ۴۳

تحصیل علم کے لیے انھوں نے دور دور کے سفر بھی کیے ۹۹۰ھ میں جیول کا سفر کیا وہاں کچھ عرصہ تک قیام کیا اور علامہ محمد سفری ابن السلام علی سفری، شیخ عبدالقادر بن مخدوم الخطیب جیسے یگانۂ روزگار اصحاب سے استفادہ کیا اور بھروچ و احمدنگر میں تحصیل علم کے لیے گئے کامل چار سال کی رحلت علمی کے بعد ۱۰۰۰ھ میں احمدآباد واپس ہوئے اور پھر درس و افادہ کی مجلس گرم کی[1] وہ کہتے ہیں کہ "جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ میرے سردار شیخ عبداللہ عیدروس نے فرمایا ہے کہ جس نے احیاء علوم الدین امام غزالی کو چالیس مرتبہ پڑھا تو میں اللہ کے بھروسہ پر اس کی جنت کی ضمانت دیتا ہوں" تو میں نے اسی نیت سے اس کو پڑھا اور اس کے ساتھ اولیاء کرام کی صحبتوں اور علماء کی مجلسوں سے بہت کچھ حاصل کیا[2]

راہ سلوک: علوم ظاہری میں کمال کے بعد علوم باطنی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور مشائخ عظام کے فیض صحبت سے اس راہ میں وہ مقام حاصل کرلیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے پہلے مربی انکے والد ماجد تھے ان کے بعد چچازاد بھائی حاتم بن احمد ان عدل نے ان پر اسرار و رموز کے در کھولے پھر قطب وقت شیخ عبداللہ بن شیخ العیدروس سے فیضان حاصل کیا یہ ان کے چچا تھے انھوں نے خرقۂ تصوف عطا کیا اور اجازت سے سرفراز فرمایا چوتھے درویش حسن کشمیری پانچویں شیخ موسیٰ بن جعفر کشمیری اور چھٹے ولی کامل محمد بن الشیخ حسن تھے[3]

فیض باطنی: متذکرہ بالا شیوخ سے کسب فیض کے بعد انھوں نے مسند تلقین و ارشاد کو زینت بخشی اسیکڑوں افراد نے اس سرچشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی جن کا پھر ذکر ہوگا

---

[1] النور السافر ص ۴۵۹ [2] ایضاً ص ۴۶۳ [3] الزہر الباسم بحوالہ خلاصۃ الاثر ج ۲/۲۴۴

درس و تدریس: علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ ان کے اساتذہ و ارشاد و تلقین اور
تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور ان کے کاشانے بیک وقت مدرسے
بھی تھے اور خانقاہیں بھی، عیدروس نے بھی اکابر کے اس طریقہ کو جاری رکھا یہ
ضرور ہے کہ ان کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور جاذب نظر تھا کہ ان
کا شمار مشائخ میں ہوا، اور تذکرہ نگاروں نے اسی حیثیت سے ان کا تذکرہ لکھا
اس طرح ان کی علمی حیثیت دب کر رہ گئی، اور درس و تدریس کی زیادہ تفصیل
نہیں ملتی ہے، مگر خود انھوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حدیث رسولؐ کا درس بڑی محنت
اور توجہ سے دیا کرتے تھے، ۹۹۰ھ کے واقعات میں تحریر کرتے ہیں کہ

جب اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق ارزانی فرمائی تو میں نے بخاری شریف کے درس
کو لازمۂ حیات بنا لیا، اب تک چالیس سے اوپر ختم کرا چکا ہوں، اس درس کی
اطراف واکناف میں بڑی شہرت ہوئی اور اسمیں شرکت کے لئے مخلوق کا اژدحام ہوتا تھا،

مسلک: مصر شافعی مذہب کا بڑا مرکز تھا، امام شافعی نے وہاں کافی عرصہ تک قیام
کیا تھا اور ان کے شاگردوں نے بھی وہیں رہ کر فقہ شافعی کی تدوین و اشاعت کی
حضرموت میں بھی شافعی مذہب کا عام رواج تھا، عیدروس کے والد بھی شافعی
تھے، وہ حضرموت سے ہندوستان آئے تو انھوں نے اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے
عبدالقادر نے شافعی مذہب کی تدوین و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، ان کے اس
تعلق خاطر کا اثر ہے کہ النور السافر میں شوافع کا ذکر بہت زیادہ ہے، ان کے علاوہ
علماء احناف کا ذکر کم ہے اس کی وجہ سے کتاب کی جامعیت میں بڑا فرق
ہو گیا ہے،

ذوقِ شعر و سخن | اگرچہ ان کی زیادہ تر توجہ حدیث، تفسیر، فقہ، سیرت اور تصوف پر مرکوز رہی لیکن تفنن طبع کے لیے گاہے گاہے شاعری کی جانب بھی توجہ کر لیا کرتے تھے لیکن دیگر علوم و فنون جو ان کے لیے وجہِ افتخار تھے ان کو نظر انداز کبھی نہیں کیا، وہ ایک مایۂ ناز مورخ علامۂ دوران اور صوفی باصفا تھے اس لیے ان کے اشعار لطافت کے ساتھ موعظت و حکمت کا خزینہ اور اسرار و رموز کا گنجینہ ہیں، افسوس ہے کہ ان کا دیوان دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔

کتب خانہ | عبد القادر عیدروسی نے ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف و تالیف کو زندگی بھر جاری رکھا اور بیش قیمت کتابیں تحریر کیں، تاریخ تذکرہ، سیرت اور دیگر موضوعات پر تصنیف و تالیف کے لیے کتابوں کے ایک ذخیرہ کی ضرورت تھی، اس بنا پر ان کے یہاں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ (یاد ایام ص ۶۸)

صاحب نجم اس سلسلہ میں لکھتے ہیں،

انھوں نے مفید کتابوں کے جمع کرنے پر بہت بلند ہمتی اور اس سلسلہ میں دوسرے ملکوں سے تلاش کرائیں اس طرح ان کے پاس ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا اس کے ساتھ ان کے والد کی بھی بڑی کتابیں ان کے پاس تھیں۔

وفات | شیخ عبد القادر ساٹھ سال تک گجرات کو ارشاد و تلقین کا مرکز بنائے رہے، ہزاروں تشنگانِ علم اس چشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کرتے رہے، تا آنکہ ۱۰۳۸ھ میں ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا اور احمد آباد میں اپنے باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے، مزار مرجع انام ہے، ”بگو ما ابو ظفران کی جائے قبر

کے بارے میں رقمطراز ہیں "احمد آباد سول اسپتال سے مشرق کو جو گلی گئی ہے
اس کے اختتام پر محلہ جوہری باڑہ میں ان کی قبر ہے"[1]

صاحب الاعلام اور النور السافر کے محشی نے آپ کا سن وفات ۱۰ محرم
۱۰۲۳ھ درج کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ قاضی زاہد الحسینی نے اپنی کتاب طبقات
المفسرین میں عبدالقادر کی وفات کے لیے ۱۰۳۱ھ درج کیا ہے، جو
کتابت کی فاحش غلطی ہے،

شاگرد: شاگردوں کی تعداد بہت ہے ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے،

شیخ بن عبداللہ بن شیخ: یہ شیخ عبدالقادر کے بھتیجے تھے، ۹۹۳ھ میں تریم میں پیدا ہوئے،
وطن میں اکابر سے کسب فیض کیا، اس کے بعد حرمین کا رخ کیا اور وہاں کے اکابر
داعیان سے استفادہ کیا، اور تقویٰ و طہارت میں بلند مقام کے حامل ہو گئے،
۱۰۲۵ھ میں ہندوستان آئے اور شیخ عبدالقادر کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے
ان سے خرقہ اور اجازت حاصل کرنے کے بعد دکن چلے گئے، وہاں وزیر اعظم عنبر نے ان
کا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا، برہان نظام شاہ بھی آپ کے فضل و کرم سے بہت متاثر
ہوا۔ اس پر درباری حاشیہ نشینوں نے کان بھرنا شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ان کو دکن سے کوچ کرنا پڑا، وہاں سے رخصت ہو کر ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں
بیجاپور چلے گئے، ابراہیم بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا، یہاں ان سے ایک کرامت کا ظہور ہوا، جس سے سلطان
کا اعتقاد بہت بڑھ گیا، سلطان کے نچلے حصہ میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جس کی
وجہ سے وہ نقل و حرکت سے معذور ہو گیا تھا، اطبا علاج میں ناکام ہو چکے تھے،

---

[1] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے ص ۲۰۵، ۲۰۶ حاشیہ النور السافر ص ۳۴۴

سلطان قلی کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے فرمایا پورے طور پر بیٹھو، بیٹھتے ہی ساری تکلیف ختم ہو گئی، اس واقعہ سے سلطان ایسا متاثر ہوا کہ شیعہ مذہب ترک کر کے سنی ہو گیا، سلطان کی وفات تک وہ یہیں رہے، اس کے بعد دولت آباد منتقل ہو گئے، وہاں ملک عنبر کے لڑکے وزیر اعظم فتح خاں نے اس اخلاق و احترام کا اظہار کیا کہ یہیں قیام فرما لیا، اور خلق خدا کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، آخر کار ۱۰۴۱ھ میں دولت آباد ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے، ان کی ایک کتاب السلسلۃ فی الخرقۃ الشریفۃ، بہت مقبول و مشہور ہوئی، (خلاصہ)

احمد بن محمد بن عبدالرحیم یہ بھی اپنے عہد کے یگانۂ روزگار فاضل تھے، فقہ شافعی پر عبور رکھتے تھے، اس لئے فقیہ ان کے نام کا جزو ہو گیا، والد اور وطن کے دیگر اعیان سے تحصیل علم کی، ۹۹۲ھ میں حرمین گئے، اور وہاں مشائخ حرمین سے استفادہ کیا، پھر ہندوستان تشریف لائے اور شیخ عبدالقادر کی خدمت میں ربیع الاول ۹۹۴ھ سے جمادی الاولیٰ ۹۹۵ھ تک رہ کر فیضیاب ہوئے، اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جانے کی اجازت مانگی، اور احمد آباد سے برہان پور آئے وہاں سلطان علی عادل شاہ نے بڑی پذیرائی کی، مگر یہ حسن ظن زیادہ دنوں قائم نہیں رہا ملکی حفاظت اور اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر علی عادل شاہ نے حالت سفر میں لاہور کے قریب ان کو زہر دلوا دیا جس سے بدھ کی رات ۱۳ شوال سنہ ۱۰۰۰ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، موصوف فہم و فراست، علم و فضل، جودت طبع اور قوت حافظہ میں بے نظیر تھے، تفسیر حدیث، اور فقہ میں مہارت کے ساتھ

وقتاً فوقتاً اور دوسروں پر گہری نظر رکھتے تھے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے
اس کے علاوہ وہ درس و تدریس اور افتاء کی اجازت سے بھی سرفراز تھے، صاحب
لطائف کے تو بادشاہ تھے، ان کی وفات پر علماء نے بہت ماتم کیا اور شعراء نے
دلدوز مرثیے لکھے صاحب النور السافر نے ان کی وفات پر پردرد مرثیہ لکھا تھا،
جسے لوگ پڑھ کر غم میں ڈوب جاتے تھے،

عفیف الدین عبداللہ بن فلاح الحضرمی | شیخ عبداللہ بھی شیخ عبدالقادر کی صحبت میں رہے،
اور ان سے روحانی فیوض حاصل کیے، شیخ عبدالقادر خود لکھتے ہیں کہ "میں جب ۹۹۹ھ میں
احمد نگر گیا تو عبداللہ نے میری خدمت میں رہ کر الفتوحات القدوسیہ فی الخرقۃ
العیدروسیہ شروع سے آخر تک پڑھی" شیخ کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے،

سید شیخ بن عبدالقادر | یہ بھی اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں تھے، النور السافر کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر کے ایک ہی صاحبزادے تھے جو اپنے والد
کے نقش قدم پر تھے، انھوں نے اپنے والد ہی سے کسب فیض کیا، ۹۹۳ھ میں ان کی
ولادت بھڑوچ میں ہوئی، صاحب نزہۃ الخواطر نے احمد آباد مولد لکھا ہے، جو صحیح
نہیں ہے، اپنے والد سے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے اور والد کی حیات
تک ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد سورت میں فیض و افادہ کی خدمت انجام
دی، اور سورت ہی میں مستقل قیام کر لیا، صاحب نزہۃ الخواطر نے الحدیقۃ الاحمدیہ
کے حوالے سے ان کی وفات جمادی الاولی ۱۰۹۶ھ لکھی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی، النور
السافر کے مطبوعہ نسخہ میں حاشیہ پر وفات ۱۰۲۸ھ لکھی ہے اور یہی صحیح ہے، آپ کا انتقال
احمد آباد میں ہوا، اور قبر دادا کے پہلو میں ہے

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ "مجھے ان کی وفات پر سخت صدمہ ہوا، جب یاد آجاتی ہے اور رنج و غم کا طوفان برپا ہو جاتا ہے، اور ان کا غم ہر دم تازہ رہتا ہے، میں نے ان کے حالات پر اپنی کتاب "تصدیق الوفا بحق الاخا" میں لکھے ہیں[1]

محمد بن موسیٰ بن محمد ابی بکر الثقافی | یہ بھی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار فاضل تھے، اپنے وطن کے علماء سے کسب فیض کے بعد ہندوستان آئے، اور شیخ عبدالقادر کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے، کچھ دن کے بعد شیخ نے ان کو شیخ عبداللہ بن علی کی خدمت میں بھیج دیا، چنانچہ وہط میں ان کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے، ۹۹۱ھ میں شیخ کے حکم سے فریضۂ حج ادا کیا، شیخ شلی کہتے ہیں کہ وہ میرے محترم و باکمال استاد تھے، ان کی کرامات معروف و مشہور ہیں، آخر عمر میں وہ حرمین میں مقیم ہو گئے تھے، اس لئے نزیل حرمین ان کے نام کا جزو ہو گیا، مکۂ مکرمہ ہی میں بعد نماز جمعہ ۱۰۰۱ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، ان کے جنازہ میں خلقت کا اژدحام تھا، امیر مکہ نے بھی مشایعت کی اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی قبر مبارک کے پاس سپرد خاک کیے گئے[2]

الشیخ احمد بن علی المالکی بھکری | یہ بھی ہندوستان کے مایۂ ناز عالم اور بزرگ تھے، مؤرخ شلی کہتے ہیں کہ وہ کامل الصفات، بلند افکار اور صاحب ذوق لطیف تھے، روز حساب سے بہت ڈرتے تھے، اپنے والد سے تحصیل علم کے بعد شیخ عبدالقادر اور دیگر مشائخ سے کسب فیض کیا،

صاحب النور السافر نے اپنے اس شاگرد کے بارہ میں لکھا ہے" شیخ احمد اپنے

---

۱ نزہۃ الخواطر ۵/۵ ۲ المشرع الروی بحوالہ خلاصۃ الاثر ۴/۴۲ ۳ ایضاً بحوالہ نزہۃ ۵/۱۵

علم و عمل میں بہت ممتاز، کتاب و سنت کے سچے، سلف کے طریقہ پر گامزن، اقامت پسند
عفیف اور بلند کردار تھے، وہ ہر لمحہ مشغول رہتے، مطالعہ یا کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا
وفات سے قبل بینائی سے محروم ہو گئے تھے، اہل علم نے ان کی شان میں بلند پایہ قصائد
لکھے[1] ۲۲/ربیع الثانی ۹۵۸ھ میں احمد آباد میں وفات پائی[2]

سید محمد بن عبد اللہ الحضرمی یہ بھی اپنے وقت کے مشائخ میں تھے، ۹۱۰ھ میں پیدا ہوئے، اپنے
وطن میں اپنے والد اور دوسرے علماء سے کسب فیض کیا اور حدیث و فقہ میں کمال کے
ساتھ تصوف و سلوک میں بھی مدارج عالیہ کو پہونچے، ان کے دادا شیخ بن عبد اللہ
احمد آباد میں تھے، جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو ان کو احمد آباد
بلا لیا، انھوں نے بہت سے علوم دادا سے حاصل کیے، عم محترم شیخ عبد القادر
بھی ان کے علم و فضل سے متاثر تھے، سید محمد نے ان سے بھی علوم کی تحصیل کی، اور
فضل و کمال کی اس منزل کو پہونچے جہاں دوسرے نہیں پہنچ پائے، ان سے
اجازت و خلافت سے سرفراز ہو کر سورت میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن
کیے رہے، ۹۹۰ھ میں سورت ہی میں انتقال کیا[3] ان کی قبر پر بعض تاجروں نے
ایک بڑا قبہ بنوایا اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کی، اور ایک کنواں بھی اسی
کے قریب کھدوایا، پھر اس پر ایک بڑی جائداد وقف کی گئی، ان کی قبر زیارت
گاہ خلائق ہے[4]

۱؎ النور السافر و نزہۃ ۱۵/۲ ۲؎ النور السافر و نزہۃ الخواطر ج ۴
۳؎ خلاصہ
۴؎ نزہۃ

اقبال کی معنویت آج

از

مرزا سید المظفر چغتائی ریڈر فزکس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اقبال اور اقبالیات پر دنیا کی مختلف زبانوں خصوصاً اردو میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر اضافہ کرنے کے لئے غیر معمولی محنت بھی درکار ہے اور غیر معمولی ذہنی صلاحیت بھی جو تلاش و جستجو کو تحقیق کی منزل تک پہونچا دے، اس لیے اس راہ میں قدم اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی اگر اہل علم کا اصرار ہے کہ میں بھی اس موضوع پر لب کشائی کروں مجھے نہ کسی گہری بصیرت کا دعویٰ ہے نہ وسعت علم و نظر کا ادعا پھر بھی علم و ادب کی اس محفل میں شرکت کی جسارت کر رہا ہوں کہ شاید یوسف کے خریداروں میں میرا نام بھی لکھ لیا جائے اور اقبال کے بے شمار مداحوں کی فہرست میں اس کج بیان کا اندراج بھی ہو جائے

صاحبان فکر و نظر سے اس آشفتہ بیانی پر معذرت خواہ ہوں

والعفو عند کرام الناس مأمول

اقبال کی شخصیت اور فن کے یوں تو بہت سے پہلو ہیں لیکن وہ درحقیقت شاعر ہیں، اور ان کی شاعری ان کی عظمت فکر اور بلندی خیال کی ترجمان ہے ان کی شاعری صرف ذاتی زندگی کے تاثرات اور واردات کی عکاس نہیں بلکہ حالات حاضرہ

اور عصر نو کے احساسات کی آئینہ دار ہے بیرونی دنیا کے ان مشاہدات سے اقبال
کو اتنا قریبی تعلق تھا کہ تنہا اس کے ذکر کی متحمل نہ ہو سکی اس لیے قلب و نظر کی گہرائیوں
سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری نے بین الاقوامی رنگ اختیار کیا۔

شاعری کے بڑے عناصر تین ہوتے ہیں کسی فن کو، ذہنی مشاہدہ اور جذبہ
اندرون، یہ سچ ہے کہ شعر یا نثر لکھنے کے بعد تراش و خراش کی ضرورت پڑا
کرتی ہے کلام میں آب و تاب پیدا کرنے کی کوئی حد نہیں ہے لیکن شاعری کے
آغاز سے پہلے تحصیل فن اور مشق سخن ناگزیر ہے، اگر عروض سے واقفیت
اور زبان پر عبور نصیب نہیں ہے تو جذبہ کی کوئی گہرائی مشاہدہ کی کوئی وسعت
اور حک و اصلاح کی کوئی کوشش حرف و سنگ کو در شاہوار اور لعل شب
چراغ نہیں بنا سکتی ہے کیونکہ باتوں میں فن شعر گوئی کے علاوہ وسعت نظر کثرت
مطالعہ فکر کی گہرائی اور قوت مشاہدہ بھی ناگزیر ہے۔ اقبال کو یہ سبھی باتیں
حاصل تھیں، ان کی شاعرانہ عظمت اس بات کی شاہد ہے

مشاہدہ اور جذبہ کے معاملہ میں طبعی مناسبت اور صاحب فن کی شخصیت
کو بڑا دخل ہوتا ہے، لذت و الم کا شدید احساس بہتوں کو ہوتا ہے لیکن اس احساس
کا اظہار ہر شخص کی اپنی ذہنی صلاحیت پر منحصر ہے، اس میں ایک حد تک وہ سماجی اور
ثقافتی تربیت بھی کارفرما ہوتی ہے جو پیدائش سے ہوش کی آنکھیں کھولنے تک اور
اس کے بعد واقعہ کے پیش آنے تک میسر آتی ہے، اس میں وہ زمانی و مکانی فضا
بھی دخل انداز ہوتی ہے، جس میں کوئی فرد دوران واقعہ سانس لے رہا ہو چونکہ
کہ معجزۂ فن کی نمود کے لیے کوئی مخصوص جین موجود ہیں [illegible] لیکن [illegible] کا

ہمیں علم نہیں ہو۔ شاعری کی حد تک کمالِ فن کبھی میراث نہیں رہا ورنہ نظامی اپنے لختِ جگر سے نہ کہتے۔ سے

در شعر مجو بلند نامی ‏‏‏ کیں ختم شد است بر نظامی

آزادی کے بعد سے ہمارے یہاں کوئی بڑا شاعر غالباً اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ نہ ہمیں اب تربیتِ شعر گوئی میسر ہے اور نہ وہ جیتا جاگتا احساس جو سکوتِ لالہ و گل سے بھی کلام پیدا کر لیتا ہے، اور ہنگامہ رستا خیز سے بھی ہمارا ضمیر کچل گیا ہے، اور ہم آسودگی کی نیند سو رہے ہیں، مگر کبھی کبھی خواب میں بڑبڑا اٹھتے ہیں۔

ذہن کی کند صدمات سے زیادہ کسی اور چیز سے نہیں ہوتی۔ ہمیں کوئی شخص یا چیز بہت عزیز ہو اور وہ ہم سے دفعتاً چھن جائے، کوئی تصور جزِ جان ہو اور دفعتاً اس کی شکست و ریخت سامنے آ جائے تو وجود میں زلزلہ آ جاتا ہے، اور ذہن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کسی محبوب ذات یا تصور کی طرف سے مایوس ہو چکے ہوں، اور وہ یک بارگی ہمیں مل جائے تو ایسی بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے کہ خطرہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ شادی غم سے نہ بدل جائے۔ یہ کیفیات زندگی اور اس کے مظاہر کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں بھی معاون ہوتی ہیں، توہمات اور تعصبات کی اصلاح میں بھی سود مند ہوتی ہیں، اور اگر دل فطرت شناس ہو تو عظیم شعری نمود کا بھی سرچشمہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر ذہن نا صاف ہو یا کسی بات سے پورا لگاؤ نہ ہو تو چاہے قیامت ہی کیوں نہ سر سے گزر جائے کوئی اثر نہ ہوگا۔ تعجب ہوتا ہے کہ تقسیمِ ملک اور اس کے ہولناک واقعات پر کوئی عظیم شاعری وجود میں نہ آئی۔

اقبال زندگی بھر ذاتی اور قومی صدمات سے دوچار رہے۔ ان سے ان کے متحرک و فعال ذہن کا ارتقا ہوتا رہا۔ ہم اقبال کے شعری ملکے سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان کے تاثرات کی بوقلمونی سے بھی لیکن سب سے زیادہ ان کے فکر کی ارتقائی حرکت ہمارے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ شاعری ہو یا کچھ اور فن کا اندازہ اس کے تاثرات کی گہرائی اور گیرائی Range and depth سے ہوتا ہے۔ گہرائی شدتِ خلوص سے آتی ہے اور گیرائی وسعتِ نظر سے۔ محض فنی مہارت، الفاظ کی تراش و خراش، محاوروں کے استعمال اور لفظوں کے دروبست سے شعر میں اثر نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اثر انگیزی کے لیے دلِ پرسوز اور چشمِ گوہر بار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا دل راتوں کے گداز اور دنوں کی تپش سے خالی ہے اس کے کلام میں انقلاب آفریں تاثیر تلاش کرنی فضول ہے۔ صرف وقتی تحریکات اور مقامی تاثرات سے کلام میں آفاقیت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی تہذیبی روایات، اپنے علاقائی ماحول اور وقتی مسائل سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہے لیکن صاحبِ فن کی فنکاری ان باتوں کو اتنی وسعت، عمومیت اور جامعیت بخشتی ہے کہ دور و دراز کے لوگ بھی سنتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو میرے دل میں تھا۔ بسا اوقات صراحت سے زیادہ اشارت لطف دے جاتی ہے۔ اسی وجہ سے سرِ دلبراں کو حدیثِ دیگراں کے پیرایہ میں پیش کرنے کو کمالِ فن سمجھا جاتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عظمتِ فن کی ایک بڑی کسوٹی وقت ہے۔ حافظ کو چھ سو برس گزر گئے لیکن آج بھی اس کے اشعار میں ہمیں شادابی و تازگی ملتی ہے۔ اقبال کا دور ابھی دور نہیں ہوا ہے لیکن اس کے کلام کو جو ہمہ گیری نصیب ہوئی وہ شاید ہی کسی اور کو میسر ہوئی ہو۔ وقت کے ساتھ مشرق و مغرب دونوں میں یکساں

ساغر ہیں اور وادی وکہسار سب اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں۔

ممکن ہے اہل زبان ان کے بعض الفاظ اور محاوروں پر معترض ہوں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے افکار وخیالات کے اظہار کے لئے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اور معانی کو دل میں اتارنے کے لئے جیسے مناسب اور پر اثر الفاظ استعمال کیے ہیں ان کے لئے ایک عالم صدائے تحسین بلند کر رہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف نئے مضامین ایجاد کیے، بلکہ ان کی ادائیگی کے لئے ان کے شایان شان ایک مجتہدانہ طرز بیان بھی ایجاد کیا، ان کے خیالات وافکار میں ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی ارتقا ہوتا رہا، بانگ درا کی خطابت بعد میں شعریت میں گھل گئی، اور اگر کہیں ملتی ہے تو ڈرامائی انداز سے، جیسے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں۔

یوں تو نئی ترکیبیں ہر قابل ذکر شاعر استعمال کرتا ہے، لیکن اقبال نے لاجواب تشبیہیں اور ماورائی استعارے پیش کیے ہیں۔ مثلاً

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح　　یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں　　اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

(خضر راہ)

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر　　قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب　　لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

(مسجد قرطبہ)

میرا بھی صنم خانہ تیرا بھی صنم خانہ　　دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

(بال جبریل)

اس سے بڑھ کر اعجاز بیان اور کیا ہوگا'

چند ادب پارے اور ملاحظہ ہوں' دیکھیے الفاظ کی سحر طرازی کس طرح خیالات کو دل نشین کر رہی ہے'

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق — شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب — کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں (بال جبریل)

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نہ رسید — جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نہ رسید

ز شاخ نالۂ مستانہ در محشر چہ می خواہی — تو خود ہنگامۂ ہنگامۂ دیگر چہ می خواہی

(زبور عجم)

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی (ضرب کلیم)

لیکن اقبال کی شخصیت دراصل ان اشعار کی رہین منت ہے' جن میں فکر جذبہ بن کر سامنے آئی ہے' جن میں حالات حاضرہ اور عصری حسیت ہے' جن میں غم دوراں اسی جوش و ولولہ کے ساتھ سامنے آیا ہے' جو ہماری شاعری میں غم جاناں کے لئے مخصوص رہا ہے' عصری آگہی کے ساتھ اسی خلوص کے باعث اقبال کی غزلوں تک میں فکری احساس تخیل کا ہم دوش ہوگیا ہے' مثالیں بال جبریل میں بھی بکثرت مل جائیں گی پیام مشرق میں بھی اور زبور عجم میں بھی' خود ضرب کلیم میں مضامین کا تنوع دیکھئے اور شعریت ملاحظہ فرمائیے' اختصار کے خیال سے نظموں کی نمائندگی اشعار سے کر رہا ہوں'

ہجوم مدرسہ بھی ساز گار ہے اس کو — جنوں کے واسطے لازم نہیں ویرانہ

شعلے سے ٹوٹ کر مثل شرر آوارہ نہ رہ — کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

ابھی تک ہے پردہ میں اولاد آدم — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے'

چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

فن محض سے ہٹ کر فکری فن کی طرف آئیے تو کہنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اقبال کا متحرک وفعال ذہن ہمیشہ سوچتا رہا ہے اور نئے مشاہدات کی روشنی میں نئے نتائج برآمد کرتا رہا ہے، یہی آفاقی سائنسی طرزِ عمل ہے وہ صرف سوال اٹھانے پر کبھی قانع نہ ہوئے، بلکہ انھوں نے ہمیشہ جواب بھی تلاش کیے ہیں، اور علم و دانش اور تہذیب و معاشرت کی گتھیوں کو برابر سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، وہ بنیادی سوال جو گوتم بدھ کے زمانہ سے آج تک انسانی ذہن میں گونج رہا ہے، اقبال کے ذہن میں بھی ہمیشہ گونجتا رہا، انسان آخر مبتلائے آلام کیوں ہے، وہ ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی سے بے حد متاثر ہیں، اور انھیں تاریخ کے گذشتہ اوراق کی جھلک دکھا کر پھر عہدِ رسالت و دورِ صحابہ کو شمعِ راہ بنانے کا مشورہ دیتے ہیں، اور جوابِ شکوہ میں خدا کی زبان سے اعلان کرتے ہیں،

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں، یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

وہ تقدیر کے سایہ میں پناہ لینے والوں اور اپنی کوتاہی و بے عملی کے لیے قسمت کو بدنام کرنے والوں سے کہتے ہیں،

تو کیوں ہے تابعِ تقدیرِ یزداں؟ تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اور انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال قوم کو سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کی دعوت دیتے ہیں، کاش ہمارے نوجوان

اس حقیقت کو سمجھیں کہ

ع زندگی جہد است و استحقاق نیست

آیئے اب سود و سودا اور مکر و فن کے بازار سے ہٹ کر ذرا عقل و عشق کی بحث اقبال کی زبان سے سنیں،

تازہ مرے وجود میں معرکۂ کہن ہوا   عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب،

عملی زندگی میں طرزِ عمل دو ہی ہیں، ایک یہ کہ وہ بات کہو جس سے سب لوگ خوش ہوں، وہ کام کرو جس سے ذاتی نفع وابستہ ہو اور اس طرح سوچو کہ قول و عمل کا تضاد چھپا رہے، یہ ہنر بڑا مشکل ہے لیکن جب تک بن پڑتا رہے اہل دنیا کے بڑے کام آتا ہے،

اقبال جس عقل بولہبی کی جگہ جگہ مذمت کرتے ہیں، وہ یہی ابن الوقتی ہے، دوسری طرف حق و صداقت کی کڑی منزل ہے، جہاں دل و زبان کی ہم آہنگی، قول و عمل کی مطابقت اور ظاہر و باطن کی یکسانی ضروری ہے، لوگ بچوں سے کہتے ہیں سچ بولو، لیکن وہ کبھی محسوس نہیں کرتے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے، انسان جب کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہو، اس کے مطابق ہر برائی سے بچتا ہوا اور ہر فرض ادا کرتا ہو، تب راستباز اور صداقت شعار کہلاتا ہے، اقبال کا عشق یہی ہے، جو عقل کا منتہائے کمال ہے، بے عقلی یا بد عقلی نہیں ہے جس سے توہم پرستیوں کا جواز نکلتا ہے، آج ہم عقل کی دنیا میں بجا طور پر رہ رہے ہیں، لیکن کاش اس دنیا میں چند نفر عشق کے تقاضوں پر پورے اترے ہوئے مل جائیں،

عشق اور وجدان کا قریبی تعلق ہے اور وجدان کا ذکر ادبیات عالیہ

خصوصاً اقبالیات میں برابر آتا رہتا ہے نامناسب نہ ہو گا اگر چند جملوں میں اس کی توضیح کر دی جائے۔ عقلی استدلال، استقرائی یا ریاضیاتی ایک شعوری عمل ہے جسے انسان چند مقررہ اصولوں کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی جذبہ یا فکر انسان کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے تو دماغ سوتے جاگتے اسی کی دھن میں لگ جاتا ہے، اور لاشعور میں مسئلہ کو حل کر لیتا ہے، اسی کو وجدان کہتے ہیں، وجدانی نتیجے کمپیوٹری رفتار سے چشم زدن میں برآمد ہوتے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے پیچھے مدتوں کی لگن اور تڑپ ہوتی ہے، جسے لوگ فراموش کر جاتے ہیں،

عشق و عقل سے بات فوراً سخت کوشی تک پہنچ جاتی ہے، جس سے اقبال کے مطابق زہر زندگانی انگبین بن جاتا ہے، آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ محنت کا پھل کم اور ہنرمندی کا زیادہ ملتا ہے، پس ماندہ ملکوں کا مزدور جتنی محنت کر کے قوت لایموت کما تا ہے، ترقی یافتہ ملکوں میں اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور سیم و زر کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن ہنرمندی کے لیے سلیقہ بھی درکار ہے، عقل کی کارفرمائی اور سلیقہ کی کیمیا گری ملکہ کو لاکھ بنا سکتی ہے، عقل راہ دکھاتی ہے اور عشق بے خطر آگے قدم بڑھاتا ہے، دماغ کے ساتھ پامردی بھی ضروری ہے، اگر عقل نے سمت سفر متعین نہیں کی تو تگا پوئے پیہم سے کچھ حاصل نہیں ہو گا ملکہ منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جائے گی، رخ اگر ترکستان کی طرف ہے تو کعبہ تک رسائی کیونکر ممکن ہے،

اقبال کے افکار میں خودی اور بے خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے،

انفرادی صلاحیتوں کو کھلے بغیر ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہونچنا اثبات خودی ہے، اس منزل پر پہنچ کر افراد کی خودی باہمی تعاون سے ایک وسیع تر جماعتی خودی کو جنم دیتی ہے، جو اگلے مراحل طے کراتی ہے اور منتہائے کمال کو پہنچ کر وسیع تر جماعت اور وسیع تر خودی کو وجود میں لاتی ہے، اس طرح انسانی معاشرہ کی ساخت بعضوا اور وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے، نفی خودی کے بغیر بے خودی کے ذریعہ افراد سے خاندان، خاندانوں سے شہر، شہروں سے ملک اور ملکوں سے انسانی برادری بنی اور بن رہی ہے، ہر پھول کا رنگ و بو سلامت ہے، لیکن ان کی حتمی غایت چمنستانوں کی تعمیر ہے،

یہ اصول سیاسیات، انسانیات، سماج اور مذہب سب پر عاید ہوتا ہے، محدودیت سے وسعت کی طرف ہمارا سفر جاری ہے، مگر یہ عمل پائدار اسی وقت ہوتا ہے کہ نفی خودی نہیں بے خودی پیش آئے، نپولین اور ہٹلر کی کوششیں ناکام رہیں، کیوں کہ وہ دوسروں کی تہذیبوں کو کچل رہے تھے، آج مفکرین ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں، اور بین الاقوامی ادارے کو پروان چڑھانے کی فکر ہے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ چھوٹی وحدتوں کی خودی توڑی نہیں بلکہ جوڑی جائے، اور ان کی انفرادیت کے تحفظ کے ساتھ ایسی اجتماعیت کی طرح ڈالی جائے جو سب کی سلامتی کی ضامن ہو، ہمارے برصغیر کے لیے ان تصورات میں تعمیر مستقبل کے لیے اشارے ہیں،

اقبال ایک باغی ذہن کے مالک تھے، کسی عمل کا مستحکم وجود بغاوت کے بغیر ممکن نہیں، نقش راچہ نقش، انھوں نے فکر مدرسہ و خانقاہ کو آزاد کرانے

کی کوشش کی تقدیر کو بہانہ بنانے والوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، سار دشانی کا طلسم توڑا، جذبۂ عمل اور جذبۂ انقلاب کو سراہا وہ جب اور جہاں کہیں بھی انھیں نظر آیا عالم بیداری میں ہو یا عالم خواب میں، اس کے لیے سرگرم عمل رہے

ع زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے،

یہ طرزِ عمل، یہ تلاش، یہ راہ سلوک ان کا سب سے بڑا اسوہ ہے، یہی ان کی سب سے بڑی عصری معنویت ہے، وہ جہاں تک پہونچے وہ ہماری آخری منزل نہیں ہے، ہمیں سفر اس کے آگے جاری رکھنا ہے،

گذر جا عقل کے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے،

حدیث شریف ہے کہ:۔

انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے معنی شئے کو ترک کرکے اس کی جگہ بامعنی چیز اختیار کرتا رہے،

عالم انسانیت کو ابدی پیام دینے والے کی شایان شان وسعت کے ساتھ ہمیں اس حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے،

اقبال کامل

اس میں علامہ اقبال کے سوانح و حالات اور ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ ان کی شاعری کے اہم موضوعات یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بے خودی نظریۂ کلیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی نہایت دلنشین تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی، قیمت

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

پہلی جنگ عظیم میں جب جرمنوں کو شکست ہوئی تو اس کا اثر ترکوں پر بہت بُرا پڑا جنگ میں وہ جرمنی کے ساتھ تھے، اس لئے برطانیہ، امریکہ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کو ترکوں کے خلاف کارروائی کا موقع مل گیا، ان لوگوں کی دیرینہ آرزو تھی کہ ترکوں کی طاقت ختم ہو جائے، اور خلافت عثمانیہ پارہ پارہ ہو جائے، انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے انیسویں صدی میں بے شمار منصوبے بنائے، طرح طرح کی سازشیں کیں، کبھی زار روس کی فوجیں حملہ آور ہوتی تھیں کبھی برطانوی لشکر آگے بڑھتا تھا، کبھی فرانس اور اٹلی کی طرف سے خلافت عثمانیہ پر حملے ہوتے تھے، آج قفقاز زیر یلغار ہے کل ٹیونس زد میں ہے کبھی الجزائر تاراج ہو رہا ہے، کبھی بلقان کی ریاستوں کو بغاوت پر آمادہ کیا جا رہا ہے امیر شکیب ارسلان مرحوم نے اپنی مشہور کتاب حاضر العالم الاسلامی کے حواشی میں ان سازشوں اور حملوں کی تفصیل بیان کی ہے،

پہلی جنگ عظیم کے بعد ان لوگوں کو موقع مل گیا، جنگ کے دوران عربوں کو آزادی و خود مختاری کا خواب دکھایا گیا، خلافت عثمانیہ کے حجازی گورنر

شریف حسین اور ان کے لڑکوں فیصل اور عبداللہ کو پورے طور پر بغاوت کے لیے آمادہ کر لیا گیا، خلافت عثمانیہ کے وزیر اعظم انور پاشا خود حجاز گئے تاکہ شریف حسین کو اس سے باز رکھیں لیکن ان کے سامنے شریف نے خلافت سے پوری وفاداری کا اظہار کیا، چشم دید راویوں کا بیان ہے کہ خانۂ کعبہ کے اندر جا کر انور پاشا کے سامنے شریف نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ میں کسی سازش میں شریک نہیں ہوں اور ترکی حکومت کا پوری طرح سے وفادار رہوں، لیکن انور پاشا کے جاتے ہی برطانوی حکومت کے اشارہ اور مدد سے بغاوت کا اعلان کر دیا چند ہزار ترک سپاہی کیا کر سکتے تھے، بکثرت شہید ہوئے، حرم میں بھی ان غریبوں کو پناہ نہیں مل سکی۔

شریف حسین کے ساتھ ان کے بیٹوں نے بھی عراق، شام، لبنان اور فلسطین میں علم بغاوت بلند کر دیا اور برطانوی فوجوں کی مدد سے ان علاقوں سے ترکوں کو بے دخل کر دیا، جب لارڈ ایلنبا لی کی سرکردگی میں فیصل بن حسین بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے تو برطانوی جنرل نے کہا کہ آج صلیب کو ہلال پر مکمل فتح ہوئی، بیت المقدس مسیحی اقتدار کے ماتحت آگیا، یہ صلیبی جنگ ہم نے اس طرح فتح کی کہ ہماری فوج کا رہبر اور معین کار فرزند رسول ہے، یہ شریف حسین اور ان کی اولاد کی سیادت کی طرف اشارہ تھا، یہ لوگ ہاشمی تھے اور اپنے کو آل رسول کہتے تھے، ان واقعات سے سارا عالم اسلام بے چین ہو گیا تھا اور ان اسلامی علاقوں اور مقدس مقامات کی بازیابی کے لیے مسلمانوں نے جان کی بازی لگا دی، ہندوستانی مسلمان سب سے پیش پیش تھے

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام اور دوسرے رہنماؤں نے اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، شریف حسین کی اس حرکت ناروا سے متاثر ہو کر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا،

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ ۔۔۔ خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

عیسائی حکومتیں صرف اس پر قانع نہ تھیں کہ عرب و افریقہ سے ترکوں کا اقتدار ختم ہو جائے بلکہ ان کی آرزو تھی کہ ایشائے کوچک اور قسطنطنیہ سے بھی بے دخل ہو جائیں، اور دنیا سے دولت عثمانیہ کا نام و نشان مٹ جائے، اس کے لئے ایک طرف انھوں نے خلیفہ کو مجبور کر کے قسطنطنیہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور دوسری طرف یونان کو شہ دے کر ایشائے کوچک پر حملہ کرا دیا، یونانی فوجوں نے خون کے دریا بہا دیئے، سمرنا اور دوسرے شہروں پر ان کا قبضہ ہو گیا، اور قریب تھا کہ دولت عثمانیہ کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اقبال سہیل نے اس خون ریزی سے متاثر ہو کر کہا تھا،

کہیں رامشگر یونان کی بزم رقص برپا ہے ۔۔۔ کہیں خونیں تماشا ہو رہا ہے جنگ بلقاں کا

مسلمان علامہ شبلی کے الفاظ میں یقین رکھتے تھے کہ

ع زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے

اسی لیے فرزند و عیال و خانماں کی فکر سے بے نیاز ہو کر ان صلیبی حملہ آوروں کی پسپائی کے لیے دل و جان سے کوشاں تھے، اللہ نے ترکوں کو ہمت دی اور انھوں نے یونانیوں کو ذلت بخش شکست دے کر یورپی حکومتوں کو مجبور کر دیا کہ ان کے وجود کو تسلیم کریں جب کچھ عرصہ کے بعد ترکوں نے یونانی فوجوں کو شکست دے کر

سمرنا پر پھر قبضہ کیا تو سہیل مرحوم نے بڑی پرزور نظم لکھی، جو معارف کے تقریباً دو نمبروں میں شائع ہوئی تھی، انھوں نے بڑی مسرت سے کہا تھا،

زمانہ نے ورق الٹا ہے پھر تاریخ ماضی کا　　وہ پہونچا پرچم اسلام پھر ارض سمرنا میں

مجاہدین کی جانبازی اور شوق شہادت سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ

کفن سادہ پہننا ننگ ہے رنگیں مزاجوں کو
ہم اپنے داغہائے خوں سے گل بوٹے بنا دیں گے

ساری دنیائے اسلام میں فتح سمرنا کی خوشی منائی گئی، میں اس زمانہ میں ندوہ میں پڑھتا تھا، وہاں کی مسرت و شادمانی کا نقشہ آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے فتح سمرنا کی خوشی میں ایک دن کی چھٹی ہوئی، اور جشن منایا گیا،

سمرنا تھوڑے ہی عرصہ یونانیوں کے قبضہ میں رہا تھا مگر فلسطین سالہا سال سے یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور بارہ برس سے بیت المقدس پر بھی ان کی حکومت قائم ہے، لیکن مسلمانوں میں پرانے جوش و خروش کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا ہے، عام مسلمانوں کا کیا ذکر ہے عرب حکمرانوں کو بھی کوئی خاص فکر نہیں ہے اور دشمن سے مرد آزمائی کے بجائے آپس میں دست بگریباں ہیں،

عرشی ـ یہی وجہ ہے کہ عرشی جیسے اہم شہر کی بازیابی جو مصر کا مدخل و مفتاح ہے لائق اعتناء نہیں سمجھی گئی، اور صرف اس کے ان ستم رسیدہ باشندوں کے سوا جنھوں نے بارہ سال یہودیوں کے مظالم برداشت کئے تھے اور کسی کی زبان سے مسرت کا ایک کلمہ بھی نہیں نکلا،

پرانی تاریخ عریش ہزاروں برس کا پرانا شہر ہے، قدیم زمانہ میں اسے رہنوکرورا کہتے تھے، پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد یہ لارہض کہلانے لگا ابتدائی عیسوی صدی میں اسی نام سے اس کا ذکر ملتا ہے، قدیم اسرائیلی روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ فراعنہ کے دور میں یہ مصر کی سرحدی حفاظت گاہ تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں ان کے والد اور بھائی اسی راہ سے مصر پہونچے تھے، حضرت یوسف نے یہیں انھیں خوش آمدید کہی تھی، لیکن مستند تاریخ ماخذ سے اس کی تصدیق اب تک نہیں ہو سکی ہے رومیوں کے عہد میں یہ مصر میں شامل تھا اور قیصر کے گورنر متوقس کی یہاں حکمرانی تھی،

اسلامی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب شام اور فلسطین کی فتح مکمل ہو چکی تو مصر کی طرف بڑھنے کا خیال ہوا اور حضرت عمرو ابن العاص کی سرکردگی میں اسلامی فوجیں عریش کی طرف بڑھیں، یہ ریگستانی علاقہ میں اچھا سرسبز وشاداب نخلستان تھا، جہاں پھل اور پانی با فراط تھا، اس لیے قافلوں کی گذرگاہ اور سوداگروں کا مرکز تھا،

کثرت فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ عریش بلا مقابلہ مل گیا، اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں پورا مصر خلافت اسلامیہ کے زیر نگین ہو گیا، رومیوں نے بعد کو وقتاً فوقتاً حملے کئے مگر مصر اسلامی حکومت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکا، صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں کے زمانہ میں بھی مصر محفوظ رہا بلکہ ایک موقع پر مصری فوجوں نے تاتاریوں کو ایسی شکست دی کہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے،

نپولین کا حملہ نپولین نے جب مصر پر حملہ کیا تو ۱۷۹۹ء میں عریش بھی فرانس کے قبضہ میں چلا گیا لیکن ایک سال کے اندر ہی ایک معاہدہ کے مطابق عریش کو فرانسیسیوں نے خالی کر دیا، پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے اس وقت بھی عریش محفوظ رہا، اعلان بالفور کے بعد جب فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہوئی تب بھی عریش ان کی رد سے باہر رہا، پھر کئی بار عرب حکومتوں سے جنگ ہوئی مگر عریش محفوظ رہا

عریش کا سقوط ۱۹۶۷ء میں جب جمال عبد الناصر کے عہد میں یہودیوں سے پھر جنگ ہوئی، تو عربوں کو بری طرح شکست ہوئی، بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا، اور اس کے ساتھ بڑا وسیع عرب علاقہ ہاتھ سے نکل گیا اس وقت جزیرہ نما سینا کے ساتھ عریش بھی یہودی سلطنت میں شامل ہو گیا

بازیابی اس کے بعد سے برابر اس کی بازیابی کی کوشش ہوتی رہی، مگر کامیابی نہ ہو سکی، بالآخر عین مایوسی کے عالم میں اللہ نے ایسی صورت پیدا کی کہ ابھی حال میں بارہ سال کے بعد یہودیوں نے خالی کر کے مصر کے حوالہ کر دیا اور اسرائیلی جھنڈا اتر کر مصری پرچم لہرانے لگا، آج اقبال سہیل ہوتے تو فتح سینا کی کوئی نظم کہتے، تحریک خلافت کی طرح کوئی اسلامی تنظیم ہوتی، تو جوش و خروش کے ساتھ عریش کی بازیابی کا استقبال ہوتا، لیکن اس وقت مسلمان منتشر، احساس اسلامی مفقود، اور اتحاد باہمی غائب ہے، نفسی نفسی کی اس فضا میں جوش و مسرت کہاں سے ہو، آج کل ملت کے مفاد کے بجائے ذاتی فوائد پیش نظر ہیں اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بجائے اپنی سربلندی کی آرزو ہے،

تلخیص و تبصرہ

ارجنٹائنا میں اسلام کی رفتار

ارجنٹائن جنوبی امریکہ کا ایک سرسبز و شاداب ملک ہے اسکا رقبہ ۱۰۰۹ مربع کیلو میٹر اور آبادی ۱۹۶۲ء کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ ستر لاکھ کے قریب ہے، دارالسلطنت بیونس آئرس کے علاوہ کارڈوبا (قرطبہ) لاپلاٹا اور منڈوزا وغیرہ مشہور شہر ہیں، سرکاری زبان اسپینی ہے۔

اسلام کی آواز یہاں کئی سو برس پہلے پہونچ چکی تھی، اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد جب عیسائیوں کا تشدد حد سے گزر گیا تو مسلمان ادھر ادھر بھاگنے لگے، اس سلسلہ میں ۱۶۱۰ء میں مسلمان یہاں بھی آئے لیکن اس ملک پر بھی اسپینی عیسائیوں کی حکومت تھی، اس لیے مسلمانوں کو یہاں بھی اپنے دین و مذہب اور تہذیب و معاشرت کے ساتھ رہنا دشوار ہو گیا لیکن ان کا اثر کچھ نہ کچھ آج تک باقی ہے پھر ۱۹۷۵ء میں جب لبنان میں درزیوں اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی تو بہت سے مسلمان بھاگ کر ارجنٹائن آگئے اسی طرح بلقان وغیرہ میں ترکی حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت آئی اور جنگ عظیم کے بعد شام و لبنان وغیرہ پر سامراجی حکومت کے بعد بہت سے مسلمان یہاں آگئے، اس وقت مسلمان تقریباً ......۴ ہیں جن میں سے تقریباً .....۱ مسلمان پایۂ تخت بیونس آئرس میں رہتے ہیں الکل آبادی

میں مسلمانوں کا اوسط ۵ فی صد ہے، لیکن ابھی تک کوئی بڑی مسجد نہیں ہے، مگر اب سعودی عرب اور عرب امارات کے تعاون سے یونس آئرس میں ایک شاندار مسجد کی تعمیر کا انتظام ہو رہا ہے، پورے ملک میں سات اسلامی مراکز قائم ہیں، لیکن ان کی حیثیت زیادہ ممتاز نہیں ہے، حکومت نے اسلام کو ابھی تک سرکاری مذہب کی حیثیت نہیں دی، اور مسلمانوں کو اب بھی مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے نام مسیحی ناموں کے انداز پر رکھیں، عیسائیوں سے ازدواجی رشتے بھی ہوتے ہیں ۱۹۷۸ء میں جامعہ ازہر نے یہاں اپنا ایک نمائندہ بھیجا تھا، مگر ہسپانی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ کوئی قابل ذکر خدمت انجام نہ دے سکے، بہرحال عربی زبان سے کچھ ربط قائم ہے، بچوں کو عربی زبان پڑھائی جاتی ہے، ۱۹۲۹ء میں یونس آئرس میں ایک اسلامی تنظیم قائم ہوئی تھی، اس کے مرکز میں ایک چھوٹی سی مسجد، کتب خانہ اور ہال ہے، عربی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام ہے، وقتاً فوقتاً اسلامی اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ جمعیۃ عربیہ اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن بھی قائم ہے، اور الاسلام کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا ہے، اسی طرح قرطبہ شہر میں بھی ایک اسلامی سوسائٹی ہے، یہ بھی ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی تھی، ایسی ہی ایک انجمن مندوزا میں بھی ہے، یہاں مسلمانوں کی سرگرمیاں خاصی نمایاں ہیں،

خوشی کی بات ہے کہ سعودی عرب کی طرف سے گزشتہ سال یہاں ایک اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے، جس کے سربراہ ندوۃ اور جامعہ مدینہ کے فاضل مولانا ارشاد احمد ندوی مقرر ہوئے ہیں، امید ہے کہ اس سے آئندہ یہاں اسلامی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوگا، "ع، ص"

وفیات

مولانا فضل اللہ مرحوم

از

عبدالسلام قدوائی

معارف ابھی زیر ترتیب ہی تھا کہ مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کے انتقال کی اطلاع ملی مرحوم اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور شرافت و حسن اخلاق میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، راقم الحروف کو ان کی خدمت میں ایک عرصہ سے نیاز حاصل تھا جب علی گڈھ جانا ہوتا تو ان کے یہاں ضرور حاضری دیتا، اور وہ بھی پیرانہ سالی اور ضعف جسمانی کے باوجود بازدید کے لیے تشریف لاتے، اور دیر تک دینی و علمی گفتگو فرماتے، میرا قیام سرسید نگر میں اپنے لڑکے ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کے مکان بیت الفرح میں ہوتا ہے اور مولانا امیر نشان میں اپنی صاحبزادی روقیہ بیگم کے یہاں رہتے تھے، امیر نشان سے سرسید نگر کا فاصلہ اچھا خاصا ہے، میں نے کئی بار عرض بھی کیا کہ آپ اتنی تکلیف گوارا نہ کیا کریں، میں جب تک علی گڈھ میں رہوں گا خود ہی حاضر ہوتا رہوں گا، مگر انھوں نے اخلاق کریمانہ کی بنا پر میری اس درخواست کو کبھی قبول نہیں کیا، ایسی خورد نوازی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، میں ان سے عمر میں بھی بہت چھوٹا تھا اور علم و فضل میں تو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، میں ذرہ

بے مقدار اور رد و آفتاب علم و کمال یہ محض ان کی بزرگانہ شفقت تھی، اور اس تعلق خاطر کا اظہار تھا، جو انھیں ندوہ کے خادموں کے ساتھ تھا، وہ ندوۃ العلما کے بانی، اور ناظم اول مولانا محمد علی مونگیری کے پوتے تھے، والد کا نام مولانا احمد علی تھا، وہ علم وفضل، صلاح و تقوی، محاسن اخلاق، اور عقل و دانش میں بہت ممتاز تھے، ان کی نوعمری کے زمانہ میں ایک طرف مشنریوں کا بڑا زور تھا جو آئے دن اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے رہتے تھے، دوسری طرف مستشرقین علم و تحقیق کے نام پر اسلامی شریعت، سیرۃ نبوی اور تاریخ اسلام کو داغدار کر رہے تھے، اس وقت انگریزوں کے جلال و جبروت اور دبدبہ وسطوت کا یہ عالم تھا کہ ان ہرزہ سراسوں کے خلاف زبان کھولنا بھی اپنے کو آفات و مصائب میں مبتلا کرنا تھا، لیکن اللہ کے کچھ بندے اپنی عزت و ناموس کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں نکل آئے، ان سرفروشوں میں مولانا محمد علی سرفہرست تھے، انھوں نے تحفۂ محمدیہ کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا، متعدد کتابیں لکھیں، اور اجلۂ ملت کو دفاع اسلام کے لیے تیار کیا،

اس فضا نے مولانا احمد علی کے اندر غیرت ایمانی اور حمیت دینی کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیا، وہ باپ کے دوش بدوش اس مہم میں لگ گئے، تذکرہ نگار نے ان کے جوش و ولولہ، صلاحیت کار اور اصابت رائے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے،

جب ۱۳۱۱ھ میں مولانا محمد علی نے اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لئے ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی تو مولانا احمد علی بھی عزم و قوت کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے،

ان کی فہم و فراست لیاقت و صلاحیت اور محنت و کارگزاری کی بنا پر ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، حکیم عبدالحی صاحب اس زمانہ میں مددگار ناظر تھے، اور مولانا احمد علی ان کے دست راست تھے دونوں کے درمیان فکر و خیال کا ایسا اتحاد تھا کہ ایک جان دو قالب سمجھے جاتے تھے، مولانا محمد علی نے حکیم صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بڑے حسن ظن کا اظہار کیا ہے، ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں مل کر ندوہ کو جلد بام عروج تک پہونچا دیں گے، لیکن افسوس کہ ۱۳۲۳ھ میں عین عنفوان شباب کے عالم میں انتقال ہوگیا۔

جس وقت مولانا احمد علی کا انتقال ہوا اسوقت مولانا فضل اللہ بہت چھوٹے تھے، دادا نے انھیں اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اور بڑی توجہ کے ساتھ انکی تعلیم و تربیت میں کوشش کی، اللہ نے ذہن ثاقب طبع ارجمند اور مزاج خیر پسند عطا فرمایا تھا، مولانا محمد علی جیسے شیخ وقت کی صحبت نے ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا جلد ہی علم و سلوک کے مدارج عالیہ تک پہونچ گئے، وہ مولانا محمد علی کی شفقت اور حسن توجہ کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، کبھی کبھی راہ سلوک کے واردات بھی بیان کرتے تھے، زندگی بھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ساتھ اذکار و اشغال کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

علوم اسلامیہ میں کتاب و سنت سے خاص تعلق تھا، قرآن مجید بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کے رموز و اسرار اور نکات و اشارات پر ان کی گہری نظر تھی، قرآن مجید کی توضیح و تفسیر میں خاص طور سے احادیث پیش نظر رہتی تھیں، کتب حدیث میں سے یوں تو صحاح کی سبھی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں،

لیکن امام بخاری کی جامع صحیح سے خاص شغف تھا، عرصہ دراز تک پابندی کے ساتھ اس کا ایک پارہ روز پڑھتے تھے،

ادب المفرد امام بخاری کی بڑی اہم کتاب ہے، اس میں اسلامی اخلاق و آداب کا تفصیل سے ذکر ہے، اس کتاب کی کوئی شرح نہ تھی جس سے اس کی مشکلات حل کی جاسکتیں مولانا فضل اللہ نے کئی سال کی محنت و دیدہ ریزی کے بعد فضل اللہ الصمد کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں اس کی شرح لکھی، اس کی وجہ سے ان کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا، حدیث کے اساتذہ اور علماء نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کی بڑی ثنا و صفت بیان کی، بیرون ہند کے اہل قلم نے بھی اس خدمت پر بڑی ممنونیت کا اظہار کیا،

ان کے استاد اور خسر مفتی عبد اللطیف رحمانی نے جامع ترمذی کی بارہ جلدوں میں بڑی اچھی شرح لکھی ہے، اس کام میں مولانا فضل اللہ ان کے دست راست تھے ان کے بعد انھوں نے پھر نظر ثانی کی، اور بیش قیمت مفید حواشی کا اضافہ کیا، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو حدیث شریف کے اساتذہ اور طلبہ کو بہت فائدہ پہنچے، مرحوم اہل علم اور اہل ثروت دونوں کو اس جانب توجہ دلاتے تھے، ان کے ایما پر معارف نے بھی ایک نوٹ لکھ کر اصحاب خیر کو اس جانب متوجہ کیا، مگر کتاب اتنی بڑی ہے اور اس کی اشاعت میں اتنا کثیر سرمایہ لگانا پڑے گا کہ کوئی نا شر تیار نہ ہوا، شرح ادب المفرد کی اشاعت میں بھی یہی دشواری تھی، مگر اللہ نے حجاز کے مشہور اہل خیر یوسف زینل علی رضا کو توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے حدیث نبوی کے اس ذخیرہ کو بصرف کثیر شائع کر کے حسن قبول اور اجر جزیل حاصل کیا،

اگر اسی طرح جامع ترمذی کی شرح بھی کوئی اللہ کا بندہ شائع کر دیتا تو بڑا

بجا لانا حاصل کرنا مرحوم کے چچا مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار کا فرض ہے، جامعہ رحمانیہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھا لیں تو یہ عمل آسان ہو سکتا ہے۔

مولانا کی عمر کا کافی حصہ حیدر آباد میں گذرا، اور عثمانیہ یونیورسٹی میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، وہاں سے سبکدوشی کے بعد علی گڑھ میں قیام کیا، اور وہیں وفات پائی، تادم مرگ علم و دین کی خدمت میں لگے رہے، اور زبان و قلم سے تلقین و ارشاد کرتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے، اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کی لائق صاحبزادیوں اور دوسرے عزیزوں کو ان کے نام نیک کو بلند رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لے مولانا منت اللہ عمر میں مولانا فضل اللہ سے بہت چھوٹے ہیں، مولانا کہتے تھے کہ میں نے انھیں گود میں کھلایا ہے، مگر حقیقی چچا ہیں دوسرے چچا مولانا نور اللہ ناظم جمعیۃ علماء بہار بھی حیات ہیں، وہ بھی عمر میں چھوٹے ہیں، مولانا فضل اللہ کے والد مولانا احمد علی مولانا محمد مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے، جو ان کی پہلی حرم سے تھے۔

مطبوعات جدیدہ

دعوات حق (جلد اول) مرتبہ مولانا سمیع الحق صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۷۶ مجلد قیمت ۳۰ روپئے پتہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، پاکستان

اکوڑہ خٹک (پشاور) کا دارالعلوم حقانیہ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کا مثنیٰ سمجھا جاتا ہے، درس و تدریس کے علاوہ اس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح و تربیت بھی ہے، اس غرض سے اس کا ایک ماہانہ ترجمان "الحق" عرصہ سے نکل رہا ہے اور اب اصلاحی و دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے موتمر المصنفین کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، اس سلسلہ کی ابتدا دارالعلوم کے بانی و مہتمم مولانا عبدالحق صاحب کے خطبات و ملفوظات کے اس مجموعہ سے کی گئی ہے، اس میں اکثر جمعہ کے خطبے ہیں، ان کے علاوہ بعض تعلیمی اداروں، دعوتی اجتماعات اور مدارس کے ختم بخاری کے جلسوں کی تقریریں اور بعض سوالناموں کے جواب بھی درج ہیں، کچھ تقریریں پہلے ماہنامہ الحق میں چھپی تھیں لیکن اب مولانا کے فرزند اور الحق کے مدیر مولانا سمیع الحق نے ان کو اور دوسری تقریروں کو بارہ ۱۲ ابواب میں سلیقہ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، ان میں ایمانیات، عقائد، عبادات، مسائل شعائر، تربیت کے اوامر و نواہی، حقوق العباد، اتحاد و اخوت اسلامی

ینی تعلیم اس کے نصاب، علماء کے فرائض دعوت و تبلیغ کی اہمیت و ضرورت مسلمانو
موجودہ ذلت و نکبت اور اس سے نجات کی صورتوں وغیرہ مختلف امور
اظہار خیال کیا گیا ہے، ختم بخاری کی تقریروں میں امام بخاری اور ان کی
کی اہمیت و عظمت اس کی آخری حدیث کی تشریح اور شروع کی حدیث سے
ان کی مناسبت پر مفید بحث ہے، ایک تقریر میں عرب و اسرائیل جنگ میں عربوں
شکست و ہزیمت کے اسباب کا بڑے درد و کرب سے ذکر کیا ہے اور یہ دکھایا
کہ کس طرح مسلمان عزت، سربلندی اور کامرانی حاصل کر سکتے ہیں، بعض
ریروں میں اسلامی حدود و تعزیرات پر اعتراض کرنے والے تجدد پسندوں
ر پاکستان میں اسلامی نظام کے مخالفوں کا مدلل جواب ہے، ختم نبوت پر
ث کرکے قادیانی مذہب کی تردید کی گئی ہے، اس طرح اس مجموعہ میں دین
مختلف اعتقادی و عملی پہلوؤں اور احکام و عبادات کے اسرار و حکم کا
ر اور ان کے متعلق شکوک و شبہات کا رد بھی ہے، انداز بیان موثر اور
ل نشین ہے،

ملاح المساجد:۔ مترجمہ مولانا مقتدی حسن ازہری، تقطیع متوسط کاغذ
وطباعت عمدہ کتابت بہتر صفحات ۲۳۰ قیمت ۵ روپیے پتہ:۔ الدار السلفیۃ
حامد بلڈنگ، مومن پورہ، بمبئی،

مسلمان مسجد میں خدا کی عبادت کرتے اس کو اللہ کا گھر سمجھتے اور رہبت
ذہن خیال کرتے ہیں، ابتداء میں یہی مسجدیں رشد و ہدایت تبلیغ و اشاعت
ر مذہبی و ملی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھیں اس لیے ان کی ظاہری صفائی

ستھرا اُن کی طرح ان کی باطنی پاکیزگی و نظافت کا بھی بڑا اہتمام کیا جاتا تھا، اور ان کے اندر غلط اور خلاف شریعت کام کرنے سے بہت پرہیز کیا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ دوسرے شعبوں کی طرح مسلمان مسجدوں کے احترام و تقدس سے بھی غافل ہوگئے، اور ان کے اندر ایسے کام ہونے لگے جو ان کی حرمت کے منافی اور شرعاً غلط ہیں، زیر نظر کتاب میں اس قسم کے متعدد اعمال و اشغال کی نشاندہی کرکے ان کو غلط اور بدعت ثابت کیا گیا ہے اور ان کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، شروع میں بدعت کا مفہوم اور اس کے متعلق وعید کا ذکر، اور آخر میں مساجد کے فقہی احکام بیان کئے ہیں، یہ کتاب دمشق کے ایک ممتاز عالم محمد جمال الدین قاسمی (م ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء) کی تصنیف ہے، موجودہ دور کے مشہور شامی محدث محمد ناصر الدین البانی نے اس کی حدیثوں کی تخریج اور کہیں کہیں اختلافی نوٹ تحریر کئے ہیں، ترجمہ اچھا ہے، گو اس کتاب میں شام کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے، لیکن اکثر بدعات و ناجائز رسوم ساری دنیا میں عام ہیں، تاہم اگر ایک ضمیمہ کا اضافہ کرکے یا ذیلی حواشی میں ان غیر شرعی طور طریقوں کا ذکر بھی کردیا جاتا جو ہندوستانی مسجدوں میں رائج ہیں تو زیادہ بہتر ہوتا،

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں :- (جلد اول) مرتبہ جناب کالی داس گپتا رضا صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش قیمت دس روپے پچاس پیسے، پتہ :- ولی پبلیکیشنز، ۱۰۔ جولی بھون نمبر ۱، نیو میرین لائن چرچ گیٹ بمبئی،

مشرقی افریقہ میں ہندوستان کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں، یہ

لوگ پہلے وہاں تجارت کے لیے گئے، مگر جب انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ہوا اور انھوں نے افریقی ملکوں کی تعمیر و ترقی کے منصوبے بنائے تو ہندوستان سے کاریگر اور مزدور وہاں لے گئے، ان میں سے بہت سے وہیں مستقل طور پر رہ گئے، جناب کالی داس رضا گپتا شعر و ادب کے شوق کے ساتھ تجارت سے بھی ذوق رکھتے ہیں، بمبئی میں ان کا اچھا کاروبار ہے، اس سلسلہ میں وہ برسوں افریقہ میں رہے ہیں، اور وہاں کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس کتاب میں انھوں نے مشرقی افریقہ کے آباد بعض ممتاز ہندوستانی افراد کے حالات و واقعات زندگی قلمبند کر کے وہاں کی تعمیر و ترقی میں ان کی خدمات دکھائی ہیں اور افریقہ کے مختصر تاریخی و جغرافیائی حالات اور ہندوستانیوں کے وہاں پہونچنے کی سرگذشت بیان کی ہے، یہ اس کتاب کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد میں افریقہ میں اردو کی ترویج و اشاعت کا ذکر ہوگا،

سفینۂ نجات :- از جناب ابونجمہ صولت علوی صاحب، متوسط تقطیع کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۰، قیمت پندرہ روپیے، پتہ از مصنف معرفت نیو سلور کیک ایجنسی، وزیر بلڈنگ کیمپا ونڈ بمبئی ۱

جناب ابونجمہ صولت علوی صاحب ایک معمر اور صوفی مشرب شاعر ہیں، ان کے دل میں دین و ملت کا درد اور اسلام و داعی اسلام علیہ السلام کی سچی محبت ہے، اس لئے نعت و منقبت رسول ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، وہ اسے اپنی مغفرت اور نجات کا وسیلہ خیال کرتے ہیں، نظموں میں مسلمانوں کی موجودہ پستی، بے عملی، باہمی اختلاف و فرقہ آرائی کی مذمت اور واعظوں، لیڈروں اور شاعروں

کی شیوہ بیانی پر طنز آمیز افسوس ظاہر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ان کی گزشتہ شوکت و عظمت یاد دلا کر اپنا مستقبل تابناک بنانے کی دعوت دی گئی ہے، اصولتؔ صاحب کو تغزل سے بھی مناسبت ہے، اس میں عشق و محبت کی حرارت کے ساتھ جذبات و خیالات کی پاکیزگی بھی ہے، مگر کہیں کہیں کلام میں خامی رہ گئی ہے، جیسے ع گھٹا رحمتوں کی ستاروں میں بہکی (صلا) گھٹا برستی ہے بہکتی نہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں ع کیوں نہ آنکھوں پہ صبا یہ کار رکھوں نقش قدم (صلا) نقش قدم آنکھوں پر نہیں سامنے رکھا جاتا ہے، ہاں خاک قدم آنکھوں پر رکھی جاتی ہے، اسی صفحہ پر برق کی انگڑائی بھی لکھی ہے، جو صحیح نہیں ہے، ان کا ایک اور مصرع ہے ع جلال تیغ مومن پر فلک کا دل بھی لرزاں ہے (صلا) پر کے بجائے سے کہنا چاہیے تھا، بعض جگہ طرز ادا کی خامی سے شعر مبہم ہو گیا ہے مثلاً

سرمایہ مری زیست کا یہ کم تو نہیں ہے کافی غم احمدؐ ہے، کوئی غم تو نہیں ہے (صلا)

تیری زلفوں کا سنورنا کوئی آسان نہ تھا اپنی تقدیر کے بل ہم سے نکالے نہ گئے (صلا)

صنف انشائیہ اور انشائیے :۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۹، قیمت عہ روپئے (۱) موتی لال بنارسی داس ۱/۴۔ یو۔ اے بنگلہ روڈ، جواہر نگر، دہلی نمبر ۲ (۲) موتی لال بنارسی داس چوک، وارانسی (۳) موتی لال بنارسی داس اشوک راج پتھ، پٹنہ نمبر ۴ (۴) پبلی کیشن، جگ جیون روڈ، گیا۔

انشائیہ اردو ادب کی ایک مقبول اور دلچسپ صنف ہے، اس کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر سید محمد

جینن نے مرتب کیا ہے، اس کے [illegible] چھپ شائع ہو چکے ہیں یہ چوتھا ایڈیشن ہے
جو تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ "نقش قدیم" میں (۱) محمد حسین آزاد (۲) خواجہ
حسن نظامی (۳) عبدالحلیم شرر (۴) مرزا فرحت اللہ بیگ اور (۵) ملا رموزی کے
انشائیے اور دوسرے حصہ "نقش نو" میں رشید احمد صدیقی، حاجی لق لق، انجم مان پوری،
پطرس بخاری، عبدالعزیز فلک پیما، کرشن چندر، کنھیا لال کپور اور شوکت
تھانوی کے انشائیے شامل ہیں، آخری حصہ "نقش جدید" موجودہ دور کے ۹
ادیبوں کے انشائیوں پر مشتمل ہے، مندرجہ بالا ناموں کی کشش سے سب کو اس
مجموعہ کے پڑھنے کا اشتیاق ہوگا، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک
دلچسپ مقدمہ بھی ہے، اس میں انشائیہ کی نوعیت و خصوصیت اور فنی آداب
و لوازم پر سیر حاصل گفتگو کرکے دوسرے اصناف ادب سے اس کا فرق واضح
کیا گیا ہے،

اردو اور قومی ایکتا مرتبہ جناب قیوم خضر صاحب تقطیع متوسط کتابت طباعت
قدرے بہتر صفحات ۲۰۰ قیمت دس روپیے، پتہ: دفتر اشارہ، پٹنہ نمبر ۔

یہ کتاب اردو کے بارہ میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس
میں اس کی گذشتہ تاریخ بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی،
اور یہیں کے لوگوں کی زبان ہے، ہندو مسلمان سب اسکے فروغ میں شریک رہے ہیں، یہ قومی
یکجہتی کی علامت ہے، آزادی کی تحریک میں اسکا حصہ رہا ہے، اردو اور ہندی کا جھگڑا
انگریزوں نے پیدا کیا ہے، اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ سراسر مہمل بلکہ مضر ہے، آخر میں اردو کی ترقی
کے لیے بعض مفید مشورے دیئے ہیں، آزادی کے بعد اس مسئلہ پر بہت لکھا گیا ہے مگر یہ گتھی سلجھنے کے بجائے
برابر الجھتی جارہی ہے، کیونکہ جب تک دل نہیں بدلتے دلیل و حجت کام نہیں دے سکتی، ض